حضرت مرزا طاہر احمد امام جماعت احمدیہ

مصنفہ
آئن ایڈم سن

ترجمہ
چوہدری محمد علی ایم۔اے

آئن ایڈم سن

اس کتاب کے مصنف مسٹر آئن ایڈم سن برطانیہ کے مشہور صحافی ہیں اور متعدد کتب کے مصنف ہیں۔ انگلستان تشریف آوری کے معابعد مسٹر ایڈم سن کو حضرت میرزا طاہر احمد صاحب سے شرف ملاقات حاصل ہوا۔ پہلی ملاقات ہی میں مسٹر ایڈم سن نے یہ فیصلہ کیا کہ حضور کے بارہ میں ایک کتاب لکھیں اور اسے اپنے طور پر اپنے خرچ پر شائع کر کے وسیع پیمانہ پر اس کی اشاعت کریں۔

حضور سے اجازت ملنے پر مسٹر ایڈم سن نے کتاب پر کام شروع کیا اور دیگر مواد کے علاوہ حضور سے بھی متعدد مرتبہ انٹرویو کر کے حضور کی زندگی کے بارہ میں سوالات پوچھے۔

مسٹر ایڈم سن عیسائی مذہب کے پیرو ہیں لیکن حضور کی شخصیت سے اس قدر متاثر ہوئے ہیں کہ کتاب لکھتے وقت اپنے ذاتی عقائد کو پس پشت ڈال کر حضور کے خیالات، عقائد اور نظریات کو نہایت عقیدت مندانہ انداز میں پیش کرنے میں انتہائی دیانتداری اور غیر جانبداری سے کام لیا ہے۔

A Man of God کی اس قدر پذیرائی ہوئی کہ مصنف نے اس کے تین ایڈیشن شائع کر کے تیس ہزار سے زائد کتب چھاپیں جو ہاتھوں ہاتھ فروخت ہوئیں۔ جب مصنف سے اس کتاب کے دیگر زبانوں میں تراجم کے حقوق کی اجازت طلب کی گئی تو انہوں نے فوراً یہ اجازت جماعت احمدیہ کو دے دی۔ چنانچہ کتاب کا اردو زبان میں ترجمہ ہم پیش کر رہے ہیں۔

دیگر زبانوں میں بھی تراجم جلد تیار ہو کر انشاء اللہ شائع ہوں گے۔

پبلشر

ایک مردِ خدا

حضرت مرزا طاہر احمد امام جماعتِ احمدیہ

کے

حالاتِ زندگی

مصنفہ

آئن ایڈمسن

ترجمہ

چوہدری محمد علی ایم اے

EK MARD-I-KHUDA

(A MAN OF GOD)

(Urdu Translation)

First Published (Urdu) in U.K. in 1996

Published by :
Islam International Publications Ltd
Islamabad
Sheephatch Lane
Tilford, Surrey GU10 2AQ
United Kingdom
Printed in U.K. by :
Raqeem Press,
Islamabad, Tilford

ISBN 1 85372 594 3

فہرست

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نوٹ از مترجم

اول تو اس کتاب کے مصنف مذہباً عیسائی ہیں اور پھر انگریزی محاورے کی بات بھی ہے لیکن زبان اردو میں اگر بزرگوں کے صرف نام دیئے جائیں اور دعائیہ کلمات شامل نہ کئے جائیں تو قاری کی طبیعت اس صورت حال کو قبول نہیں کرتی۔

اسلئے متن میں جہاں جہاں آنحضرت ﷺ کا نام نامی اسم گرامی آیا ہے وہاں ترجمے میں حضرت اور ﷺ کے الفاظ واوین میں درج کر دیئے گئے ہیں۔ اسی طرح جگہ جگہ علیہ السلام۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے الفاظ بھی واوین میں لکھ دیئے گئے ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس۔

مترجم

جذبات تشکر

اسے حسن اتفاق کہئے یا میری خوش قسمتی- پچھلے چودہ سال میں مجھے ملک ملک کے احمدیوں سے ملنے کا شرف حاصل ہوتا رہا ہے- خصوصاً تین سال قبل جب سے میں نے اس کتاب کے متعلق سوچنا شروع کیا تو احمدی حضرات سے ملاقاتوں میں بھی اضافہ ہوا-

جناب بشیر احمد رفیق سابق امام لندن مسجد اور موجودہ ڈائریکٹر احمدیہ مسلم پبلیکیشنز کا شکر گزار ہوں کہ میں ان کے طفیل بہت سے احمدی احباب سے متعارف ہوا-

مقصد صرف یہ تھا کہ جہاں تک ممکن ہو کچھ مفید معلومات حاصل کر سکوں- ایسے مواقع پر تعارف کروانے کے بعد جناب بشیر احمد رفیق خود تو چلے جاتے اور ملاقات کے دوران مہمان شخصیت کے پاس میں رہ جاتا یا میرا ٹیپ ریکارڈر-

جناب بشیر احمد رفیق نے کتب کے سلسلے میں بھی میری ہر ممکن مدد فرمائی- جو کتاب مجھے اپنی یونیورسٹی کے کتب خانے میں نہ مل سکتی وہ ان کے کتب خانے سے مل جاتی-

میں ان تمام اصحاب کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں جنہوں نے میرے سوالات اور جرح در جرح کے طویل لمحوں کو صبر و سکون سے برداشت کیا- ان میں جناب ایم- ایم احمد سابق وزیر خزانہ گورنمنٹ آف پاکستان، جناب اے-

اے خان سابق سفیر پاکستان ' جناب اے - اے کاہلوں سابق امیر جماعت ہائے احمدیہ جزائر برطانیہ ' جناب ایم - اے ساقی ڈائریکٹر احمدیہ مسلم مشنز اور جناب اے - ایم راشد امام لندن مسجد شامل ہیں - اور بھی بے شمار لوگوں نے مجھ سے تعاون کیا - ان سب کا ذکر کرنا یہاں ممکن نہیں - ان میں سے بعض تو ایسے بھی ہوں گے جو شاید اپنا نام ظاہر کرنا بھی پسند نہیں کریں گے - میں ان سب کا شکر گزار ہوں -

چوہدری سر محمد ظفر اللہ خان سے بھی کئی مرتبہ ملاقات کا شرف حاصل ہوا - آپ پاکستان کے پہلے وزیر خارجہ ' اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے صدر ' اور بین الاقوامی عالمی عدالت انصاف کے صدر رہ چکے تھے -

کتاب کے متن میں حواشی کی بجائے میں نے آخر میں عربی اور اردو الفاظ کی فرہنگ کا اضافہ کر دیا ہے -

محترمہ مس اے - مجید کا بھی شکر گزار ہوں کہ انہوں نے نہایت محنت سے انگریزی کتاب کا انڈیکس تیار کیا -

☆ ☆ ☆

تعارف

جماعت احمدیہ اپنے متعلق کسی شک و شبہ میں مبتلا نہیں۔ اس کا دعویٰ ہے کہ احمدیت ہی حقیقی اسلام ہے اور بالآخر اسی کے ذریعے تمام مذاہب عالم ایک جھنڈے تلے جمع ہوں گے اور ساری دنیا حلقہ بگوش اسلام ہو جائے گی۔
جماعت کے موجودہ امام (حضرت) مرزا طاہر احمد ہیں۔ آپ (حضرت) مرزا غلام احمد (علیہ السلام) کے خلیفہ رابع یعنی چوتھے خلیفہ ہیں۔ (حضرت) مرزا صاحب کا دعویٰ تھا کہ آپ ہی وہ مسیح موعود ہیں جن کی آمد کی پیشگوئی تمام بڑے بڑے مذاہب کی کتب مقدسہ میں کی گئی تھی۔ آپ نے پیشگوئی فرمائی کہ آپ کے بعد آپ کے خلفاء کے ذریعے ساری دنیا تین سو سال کے اندر اندر احمدیت قبول کر لے گی۔ کیا ہنود اور کیا یہود، کیا سکھ اور کیا عیسائی اور بدھ مت کے پیروکار سب کے سب اسلام کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ لیں گے۔ آسمان کے نیچے صفحہ زمین پر ایک ہی مذہب ہو گا اور ایک ہی پیشوا یعنی (حضرت) محمد (مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم) لیکن یہ روحانی انقلاب کسی تشدد یا جبر کے نتیجے میں واقع نہیں ہو گا کیونکہ جبر کی تو اسلام اجازت ہی نہیں دیتا۔ عقیدے کو جبر سے ہرگز نہیں ٹھونسا جا سکتا۔ لہٰذا اسلام کی حقانیت کا غلبہ دلائل سے ہو گا۔ یہ وہ مقدس جنگ ہو گی جو الفاظ کے ذریعے لڑی جائے گی۔ یہاں تک کہ اسلام کی سچائی روز روشن کی طرح کھل کر سامنے آ جائے گی۔
جب آپ نے دعویٰ کیا کہ میں ہی وہ مہدی اور مسیح ہوں جس کے آنے کی

صحف سابقہ میں خبر دی گئی ہے۔ تو پچاس سے بھی کم لوگ آپ کے دعوے کی تصدیق کے لئے آگے بڑھے۔ لیکن اگلے دن کچھ اور لوگ آگئے اور اس سے اگلے دن کچھ اور۔ اس کے بعد تو آنے والوں کا تانتا بندھ گیا۔ اور سال بہ سال آپ کے دعوے کو قبول کرنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔

۱۹۸۹ء میں جماعت احمدیہ کے قیام پر سو سال گزرنے پر صد سالہ جشن تشکر منایا گیا۔ اس وقت عالمی جماعت احمدیہ میں شامل افراد کی تعداد ایک کروڑ سے تجاوز کر چکی تھی اور ملکوں ملکوں سے گروہ در گروہ لوگ بانی جماعت کے دعوے کی سچائی پر مہر تصدیق ثبت کر چکے تھے اور آپ کے اور آپ کے خلفاء کے تعلق باللہ کی شہادت دے چکے تھے۔

جماعت احمدیہ عوام الناس کی جماعت ہے اور یہی خصوصیت اس کا طرۂ امتیاز بھی ہے۔ اگرچہ اس میں اعلیٰ طبقے کے لوگ بھی کثرت سے شامل ہیں۔ مثلاً پروفیسر عبدالسلام جیسے نوبل انعام یافتہ سائنس دان۔ (حضرت) چوہدری محمد ظفراللہ خان جیسے عالمی عدالت انصاف کے (سابق) چیف جسٹس اور اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے (سابق) صدر۔ ایم۔ ایم احمد جیسے عالمی بنک کے ڈائریکٹر اور ماہر اقتصادیات، مختلف ملکوں کے وزراء متعدد جرنیل، دانش ور، ماہرین، صنعت کار، تاجر اور اچھے خاصے کھاتے پیتے مرفّہ حال لوگ جماعت میں شامل ہیں۔ لیکن جماعت کی غالب اکثریت ان لوگوں پر مشتمل ہے جو عوام الناس کہلاتے ہیں۔ یہی لوگ جماعت کا جزو اعظم ہیں اور سب سے زیادہ اہمیت کے حامل ہیں۔

جماعت احمدیہ ہی آج دنیائے اسلام کی سب سے فعال اور متحرک جماعت ہے۔ آج دنیا کے ایک سو بیس ممالک میں جماعت کی طرف سے قائم کردہ مساجد، تبلیغی مراکز، اور فعال جماعتیں موجود ہیں۔ ایک سو سترہ زبانوں میں قرآن کریم کا مکمل یا

جزوی طور پر ترجمہ کیا جا چکا ہے۔ دنیا کے کونے کونے میں جماعت نے سکولوں اور ہسپتالوں کا جال بچھا دیا ہے۔ اور جماعت کی طرف سے بھیجے ہوئے کتنے ہی ماہرین زرعی اور صنعتی منصوبوں کی تکمیل کے سلسلہ میں مختلف ملکوں میں گراں قدر خدمات بجالا رہے ہیں۔

آئندہ بیس سالہ پلان کے مطابق جماعت پانچ ہزار مبلغین کو روس ' چین اور جنوبی امریکہ کے ممالک میں بھجوانے کا پختہ ارادہ رکھتی ہے۔ لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ جماعت کو شدید مخالفت کا سامنا ہے اور اس پر طرح طرح کے ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے جا رہے ہیں۔ یہاں تک کہ بعض مسلمان ممالک تو سرکاری طور پر احمدیوں کو دائرہ اسلام سے خارج قرار دے چکے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ (حضرت) محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے بعد کوئی نبی نہیں آسکتا۔ احمدیوں کا موقف یہ ہے کہ (حضرت) محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے بعد اب کوئی شریعت لانے والا نبی نہیں آسکتا۔ آپ کی شریعت ہی آخری شریعت ہے اور آپ کی کتاب ہی آخری کتاب۔ ان معنوں میں آپ ہی آخری نبی ہیں۔ لیکن الہام الٰہی کا دروازہ بند نہیں ہوا۔ یہی تو بندے اور اس کے معبود کے درمیان قائم ہونے والا ایک زندہ اور زندگی بخش تعلق ہے۔ اسے کیسے منقطع کیا جا سکتا ہے۔ احمدی کہتے ہیں کہ ان کا موقف نیا نہیں ہے۔ ابتداء ہی سے بزرگان سلف اور صلحائے امت اس عقیدے کی تصدیق کرتے چلے آئے ہیں۔

جماعت کے مخالفین جنہوں نے جماعت کو ہر قسم کے ظلم و ستم کا نشانہ بنایا اور اسے نیست و نابود کرنے کیلئے ایڑی چوٹی کا زور لگایا ایک ایک کر کے خود مٹتے چلے گئے۔ بعض تو بڑی ذلت کی موت مرے۔ اور بعض گمنامی کی حالت میں عالم آخرت کو سدھار گئے اور ان کا کوئی نام لیوا تک باقی نہ رہا۔ اس کے برعکس جماعت عہد بعهد ترقی پہ ترقی کی منازل طے کرتی چلی گئی۔

اس تناظر سے متاثر ہو کر میں نے تقدس مآب امام جماعت احمدیہ کے سوانح حیات قلمبند کرنے کی کوشش کی ہے۔ آپ کا نام نامی اسم گرامی (حضرت) مرزا طاہر احمد ہے۔ آپ بانی جماعت احمدیہ کے پوتے اور ان کے چوتھے جانشین ہیں۔ اور (حضرت) خلیفۃ المسیح الرابع کے لقب سے ملقب ہیں۔

☆ ☆ ☆

1

خدا تعالیٰ کے پیار اور غضب کے نظارے

جملہ مذاہب عالم کی طرح مسلمانوں کا بھی یہ مسلمہ عقیدہ ہے کہ جو لوگ بنی نوع انسان کو سکھ پہنچاتے ہیں اللہ تعالیٰ انہیں جزا دیتا ہے اور جو دکھ پہنچاتے ہیں انہیں سزا۔

رمضان المبارک کے اختتام پر عید الفطر منائی جاتی ہے اس دن جشن کا سا سماں ہوتا ہے۔ عید کا دن خوشیوں کا آپس میں مل بیٹھنے کا اور تحفے تحائف بانٹنے کا دن ہے۔

یہ ان دنوں کا ذکر ہے جب تقدس مآب (حضرت) امام جماعت احمدیہ خلیفۃ المسیح الرابع (ایدہ اللہ تعالیٰ) کو خلافت کے روحانی منصب پر فائز ہوئے ابھی ایک سال بھی نہیں گزرا تھا۔ یہ روحانی ذمہ داری آپ کو بذریعہ انتخاب تفویض ہوئی تھی۔ عید الفطر کی آمد آمد تھی۔ عید سے پہلے جمعہ کا مقدس دن تھا۔ حضرت صاحب نے، جنہیں ان کے متبعین سیدنا اور حضور بھی کہہ کر پکارتے ہیں، ربوہ کی مسجد

اقصیٰ میں خطبہ جمعہ ارشاد فرمایا۔ ربوہ پاکستان کا وہ قصبہ ہے جس کا آج سے چالیس سال پہلے کوئی وجود تک نہ تھا جس جگہ آج ایک جیتا جاگتا شہر آباد ہے وہاں ایک ویران اور سنسان صحرا تھا' لق و دق اور بے آب و گیاہ۔ جہاں دن کے وقت سانپوں اور چھپکلیوں اور رات کے وقت گیدڑوں کی چیخ وپکار کے سوا کچھ نہیں تھا۔ آج یہاں سبزہ تھا۔ درخت تھے۔ کشادہ گلی کوچے تھے۔ آباد مکانات تھے۔ چالیس مسجدیں تھیں اور پینتالیس ہزار نفوس آباد تھے۔

اس انقلاب کی وجہ یہ تھی کہ اب یہ شہر عالمگیر جماعت احمدیہ کی پناہ گاہ بن چکا تھا یہاں وہ الگ تھلگ تو تھے لیکن اتنے بھی نہیں کہ گردو پیش سے کٹ کر رہ جائیں۔ ربوہ انکا اپنا شہر تھا' اپنا بسایا ہوا شہر۔ یہاں وہ اسلام اور احمدیت کی تبلیغ و اشاعت کیلئے بہتر طور پر تیاری کر سکتے تھے۔ یہیں سے وہ ساری دنیا کو حلقہ بگوش اسلام کرنے کیلئے اکناف عالم میں پھیل جانے کا ارادہ رکھتے تھے۔

ربوہ کی مسجد اقصیٰ میں پندرہ ہزار نمازیوں کی گنجائش ہے لیکن آج یہ گنجائش ناکافی ثابت ہو رہی تھی۔ ہجوم حضرت صاحب کے خطبہ جمعہ کیلئے بیتاب تھا لیکن مسجد میں سما نہیں سکتا تھا۔ نتیجتاً آپ کا خطبہ لاؤڈ سپیکروں کے ذریعہ ان نمازیوں تک پہنچ رہا تھا جو مسجد کے باہر نماز ادا کر رہے تھے۔ معمول کے مطابق آپ کے خطبہ جمعہ کو ٹیپ پر ریکارڈ کر لیا جاتا ہے۔ اور چوبیس گھنٹے کے اندر اندر اس کو دنیا بھر کی احمدی جماعتوں تک پہنچا دیا جاتا ہے جہاں ہر چھوٹا بڑا احمدی اسے بڑی عقیدت سے سنتا ہے۔ ان خطبات کا ترجمہ دوسری زبانوں میں بھی کیا جاتا ہے تاکہ لوگ کوئی سی زبان ہی کیوں نہ بولتے ہوں وہ امام جماعت احمدیہ کے خطابات اپنی اپنی زبان میں سن اور سمجھ سکیں۔

آج کا خطبہ بھی پاکستان اور ہندوستان کے کونے کونے تک پہنچے گا اور مشرقی

اور مغربی افریقہ اور دنیا کے دیگر ممالک میں بھی سنا جائیگا۔

اپنے خطبات میں حضور صرف ان سامعین ہی سے مخاطب نہیں ہوتے جو موقع پر حاضر ہوں بلکہ حضور کے پیش نظر وہ دور افتادہ لوگ بھی ہوتے ہیں جو زمین کے کناروں تک پھیلے ہوئے ہیں اور جن میں غریب امیر اور درمیانے طبقے کے لوگ سبھی شامل ہیں۔

حضور کی آواز میں ایک عجیب مٹھاس اور خاص قسم کا سوز و گداز ہے۔ آپ کو اپنے لب و لہجہ کے زیر و بم پر پوری قدرت حاصل ہے۔ آپ ایک قادر الکلام اور فصیح البیان خطیب ہیں آپ کی تقریر میں پند و نصائح کے ساتھ ساتھ ہلکے پھلکے شگفتہ مزاح کی چاشنی بھی ہوتی ہے۔ کبھی کبھی کسی نکتہ کی وضاحت کیلئے آپ سنجیدہ اور مزاحیہ اشعار کا بر محل استعمال بھی فرمایا کرتے ہیں۔ آپ کو یہ استعداد اور ملکہ بھی حاصل ہے کہ آپ سامعین میں سے ہر چھوٹے بڑے کو یہ محسوس کرا دیں کہ آپ اسی سے براہ راست مخاطب ہیں۔

لیکن لفظوں سے جو تصویر آپ کھینچتے ہیں خود اس سے لاتعلق نہیں رہ سکتے۔ فاصلے سے اور جذبات سے عاری ہو کر اس تصویر کو دیکھنے کے آپ عادی نہیں ہیں۔ جس مضمون کو آپ بیان فرماتے ہیں۔ وہ مجسم ہو کر آپ کے سامنے آن کھڑا ہوتا ہے۔ جذبات کا ذکر ہو تو جذبات آپ پر وارد ہوتے ہیں اور آپ انہیں براہ راست محسوس کرتے ہیں۔ ایسے موقعوں پر آپ کی آواز بھرا جاتی ہے۔ اور اس میں لرزش پیدا ہو جاتی ہے۔ قریب سے دیکھنے والے جانتے ہیں کہ آپ کی آنکھیں ڈبڈبا جاتی ہیں۔ اور چہرہ آنسوؤں سے تر ہو جاتا ہے۔

حضور خود فرماتے ہیں :

"کچی بات تو یہ ہے کہ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کتنی

بھی کوشش کیوں نہ کروں میں اپنے جذبات کو چھپا نہیں سکتا۔
میں نے زندگی میں اتنے دکھوں کا مشاہدہ کیا ہے کہ اپنے کرب
کو چھپانا میرے بس کی بات نہیں رہی۔ دکھوں سے مراد
میرے اپنے ذاتی دکھ نہیں بلکہ اوروں کے دکھ ہیں۔ میں
ایسے ایسے اداس اور دکھی انسانوں سے ملا ہوں جو اپنی بے بسی
اور دل شکستگی میں یکسر گم ہو کر رہ گئے۔ یہاں تک کہ ان کے
تصور ہی سے میں دکھی اور اداس ہو جاتا ہوں۔ اور ستم تو یہ
ہے کہ ان دکھی انسانوں کے قرب و جوار میں کتنے ہی ایسے
لوگ آباد ہیں جنہیں یہ غریب نظر تک نہیں آتے جن کے
نزدیک ان کا ہونا نہ ہونا برابر ہے"
"نہ جانے لوگ ایسے کٹھور کیسے بن جاتے ہیں؟"

عید الفطر کی آمد آمد تھی۔ مسجد اقصیٰ میں موجود کئی لوگ سوچ رہے تھے کہ نہ جانے حضور آج کس موضوع پر عید کا خطبہ دیں۔ چھوٹے بڑے سبھی ہمہ تن انتظار تھے۔

آپ نے فرمایا :

"میں حسب معمول اس وقت معروف نیکیوں اور
خیرات کی تلقین نہیں کر رہا' نہ ہی آپ سے کسی مالی قربانی کا
مطالبہ کر رہا ہوں۔ جو مطالبہ میں آج کے دن آپ سے کرنا
چاہتا ہوں اسے کسی قیمت پر خریدا نہیں جا سکتا خواہ آپ کے
پاس کتنا ہی مال و دولت کیوں نہ ہو۔ میرا مطالبہ صرف اتنا ہے
کہ آپ سب عید کی خوشیوں میں برابر کے شریک ہوں۔

میری دلی تمنا ہے کہ عید الفطر آپ سب کے لئے مسرتوں کا پیغام لے کر آئے اور ان مسرتوں میں آپ بلا استثناء سب کے سب یکساں طور پر شامل ہوں۔

ذرا سوچئے تو سہی آپ خوش کیسے ہو سکتے ہیں جب خود آپ کے اپنے ہاں تو عید کا جشن منایا جا رہا ہو اور آپ ان گھروں کے پاس سے آنکھیں بند کر کے چپکے سے گزر جائیں جہاں ایسے مجبور اور بے بس لوگ رہ رہے ہوں جو تنہا بھی ہوں اور عمر رسیدہ بھی یا پھر اتنے مفلس اور قلاش کہ عید کے دن بھی ان کے بچے قوت لایموت تک کے محتاج ہوں۔ آپ کس دل سے اپنے بچوں میں تحائف بانٹ سکتے ہیں جبکہ آپ کو علم ہو کہ قریب ہی ایسے بچے بھی موجود ہیں جن کے پاس شدید سردی میں بھی تن ڈھانپنے کو کپڑا تک نہیں۔ اگر آپ واقعی حقیقی معنوں میں عید کی خوشیوں سے لطف اندوز ہونا چاہتے ہیں تو اٹھیں اور ان لوگوں کی تلاش میں نکل کھڑے ہوں اور ان بے سہاروں کا سہارا بن جائیں۔ ایسے لوگ ہر جگہ اور ہر ملک میں موجود ہیں۔ یاد رکھیں کہ مسرتوں کو محدود نہیں کیا جا سکتا۔ کوشش کر کے دیکھ لیں، حد سے زیادہ خوشیاں نہیں بانٹی جا سکتیں کیونکہ خوشیوں کی تو کوئی حد ہے ہی نہیں۔ لطف یہ ہے کہ جتنی خوشیاں آپ بانٹیں گے آپ کی اپنی خوشیوں میں بھی اتنا ہی اضافہ ہوتا چلا جائیگا"۔

بعد میں حضور نے اس عید کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا :

"امسال عید کیا تھی؟ ایک مسحور کن روحانی تجربہ تھا۔
یوں لگتا تھا جیسے میری خواہش کی تکمیل میں لوگ چاروں
طرف گلی کوچوں میں نکل کھڑے ہوئے ہوں۔ مجھے ہزار ہا
خطوط ایسے لوگوں کے موصول ہوئے جنہوں نے بتایا کہ اس
سے پہلے عید کی تقریب پر وہ کبھی اتنے لطف اندوز نہیں
ہوئے تھے جتنے اب کی بار ہوئے۔ ایسے خط بھی ملے جن میں
خوشیاں بانٹنے والے پڑوسیوں کی محبت کا تذکرہ تھا۔
کچھ خط ایسے لوگوں کی طرف سے بھی آئے جنہوں نے
اعتراف کیا کہ عید کی خوشیوں میں اوروں کو شریک کرکے
خود انہیں کتنی مسرت حاصل ہوئی۔ اپنے محروم پڑوسیوں کو
عید کی خوشیوں میں شامل کرنا تو وہ پہلے بھی چاہتے تھے لیکن
درمیان میں ایک حجاب سا حائل تھا اور اس قسم کی پیشکش
کرتے ہوئے ہچکچاہٹ سی محسوس ہوا کرتی تھی۔ بلکہ پہلے تو
کبھی کبھی وہ مستحقین کے پاس سے یوں چپ چاپ گزر جایا
کرتے تھے جیسے کوئی تعلق ہی نہ ہو۔ الحمدللہ کہ اب انہی
لوگوں سے ان کا دوستی اور محبت کا رشتہ قائم ہو چکا تھا"۔

آپ نے فرمایا :

"یہ صرف خدا تعالیٰ سے محبت ہی ہے جو لوگوں کو ایسے
اعمال بجالانے کی توفیق عطا کرتی ہے"۔

یہ ۱۹۸۸ء کی بات ہے۔ اگست کی سترہ تاریخ تھی اور صبح پانچ بجے کا وقت۔ نماز
فجر کی ادائیگی کے بعد حضور مسجد سے اپنی رہائش گاہ میں جو مسجد سے ملحقہ دفاتر میں

واقع ہے 'تبدیلی لباس کیلئے تشریف لے گئے۔ آپ نے سفید لباس زیب تن کیا ہوا تھا۔ کاٹن کی شلوار۔ اچکن جس کے بٹن گلے تک بند تھے اور پنجابی طرز کی شملے دار پگڑی۔ لباس میں کوئی قابل ذکر بات نہ تھی اگر تھی بھی تو سنہری رنگ کی کلاہ تک محدود تھی جو آپ نے پگڑی کے نیچے پہنی ہوئی تھی۔ اس کا صرف رنگ ہی سنہرا تھا۔ ورنہ اس میں سونے کا تو شائبہ تک نہ تھا۔

جب آپ تبدیلی لباس کے بعد واپس تشریف لائے تو آپ نے ٹریک سوٹ پہنا ہوا تھا اور پاؤں میں اونی جوتا۔ سر پر ہلکے بھورے رنگ کی چترالی ٹوپی تھی جو پاکستان کے شمال مغربی سرحدی صوبے میں بنائی جاتی ہے یہ ٹوپی بڑی ہلکی پھلکی اور آرام دہ ہوتی ہے اور گرم بھی۔

مسجد سے ملحق حفاظتی عملے کیلئے دو حفاظتی چوکیاں ہیں۔ جہاں سے دونوں صدر دروازوں کی نگرانی کی جا سکتی ہے۔ صبح ہو چکی تھی۔ تین کاریں یکے بعد دیگرے ایک قطار میں منتظر کھڑی تھیں۔ میجر محمود احمد صاحب پہلی کار میں سوار ہوئے اور باقی پہرے دار آخری کار میں اور حضور درمیانی کار میں بیٹھ گئے۔

محمود احمد پاکستان آرمی کے مایہ ناز سپیشل سروس گروپ کے ریٹائرڈ میجر ہیں اور آجکل حضور کے حفاظتی عملے کے سربراہ ہیں۔ یاد رہے کہ پاکستان آرمی کا سپیشل سروس گروپ برطانوی ایس۔اے۔ایس کا ہم پلہ سمجھا جاتا ہے۔

پارک میں پہنچتے ہی سیر شروع ہو گئی۔ میجر محمود احمد صاحب حضور کے برابر لیکن ذرا ہٹ کر۔ کچھ حفاظتی عملہ تیر نما تکون کی شکل میں آگے آگے اور دو محافظ حضور کے عقب میں پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔ یوں سمجھ لیجئے کہ حضور حفاظتی عملے کے عین وسط میں تھے میجر محمود احمد صاحب کے ہاتھ میں ایک مضبوط موٹی چھڑی تھی جسے انہوں نے سہارے کیلئے نہیں بلکہ ممکنہ حملے کے پیش نظر ایک مفید اور

موثر دفاعی ہتھیار کے طور پر تھام رکھا تھا۔ اس قسم کی احتیاط کی ضرورت بھی تھی کیونکہ قبل ازیں جماعت احمدیہ کے امام دوئم پر ایک قاتلانہ حملہ ہو چکا تھا جس کے دوران آپ شدید زخمی ہو گئے تھے۔

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ میجر محمود احمد ہمہ وقت چوکس، چاک و چوبند اور گرد و پیش کی ہر حرکت و سکون سے باخبر رہتے ہیں۔

صبح کی سیر کے آغاز میں کوئی بات چیت نہیں ہوتی۔ حضور فرماتے ہیں کہ یہی تو غور و فکر کا وقت ہوتا ہے۔

گرمی ہو یا جاڑا آپ فجر کی نماز کے فوراً بعد سیر کیلئے تشریف لے جاتے ہیں۔ کبھی کبھی تو آج کی طرح موسم صاف اور خوشگوار ہوتا ہے۔ اس وقت اور لوگ بھی پارک میں گھومنے کیلئے آجاتے ہیں۔ کچھ دوڑ لگا رہے ہوتے ہیں یا پھر کچھ لوگ اپنے پالتو کتوں کو ورزش کروا رہے ہوتے ہیں۔ لیکن موسم سرما میں سخت سردی، دھند اور بارش ہوتی ہے ایسے میں آپ کے علاوہ پارک میں کوئی اور ذی روح نظر نہیں آتا۔

آپ پوری رفتار سے روزانہ پانچ میل لمبی سیر فرماتے ہیں۔ جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے سیر کے آغاز میں کوئی گفتگو نہیں ہوتی اور ان دنوں تو لے دے کر یہی ایک جسمانی ورزش رہ گئی ہے۔ جس کیلئے آپ وقت نکال سکتے ہیں۔

آج سیر کے آخری مرحلے پر جب آپ جھیل پر پہنچے تو حفاظتی عملے کے ایک فرد نے آگے بڑھ کر روٹیوں کے بچے کھچے ٹکڑوں سے بھرا ہوا ایک تھیلا آپ کی خدمت میں پیش کیا۔ چشم زدن میں پرندوں کے غول کے غول اس خوان یغما سے اپنا اپنا حصہ لینے کیلئے آن وارد ہوئے۔ ان میں چڑیاں، کوے، سمندری بگلے، راج ہنس اور پانی کے انواع و اقسام کے پرندے شامل تھے۔

جہیل سے آگے آپ کی رفتار کچھ دھیمی پڑ گئی اور سیر کے وہ ساتھی جو آپ کی اجازت سے سیر میں شامل ہوئے تھے قریب آ گئے۔ اب ان کی آپس میں زیر لب کچھ گفتگو بھی ہونے لگی۔ اگرچہ حضور نے اس گفتگو میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ یوں لگا جیسے کسی گہری سوچ میں گم ہوں۔

جس صبح کا ہم ذکر کر رہے ہیں۔ اسی صبح لندن مسجد کے ایک سابق امام صاحب نے حضور کو اپنی ایک تازہ رؤیا سنائی تھی۔ رؤیا یہ تھی کہ جنرل ضیاء الحق جماعت احمدیہ پر ظلم و تشدد کرنے پر تلا ہوا ہے۔

اس پر آپ نے فرمایا : "اگر ایسی بات ہے تو وہ اللہ کی گرفت سے نہیں بچ سکے گا۔" نیز فرمایا : "مجھے یقین ہے کہ عنقریب کچھ ہونے والا ہے" حضور کے اس ارشاد کی تاریخ اور وقت کو نوٹ کر لیا گیا تھا۔

پس منظر اس کا یہ ہے کہ چار ہفتے قبل حضور نے سچ اور جھوٹ میں فیصلے کیلئے مباہلے کا چیلنج دیا تھا۔ پانچ دن ہوئے آپ نے ایک اور اعلان فرمایا جو یہ تھا کہ آسمان پر ضیاء الحق اور اس کے حمایتیوں کی قسمت کا فیصلہ ہو چکا ہے۔

یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ پیغمبر اسلام (حضرت) محمد (مصطفیٰ ﷺ) نے بھی چودہ سو سال قبل مباہلے کا ایسا ہی چیلنج دیا تھا۔ جب لوگ دلائل و براہین سے قائل ہونے پر آمادہ نہ ہوئے تو آپؐ نے اعلان فرمایا تھا کہ چونکہ مخالفین کا رویہ دیانت پر مبنی نہیں ہے اس لئے آیئے اللہ تعالیٰ کو ثالث مان کر اسی سے فیصلے کی درخواست کریں۔ نتیجہ یہ ہو گا کہ طرفین میں سے جھوٹے پر یقیناً خدا کی لعنت پڑے گی۔

جنرل ضیاء الحق اور اس کے حمایتیوں کو مباہلے کا چیلنج دیتے وقت حضور نے بھی یہی اعلان کیا تھا کہ "آیئے فیصلہ خدا پر چھوڑ دیں۔ جو کچھ تم کر رہے ہو اگر

جائز اور انصاف پر مبنی ہے تو یقیناً خدا تمہاری مدد کے لئے آئے گا لیکن اگر ظلم و ستم کا تمہارا یہ طریق سراسر ناجائز ہے اور انصاف پر مبنی نہیں اور اگر تم نے یہ راستہ دیانت اور سچائی سے اختیار نہیں کیا تو یاد رکھو تم اللہ کے غضب سے نہیں بچ سکو گے۔"

سیر کے بعد آپ مشن ہاؤس میں واپس تشریف لائے۔ ناشتہ بھی آپ نے خود ہی تیار کیا اور کیا بھی اکیلے ہی۔ کیونکہ اس وقت لندن مسجد کے سب مکین نماز فجر کے بعد آرام کر رہے تھے۔ ناشتے کے بعد آپ نے ایک گھنٹہ تک قرآن (کریم) کی تلاوت کی اور پھر دفتر پہنچ گئے۔ یعنی اپنے سیکرٹریوں کے پہنچنے سے بھی ایک ڈیڑھ گھنٹہ پہلے۔

اسی شام تقریباً چار بجے یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی کہ وہ ہوائی جہاز جو جنرل ضیاء الحق اور اس کے نو جرنیلوں کو لے کر جا رہا تھا تباہ و برباد ہو گیا۔ مسافروں میں سے کوئی بھی زندہ نہ بچ سکا۔ کچھ معلوم نہ ہو سکا کہ یہ حادثہ کیسے رونما ہوا۔

اگلے دن دنیا بھر کے اخباروں میں شہ سرخیوں کے ساتھ یہ خبر شائع ہوئی کہ

"طیارے کے حادثے میں "ضیاء" کے پرخچے اڑ گئے"۔

"سارا جسم فضا میں منتشر ہو کر رہ گیا۔ تدفین کیلئے صرف اس کے مصنوعی دانت ہی مل سکے۔ حادثے کی یہ خبر سن کر حضور نے فرمایا :

"خدا کا غضب اسی کو کہتے ہیں"

☆ ☆ ☆

2

حضرت مرزا غلام احمد قادیانی (علیہ السلام)

عام طور پر کسی پیغمبر کا کام اس کی زندگی میں انجام تک نہیں پہنچتا۔ اس کی وفات کے بعد اس کے جانشین اس کے مشن کو جاری رکھتے ہیں۔ اپنے جانشین کو یا تو وہ اپنی زندگی ہی میں خود نامزد کر جاتا ہے یا بصورت دیگر اس کی وفات کے بعد اس کے متبعین اپنے میں سے کسی ایک کو جانشین کے طور پر چن لیتے ہیں مثلاً (حضرت) یسوع مسیح کے بعد جناب پطرس جانشین ہوئے اور پیغمبر اسلام (حضرت) محمد (مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے بعد (حضرت) ابوبکر (رضی اللہ عنہ)۔

خلیفہ عربی کا لفظ ہے جو انگریزی میں بگڑ کر CALIPH بن گیا ہے۔ خلیفہ کے معنی تو جانشین کے ہیں لیکن انگریزی میں اس کا مفہوم بہت مختلف ہے۔ انگریزی میں اس لفظ سے عموماً کسی مشرقی ملک کا حاکم یا سلطان مراد لیا جاتا ہے۔ ایسا حاکم جس کا کوئی روحانی منصب یا مقام نہیں ہوتا۔ البتہ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے ان کے نزدیک خلیفہ کے لفظ کا صرف اور صرف ایک ہی مفہوم ہے۔ یعنی نبی یا رسول

کا جانشین۔

پیغمبر اسلام (حضرت) محمد (مصطفیٰ ﷺ) نے پہلے سے بتادیا تھا کہ ان کے بعد ان کے جانشین یعنی خلفاء ہونگے جو ان کے کام کو جاری رکھیں گے۔ لیکن آخری زمانے میں جب اسلام خطرات میں گھر جائیگا تو مسیح موعود کا نزول ہوگا۔ دنیا کے تمام بڑے بڑے مذاہب میں مسیح کی آمد ثانی یا مہدی آخرالزماں کے بارے میں پیشگوئیاں موجود تھیں۔ مسیح موعود کے آنے کا ایک ہی مقصد تھا یعنی اسلام کی نشاۃ ثانیہ۔ تمام بنی نوع انسان کو حلقہ بگوش اسلام کرنا یہاں تک کہ جملہ مذاہب صرف اسلام پر جمع ہو کر ایک امت واحدہ بن جائیں۔

لدھیانہ ہندوستان کے شمال مغرب میں ایک پسماندہ اور چھوٹا سا قصبہ ہے۔ یہ ۱۸۸۹ء کی بات ہے جب یہاں اللہ کے ایک بندے (حضرت) احمد نے اپنے ماننے والوں سے بیعت کا عہد لیا۔ سب سے پہلے آپ کی بیعت آپ کے صف اول کے ایک مرید نے کی جو شاہی معالج اور طبیب بھی تھے۔ انہوں نے بیعت کرتے وقت مندرجہ ذیل اقرار کیا۔

"میں احمد کے ہاتھ پر بیعت کرتا ہوں اور اپنے تمام سابقہ گناہوں پر خدا کے حضور ندامت اور توبہ کا اظہار کرتا ہوں"

یہ ان دنوں کی بات ہے جب ابھی (حضرت) احمد نے کوئی دعویٰ تو نہیں کیا تھا البتہ آپ کو ایک ایسے عظیم روحانی بزرگ اور عالم دین کے طور پر ضرور تسلیم کیا جاتا تھا جو ہمہ وقت اسلام کی مدافعت کیلئے کمربستہ رہتا تھا اور عامتہ الناس کو نیکی کا راستہ دکھانے کا پوری طرح اہل تھا۔ ایک سال بعد (حضرت) احمد نے اعلان کیا کہ اللہ تعالیٰ نے الہاماً آپ کے اصل مقام اور مقصد کو آپ پر منکشف فرمادیا ہے۔

یعنی آپ ہی وہ مسیح موعود ہیں جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھیجے گئے ہیں اور پیشگوئیوں کے مطابق آپ ہی کے سپرد یہ مشن کیا گیا ہے کہ ساری دنیا کو حلقہ بگوش اسلام کریں۔ نیز یہ کہ اس فریضے کی ادائیگی میں کامیابی ان کا مقدر ہو چکی ہے۔ آپ نے اعلان کیا کہ خدا تعالیٰ نے فرمایا ہے۔

"میں تیری تبلیغ کو زمین کے کناروں تک پہنچاؤں گا"

یہ ایک عجیب اعلان تھا کیونکہ اس وقت (حضرت) احمد کے ماننے والوں کی تعداد پچاس سے زیادہ نہیں تھی۔ لیکن بیس سال بعد مئی ۱۹۰۸ء میں جب پچھتر سال کی عمر میں آپ کی وفات ہوئی تو آپ کے متبعین کی تعداد تین لاکھ تک پہنچ چکی تھی☆ (حضرت) احمد نے اپنے پیروکاروں سے فرمایا۔

"یہ تو ابتدا ہے میرے جانے کے بعد قدرت ثانیہ کا عظیم نشان ظاہر ہو گا"۔

جماعت احمدیہ ان الفاظ کے مفہوم کے بارے میں کسی شک و شبہ میں مبتلا نہیں۔ احمدی حضرات یقین رکھتے ہیں کہ (حضرت) احمد کی وفات کے بعد خلفاء کے ایک سلسلے کا آغاز ہو گا۔ یہ خلفاء (حضرت) احمد کے کام کو اس کے عظیم انجام اور انتہا تک پہنچا کر دم لیں گے۔ یہاں تک کہ تمام دنیا حقیقی اسلام کے جھنڈے تلے جمع ہو جائے گی۔ یہ خلفاء (حضرت) احمد کے متبعین میں سے ہوں گے۔

چنانچہ آپ نے فرمایا:

"خدا تعالیٰ نے اس گروہ کو اپنا جلال ظاہر کرنے کے لئے اور اپنی قدرت دکھانے کے لئے پیدا کرنا

☆ چشمہ معرفت میں حضرت اقدس مسیح موعودؑ نے چار لاکھ تعداد درج فرمائی ہے۔ (مترجم)

اور پھر ترقی دینا چاہا ہے تا دنیا میں محبت الٰہی اور توبہ نصوح اور پاکیزگی اور حقیقی نیکی اور امن اور صلاحیت اور بنی نوع کی ہمدردی کو پھیلا دے۔ سو یہ گروہ اس کا ایک خالص گروہ ہو گا اور وہ انہیں آپ اپنی روح سے قوت دے گا اور انہیں گندی زیست سے صاف کرے گا اور ان کی زندگی میں ایک پاک تبدیلی بخشے گا۔ وہ جیسا کہ اس نے اپنی پاک پیشین گوئیوں میں وعدہ فرمایا ہے اس گروہ کو بہت بڑھائے گا اور ہزارہا صادقین کو اس میں داخل کرے گا۔ وہ خود اس کی آبپاشی کرے گا اور اس کو نشو و نما دے گا یہاں تک کہ ان کی کثرت اور برکت نظروں میں عجیب ہو جائے گی اور وہ اس چراغ کی طرح جو اونچی جگہ رکھا جاتا ہے دنیا کی چاروں طرف اپنی روشنی کو پھیلائیں گے اور اسلامی برکات کے لئے بطور نمونہ کے ٹھہریں گے۔ وہ اس سلسلہ کے کامل متبعین کو ہر یک قسم کی برکت میں دوسرے سلسلہ والوں پر غلبہ دے گا اور ہمیشہ قیامت تک ان

میں سے ایسے لوگ پیدا ہوتے رہیں گے جن کو قبولیت
اور نصرت دی جائے گی۔ اس رب جلیل نے یہی چاہا
ہے۔ وہ قادر ہے جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ ہر یک
طاقت اور قدرت اسی کو ہے۔"

اور ہوا بھی یہی۔ پہلی بیعت کے پورے سو سال بعد یعنی مارچ ۱۹۸۹ء تک (حضرت) احمد کی قائم کردہ اس جماعت کی کامیابیوں نے سچ مچ دنیا کو ورطہ حیرت میں ڈال دیا۔ آج (حضرت) مسیح موعود (علیہ السلام) کے پوتے اس جماعت کے امام اور خلیفہ وقت ہیں۔ ان کا نام نامی حضرت صاحبزادہ مرزا طاہر احمد ہے۔

"اب میں آپ کو کیا کہہ کر مخاطب کروں؟" امینہ بیگم نے پوچھا۔ امینہ ان کے ایک بہت پرانے دوست کی بیگم ہیں۔ یہ سوال امینہ بیگم نے اس وقت کیا جب آپ خلیفہ منتخب ہو چکے تھے۔ اور انتخاب کے بعد آپ کی خدمت میں وہ پہلی بار ملاقات کیلئے حاضر ہوئی تھیں۔ اس سوال کے ساتھ ہی امینہ بیگم کا سر چاندی کی اس انگوٹھی کو دیکھ کر جو خلافت کی علامت ہے فرط ادب سے جھک گیا۔ صاحبزادہ طاہر احمد کو وہ ان دنوں سے جانتی تھیں جب آپ لندن میں طالبعلم کی حیثیت سے مقیم تھے۔ آپ ایک مختصر سے کمرے میں لندن کے ایک متوسط قسم کے علاقے میں سکونت پذیر تھے۔ اور کبھی کبھی امینہ بیگم اور ان کے میاں کو گیس کے چولہے پر اپنے ہاتھ سے کھانا تیار کر کے پیش کیا کرتے تھے۔ اس وقت وہ انہیں "طاہری" کہہ کر مخاطب کیا کرتی تھیں۔ طاہری، طاہر ہی کا مخفف ہے جو بے تکلفی بھی ہے

اور اس میں خاصہ قرب اور اپنائیت بھی پائی جاتی ہے۔

امینہ کے اس سوال کے جواب میں آپ نے فرمایا :

"مجھے جس نام سے چاہو پکارو۔ ہم وہی پرانے دوست ہیں"

امینہ بولی "جی تو چاہتا ہے۔ آپ کو اب بھی طاہری کہہ کر ہی مخاطب کروں لیکن ہمت نہیں پڑتی"

اب (حضرت مرزا) طاہر احمد کو کوئی بھی "طاہری" کہہ کر مخاطب نہیں کرتا کیونکہ اب خدا نے ان کو ساری دنیا کیلئے اپنے خاص الخاص بندے کی حیثیت سے چن لیا ہے۔ یہ خلیفہ وقت ہی کی ہستی ہے جن کی طرف احمدی اضطرار اور مصیبت کی گھڑیوں میں دعائے خاص کے لئے رجوع کرتے ہیں۔ مثلاً جب موت سامنے کھڑی نظر آ رہی ہو۔ خطرناک بیماری لاحق ہو یا پھر کسی مشورے اور راہنمائی کی ضرورت ہو۔ وہ یقین رکھتے ہیں کہ خدا ان کی دعاؤں کو خاص طور پر سنتا اور شرف قبولیت بخشتا ہے۔ وہ ایسے متعدد واقعات بیان کرتے ہیں کہ جب امید کی کوئی کرن تک دکھائی نہیں دیتی تھی آپ نے اللہ تعالیٰ کے حضور دعا کی جو قبول ہوئی۔

انہیں یقین ہے کہ یہی وہ خلیفہ ہے جو اسلام کے جھنڈے تلے بنی نوع انسان کے درمیان کامل اخوت کے رشتوں کو استوار کریگا اور جس کے ہاتھ پر تمام مذاہب عالم اسلام میں مدغم ہو کر ایک ملت واحدہ بن جائیں گے۔

یہ منصب بھی آپ ہی کو حاصل ہے کہ آپ اس قانون شریعت کی تشریح و تفسیر کریں اور اس سے متعلق اجتہاد سے کام لیں جو انسانوں کی فلاح کیلئے نازل کیا گیا یعنی قرآن۔ جسے اللہ تعالیٰ نے (حضرت) محمد (مصطفیٰ ﷺ) کو بذریعہ وحی

جلی عطاء فرمایا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ بحیثیت خلیفہ آپ کامل محبت اور کامل اطاعت اور احترام کے مستحق ہیں اس لئے انہیں اب "طاہری" کہہ کر مخاطب کرنا مناسب معلوم نہیں ہوتا۔

☆ ☆ ☆

3

قادیان
نئے دور کا آغاز

(حضرت) خلیفہ ثانی (رضی اللہ) کی ۱۹۲۲ء میں حضرت مریم صدیقہ سے شادی ہوئی۔ شادی کے وقت سیدہ موصوفہ سترہ سال کی تھیں جبکہ (حضرت) خلیفہ ثانی تینتیس برس کے تھے۔ یہ ان کی تیسری حرم تھیں۔ جماعت احمدیہ میں آپ (حضرت) سیدہ ام طاہر کی کنیت سے معروف ہیں۔ (حضرت) خلیفۃ المسیح الرابع کی پیدائش ۱۸ دسمبر ۱۹۲۸ء کو قادیان میں ہوئی۔

۱۸ دسمبر کا دن یوں بھی مسرت اور شادمانی کا دن تھا۔ ہر طرف ایک جشن کا سا سماں تھا آج کے دن قادیان میں ریل گاڑی کی سروس کا افتتاح ہونا تھا۔ ۳۵ میل دور امرتسر کے شہر سے پہلی دفعہ ریلوے ٹرین قادیان آ رہی تھی۔ ریلوے لائن بچھائی جا چکی تھی۔ کئی عمر رسیدہ لوگ تو فرط شوق سے بے قرار ہو کر امرتسر جا پہنچے

تھے تاکہ اس افتتاحی ٹرین پر سوار ہو کر اس تاریخی سفر میں حصہ لے سکیں۔ یہی وجہ تھی کہ ریلوے اسٹیشن پر لوگوں کا ایک بہت بڑا ہجوم اکٹھا ہو گیا تھا۔ ہر ایک خواہشمند تھا کہ اسے تماشائیوں میں سب سے آگے جگہ ملے جہاں سے وہ ٹرین کی آمد کا بخوبی نظارہ کر سکے۔ ایسے لوگ بھی تھے جن کے لئے ریل کا سفر کوئی عجوبہ نہیں تھا۔ وہ اس سے پہلے بھی بارہا ریلوے ٹرین پر سفر کر چکے تھے۔ یہ لوگ اپنے ساتھی تماشائیوں کو جنہیں قادیان سے باہر قدم رکھنا نصیب نہ ہوا تھا فخریہ بتاتے ہوئے نہیں تھکتے تھے کہ وہ ریل گاڑی پر سفر کر چکے ہیں۔ ریل گاڑی کے انجن سے بھاپ اور دھوئیں کے بادل نکلتے ہیں۔ "لیکن خاطر جمع رکھیں ڈرنے کی کوئی بات نہیں"

اب یکوں اور گھوڑے گاڑیوں کی پہلی سی ضرورت باقی نہیں رہی تھی۔ یکہ بانوں کے علاوہ سبھی سمجھتے تھے کہ ریل گاڑی کی آمد ایک خوش آئند انقلاب ہے اور قادیان کی جماعت ہی نہیں بلکہ ساری جماعت احمدیہ ایک نئے دور میں داخل ہونے والی ہے۔ سفر کی اس نئی سہولت کا مطلب صاف واضح تھا۔ اب آنے والے بذریعہ ریل بآسانی قادیان آ جا سکیں گے اور جماعت کی تبلیغی سرگرمیاں پہلے سے کہیں زیادہ وسعت اختیار کر جائیں گی۔ خوشی کی اس تقریب میں بہت سے بچے بھی شامل تھے۔ جو ریلوے سٹیشن کے آس پاس کھیل کود میں مصروف تھے ان میں (صاحبزادہ) مرزا مظفر احمد بھی شامل تھے جو بڑے ہو کر پاکستان کے وزیر خزانہ اور عالمی بینک کے ڈائریکٹر بنے۔ وہ کہتے ہیں۔

> "اس موقعے پر ہم بچوں میں بھی ایک عجیب قسم کا جوش و خروش پایا جاتا تھا۔ مجھے خوب یاد ہے کہ ریل کی آمد کی وجہ سے ہی نہیں ہمارے بزرگ ایک اور وجہ سے بھی بے حد

خوش تھے۔ اور وہ تھی (حضرت) خلیفہ ثانی (رضی اللہ عنہ) کے ہاں عین اسی دن یعنی ۱۸ دسمبر ۱۹۲۸ء کو ایک بچے کی پیدائش۔ (حضرت سیدہ) ام طاہرؓ کو اللہ تعالیٰ نے دو بیٹیوں امتہ الحکیم اور امتہ الباسط سے نوازا ہوا تھا ان کا ایک بیٹا صغر سنی ہی میں وفات پا چکا تھا۔ اس لئے انہیں بیٹے کی شدید خواہش تھی۔ اس نومولود کی پیدائش بھی اللہ تعالیٰ کے خاص فضل کا ایک نشان تھی۔

طاہر ایک صحت مند اور خوبصورت بچہ تھا۔ جس کی آنکھیں گہری بھوری اور بال باریک اور سیاہ تھے۔ ناک ستواں لیکن ذرا خمدار تھی۔ جیسا کہ ماؤں کا خاصہ ہے بچے کی صحت اور طاقت کو برقرار رکھنے کیلئے اس کی والدہ بھی رات دن بے قرار رہتی تھیں۔

جب بچے کا دودھ چھڑایا گیا تو اس کی دایہ اسے روزانہ ایک فارم پر لے جایا کرتی تھی جہاں بھینس کے تھنوں سے دودھ کی دھار براہ راست سیدھی بچے کے منہ میں پہنچ جاتی۔ یہ دودھ تازہ اور نیم گرم بھی ہوتا اور لذیذ اور نشوونما کیلئے مفید بھی۔ ایک فائدہ یہ بھی تھا کہ یہ دودھ ہر قسم کی بیرونی آلائش سے پاک اور محفوظ بھی ہوتا تھا۔

ننھا طاہر بچپن میں بہت کم بیمار ہوا۔ جماعت احمدیہ کے بڑے بوڑھوں کو آج تک اس کے قہقہے، چلبلاپن اور معصوم شرارتیں یاد ہیں۔ وہ ایک ہنس مکھ اور شگفتہ مزاج بچہ

تھا- بات بات پر ہنسی مذاق کا دلدادہ- ہر آن اپنے ہم عمروں سے فٹ بال کھیلنے پر کمربستہ اور ہمہ وقت انہیں مقابلے کا چیلنج دینے کیلئے بے قرار- ننگی دیوار پر چلنے کا مقابلہ ہو یا موسم برسات میں پانی سے پُر گڑھے پھلانگنے کا شغل، سکول کے اندر باہر اپنی ننھی معصوم حرکتوں میں اپنے ہم جولیوں سے آگے نکلنے کی امنگ ہو یا پھر کسی استاد سے ہلکی پھلکی چھیڑ چھاڑ کی کوشش جو خفا کرنے کی بجائے مسکرانے پر مجبور کر دے اور پھر قہقہوں پر قہقہے- یہاں تک کہ کسی ہم عمر بچے کی ناکام چھلانگ پر بھی بے اختیار ہنس دینا- وہ خود کہتے ہیں کہ ہم تو کبھی کبھی ایسے موقعوں پر بھی ہنسی نہیں روک سکتے تھے جب ہنسنا اتنا مناسب نہیں سمجھا جاتا مثلاً جب کوئی بچہ کسی گڑھے کو پھلانگنے کی دھن میں دھڑام سے کیچڑ میں جا پڑے یا کسی چھابڑی فروش کی چھابڑی اچانک زمین پر آ رہے-

خود فرماتے ہیں :

"غالباً میرے اندر مزاح کی کوئی ایسی حس ضرور موجود تھی جو کبھی کبھی تو عمر رسیدہ لوگوں کا ناک میں دم کر دیا کرتی ہے- خصوصاً جب یہ حس چھوٹے بچوں میں پائی جائے- کتنے عجیب دن تھے- ہنسی تھی کہ رکنے ہی میں نہیں آتی تھی- گھر کو واپس لوٹتے تو مسرتوں اور خوشیوں کا ایک سیلاب تھا جو ہمارے ہمراہ باہر سے گھر کے اندر آداخل ہوتا تھا-"

(حضرت) خلیفہ ثانی (رضی اللہ عنہ) یعنی آپ کے والد محترم ایک کوہ وقار تھے

اپنے فرائض منصبی کی بجا آوری میں انتہائی انہماک رکھنے والے اور اپنے محدود ذرائع آمدنی کے متعلق پورے باخبر۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ وہ فارغ اوقات کے استعمال اور تفریحات کے بارے میں بے حد محتاط تھے۔

(حضرت) مرزا طاہر احمد کہتے ہیں :

"بچپن کے ابتدائی ایام میں تو ہمیں یوں لگتا تھا جیسے وہ ہم سے کچھ الگ تھلگ سے ہوں۔ ایک عجیب طرح کا رعب تھا جو ہم سب پر طاری رہتا تھا۔ اگرچہ وہ ہمیں پیار بھی بہت کرتے تھے اور کبھی کبھی ہمارے ساتھ کھیل میں بھی شریک ہو جایا کرتے تھے پھر بھی ایک گونہ فاصلہ سا تھا۔ ایک دوری سی تھی جو حائل تھی۔ ہم جانتے تھے کہ آپ ہمارے ابا جان ہی نہیں عالمگیر جماعت احمدیہ کے امام بھی ہیں۔ لیکن ہم نے کبھی اس حیثیت سے بے جا فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کی۔ نہ ہی کبھی حد ادب سے تجاوز کیا۔ حفظ مراتب کی یہ حد فاصل بہر حال ہمیشہ قائم رہی۔

تھے تو ہم کم سن بچے لیکن ابا جان (رضی اللہ عنہ) کی بے تکلفی اور ہنسی کھیل کے جواب میں ہم نے اس کم عمری میں بھی شاذ و نادر ہی حد ادب کو پار کرنے کی جرأت کی ہوگی۔ اگرچہ ان دنوں تو مجھے یہ ایک امتیازی خصوصیت بھی حاصل تھی کہ میں ہنسی کھیل میں دوسروں کی نسبت کچھ زیادہ ہی مذاق کی جسارت بھی کر لیا کرتا تھا۔"

لیکن اگر صاحبزادہ طاہر احمد کی امی کو کبھی ذرا سا شک بھی پڑ جاتا کہ ہنسی ہنسی میں ہی کیوں نہ ہو آپ نے اپنے ابا جان کی شان میں حد ادب سے خفیف سا بھی

تجاوز کیا ہے تو پھر اللہ دے اور بندہ لے۔ طاہر میاں کی شامت آجاتی۔ وہ خود فرماتے ہیں :

"امی جان ہماری خوب خوب گوشمالی فرماتیں اور ایسے موقعوں پر بے دریغ خفگی کا اظہار بھی ہوتا اور ہماری مزاج پرسی بھی۔

تعلیم جس سے آجکل کی رسمی تعلیم مراد ہے وہ تو امی جان نے حاصل نہیں کی تھی۔ اخبار وغیرہ البتہ آسانی سے پڑھ لیتی تھیں اور کتب بھی۔ لیکن انہیں خالص ادبی لٹریچر کے مطالعے کا کوئی خاص شوق نہیں تھا۔ درحقیقت وہ ایک سادہ دل خاتون تھیں۔ بنیادی طور پر ان کا ایک ہی مذہب تھا۔ یعنی محبت (حضرت اقدس) محمد (مصطفیٰ ﷺ)۔ قرآن (کریم) اور (حضرت) بانی سلسلہ (عالیہ احمدیہ) سے تو انہیں محبت ہی نہیں عشق تھا۔

اگر انہیں کبھی ہلکا سا بھی احساس ہوتا کہ طاہر قرآن (کریم) کی تلاوت اور اسلامی لٹریچر کے مطالعے کی طرف پوری توجہ نہیں دے رہے تو ناپسندیدگی کا اظہار فرماتیں بلکہ زجر و توبیخ بھی کرتیں۔

فرماتے ہیں :

"میں خلیفہ منتخب ہوا تو مجھ پر یہ راز کھلا کہ وہ اتنی خفا کیوں ہو جایا کرتی تھیں"

خلیفہ وقت کی حرم کی حیثیت سے (حضرت) ام طاہر کو ایک غیر معمولی مقام

حاصل تھا۔ جب (حضرت) مسیح موعود (علیہ السلام) کا کم سن فرزند مبارک احمد بیمار ہوا اور موت یقینی نظر آنے لگی تو ایک سوچ یہ بھی تھی کہ اگر اس کی شادی کردی جائے تو بعید از امکان نہیں کہ خدا تعالیٰ اسے زندگی بخش دے۔ چنانچہ اس کا نکاح ننھی مریم سے کردیا گیا۔ مریم (حضرت) ڈاکٹر سید عبد الستار شاہ صاحب کی شیر خوار بیٹی تھیں۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے ڈاکٹر صاحب حسب و نسب کے لحاظ سے نجیب الطرفین سید یعنی (حضرت) پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) کی نسل میں سے تھے۔ لیکن مبارک احمد فوت ہو گیا۔ بعد ازاں ایک موقعے پر (حضرت) مسیح موعود (علیہ السلام) نے فرمایا "مجھے امید تھی کہ ایک نہ ایک دن مریم کی شادی ہمارے ہی خاندان میں ہوگی اس طرح (حضرت) محمد (مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم) کے خون میں ان کے خادم اور غلام یعنی (حضرت) مسیح موعود کا خون بھی مل جائے گا۔

جب مریم سترہ سال کی ہو گئیں تو (حضرت) خلیفہ ثانی نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنے والد مرحوم کی خواہش کے احترام میں مریم کو اپنے خاندان میں لے آئیں اور شادی کرلیں۔ مریم کو بھی اس امر کا بخوبی احساس تھا کہ ان کا شجرہ نسب پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) سے جاملتا ہے نیز یہ کہ وہ (حضرت) احمد کے پسر موعود کی ہونے والی بیگم ہیں۔

(حضرت صاحبزادہ) ایم ایم احمد ان کے متعلق بیان کرتے ہیں :

> "(حضرت) ام طاہر مذہب سے دلی اور گہرا تعلق رکھنے والی خاتون تھیں ان کی شدید خواہش تھی کہ ان کا بیٹا طاہر بڑا ہو کر اسلام اور احمدیت کے آسمان پر چمکنے والے ستاروں کے جھرمٹ میں ایک درخشاں ستارہ بن کر چمکے۔

طاہر اگرچہ اپنی والدہ محترمہ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ لیکن لاڈ پیار

نے نہ تو اسے ضرورت سے زیادہ دباؤ میں رکھا اور نہ ہی بگاڑا۔"

وہ خود کہتے ہیں :

"ماں باپ کے لاڈ پیار نے میری عادات کو کبھی خراب نہیں ہونے دیا البتہ کبھی کبھی یہ احساس ضرور ہوا کرتا تھا کہ شاید میری طرف اتنی توجہ نہیں دی جارہی"۔

اس اثناء میں (صاحبزادہ) طاہر احمد کی ایک اور بہن یعنی امتہ الجمیل کی پیدائش ہو چکی تھی۔ (حضرت) خلیفہ ثانی کی چار بیگمات تھیں۔ ان کے الگ الگ گھر تھے۔ سب بیگمات اور ان کے بال بچوں کی اپنی اپنی ایک پہچان تھی۔ (حضرت) خلیفہ ثانی نے ہر گھر کیلئے باری باری ہفتے کے دن مخصوص کئے ہوئے تھے۔ اور آپ خود تیسری منزل میں اپنی بیگمات کے مکانات کی اوپر کی منزل میں رہائش پذیر تھے۔

آپ اپنے اکیس کے اکیس بچوں کے درمیان مکمل مساوات کا سلوک فرمایا کرتے تھے۔ مثلاً اگر ایک بیٹی کو لباس کا نیا جوڑا ملتا تو ویسا ہی جوڑا باقی تمام بیٹیوں کو بھی ملتا۔ آپ کا بیٹوں کے ساتھ بھی برابری کا سلوک ہوا کرتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ (حضرت) خلیفہ ثانی کے تمام کے تمام بچے بھائی بہنوں کی باہمی محبت اور پیار کی فضا میں پروان چڑھے۔ اور زندگی بھر ہر دکھ درد میں ایک دوسرے کے شریک حال رہے۔ یہاں تک کہ صاحبزادہ مرزا طاہر احمد بچپن میں اپنی حقیقی والدہ کے ساتھ ساتھ (حضرت) خلیفہ ثانی کی ہر بیگم کو اپنی دوسری والدہ خیال کیا کرتے تھے. بیگمات بھی ایک دوسری سے انتہائی محبت سے پیش آتیں۔ (حضرت) خلیفہ ثانی نے سات شادیاں کیں۔ اگرچہ اسلامی قانون کے مطابق انکے عقد میں بیک وقت

کبھی بھی چار سے زیادہ بیویاں نہیں رہیں۔ آپ نے ایک مرتبہ بتایا کہ یہ شادیاں انہوں نے (حضرت) مسیح موعود کے خاندان کے تسلسل کو قائم رکھنے کی خاطر کی ہیں۔ البتہ ان کے بیٹوں نے ایسا نہیں کیا۔ اور انہوں نے بیک وقت چار بیویوں کی عظیم ذمہ داری کا بوجھ اٹھانے کی بجائے اپنے آپ کو ایک ایک بیوی تک ہی محدود رکھا۔

کبھی کبھار روزانہ ڈاک کے انبار میں (حضرت) خلیفہ ثانی کو اپنی بیگم مریم (مرحومہ) کا خط بھی ملتا۔ جس میں دوسرے افراد جماعت کی طرح یہ درخواست کی ہوتی "آپ میرے لئے دعا کریں"

وہ جانتی تھیں کہ آپ ان کے خاوند تو تھے ہی لیکن دعا کی درخواست ان کی خدمت میں وہ ان کے خلیفہ وقت ہونے کی حیثیت سے کرتیں۔ کیونکہ وہ جانتی تھیں کہ خدا تعالیٰ خلیفہ وقت کی دعاؤں کو خاص طور پر شرف قبولیت بخشتا ہے۔ (حضرت سیدہ) مریم بڑی ہردلعزیز خاتون تھیں۔ (حضرت صاحبزادہ) ایم ایم احمد جو (حضرت مرزا) طاہر احمد کے حقیقی چچا زاد ہیں۔ اس ضمن میں کہتے ہیں :

> "وہ انتہائی مقبول اور ہردلعزیز خاتون تھیں۔ ہماری تو وہ واقعی محبوب چچی تھیں۔ ہم سب کے سب ان کے گرد گھیرا ڈال لیتے۔ وہ عمدہ بسکٹوں۔ خشک میوہ جات اور موسم کے مطابق تازہ پھلوں سے ہماری تواضع کرتی ہوئی نہ تھکتیں اور ساتھ مزے مزے کی گفتگو بھی جاری رہتی"۔

اوائل عمر میں جب (حضرت مرزا) طاہر احمد کے بچپن کے دن تھے۔ انہیں اپنے ہم عمر دوستوں کے ہمراہ قادیان کے نواح میں گھومنے پھرنے کا بہت شوق تھا۔ ان کے دوست صرف مسلمان بچے ہی نہیں ہوا کرتے تھے۔ پاس ہی ہمسایوں میں

ایک ہندو خاندان کی رہائش تھی جہاں طاہر میاں اور ان کے ہندو دوستوں نے مل کر لکڑی کے تختے جوڑ کر دونوں گھروں کے درمیان ایک نازک سا پل تعمیر کیا ہوا تھا جس پر سے گزر کر آنے جانے میں آسانی پیدا ہو گئی تھی۔ لطف یہ تھا کہ اس پل کے طفیل انہیں سامنے والے صدر دروازے سے ہو کر گزرنا بھی نہیں پڑتا تھا۔
ان دنوں قادیان میں کئی طرح کے دلچسپ اور قابل ذکر لوگ موجود تھے۔ اور جیسا کہ عموماً دیہات اور چھوٹے قصبوں میں ہوا کرتا ہے چھوٹے بچوں کی ان سب سے گاڑھی چھنتی تھی۔ ایک بڑھیا تھی جو دن رات دھاری دار پائجامہ پہنے رہتی تھی۔

ان میں قابل ذکر (حضرت) مولوی ظہور حسین (مرحوم) بھی تھے جو سوویت روس میں جانے والے پہلے احمدی مبلغ تھے۔ انہوں نے دو سال تک روس میں قید و بند کی صعوبتیں جھیلی تھیں۔ جہاں انہیں مار پیٹ کے علاوہ طرح طرح کی اذیتیں دی گئی تھیں جن کی وجہ سے ان کی پیٹھ پر اب تک زخموں کے نشان تھے۔ کمسن طاہر اور ان کے ساتھی کبھی کبھی اس بزرگ سے ملنے جاتے اور فرمائش کرتے کہ اپنی کمر کو ننگا کر کے دکھائیں۔ اور یہ بچے پھر ٹکٹکی باندھے ان کے زخموں کو غور سے تکتے رہتے۔ چپ چاپ اور خاموشی سے۔ اور دل ہی دل میں سوچا کرتے کہ کیا کبھی ان کے اندر بھی اتنا حوصلہ اور ہمت پیدا ہو گی کہ وہ اس قسم کی سزا کی تاب لا سکیں۔

خلیفہ وقت کے فرزند کی حیثیت سے صاحبزادہ طاہر احمد کو ایک ممتاز مقام حاصل تھا۔ لیکن یہ بڑا ہی نازک اور کٹھن مقام تھا۔ اور بسا اوقات تو اگر آپ کا بس چلتا تو وہ بخوشی یہ مقام اپنے ہم جماعت دوستوں کو تحفتاً پیش کر دیتے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ لوگ ان سے اور ان کے بارہ بھائیوں سے بہت احترام سے پیش

آتے تھے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان سے یہ توقع بھی کی جاتی تھی کہ وہ نہ صرف شائستگی، شرافت اور وقار کا قابل تقلید نمونہ پیش کریں بلکہ تعلیمی میدان میں بھی سب سے بڑھ چڑھ کر رہیں۔ ظاہر ہے کہ صاحبزادہ طاہر احمد کی چلبلی اور باںذاق طبیعت کے پیش نظران کے لئے ہر وقت کو وقار اور سنجیدگی کا مجسمہ بنے رہنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ اور جہاں تک سکول کی تعلیم کا تعلق ہے وہ اس میں اگر سب سے آگے نہیں تو سب سے پیچھے ضرور تھے۔ وہ خود بیان کرتے ہیں :

"میری والدہ محترمہ نے فرمایا۔ میں چاہتی ہوں کہ تم ڈاکٹر بنو لیکن میں بالکل ڈاکٹر نہیں بننا چاہتا تھا۔ اگرچہ ان کے احترام میں میں نے ڈاکٹر بننے کی کوشش ضرور کی اور ڈاکٹری کے مضامین میں داخلہ بھی لیا۔ لیکن شروع دن سے اس میدان میں کوئی خاص کامیابی حاصل نہ کر سکا۔ بلکہ اپنی کلاس میں تو میں کمزور ترین طالبعلم ہی ثابت ہوا۔ میں سمجھتا ہوں کہ میری شخصیت کی تشکیل میں رسمی تعلیم نے کوئی موثر کردار ادا نہیں کیا بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ کوئی کردار ادا کیا ہی نہیں۔

قصہ یہ تھا کہ اچھے مارکس حاصل کرنے کیلئے نہ تو میں کتابی کیڑا بن سکتا تھا اور نہ ہی صفحوں کے صفحے رٹ سکتا تھا۔ میں تو کتابوں میں سے بس یونہی ایک سرسری نظر ڈال کر گذر جایا کرتا تھا۔ میں مفہوم کو سمجھ ضرور لیتا تھا اور جانتا تھا کہ کیا کہا جا رہا ہے۔ یعنی مصنف کی بات مجھ تک پہنچ ضرور جاتی تھی اور اس طرح پوری کتاب کا باقی ماندہ حصہ سمجھنے میں کچھ آسانی بھی ہو جاتی تھی لیکن واقعہ یہی ہے کہ میں کبھی بھی معرکے کا

طالب علم نہیں رہا۔

مثال کے طور پر میری سائنسی تعلیم ہی کو لے لیجئے۔ جہاں تک روایتی امتحانات میں اعلیٰ کامیابی کا تعلق ہے مجھے اس طرف تو کوئی رغبت تھی ہی نہیں۔ ہاں یہ الگ بات ہے کہ سائنس سے متعارف ہونے کے بعد مجھ پر نئے سے نئے امکانات کے دروازے کھل گئے۔ میں سائنس کی غیر نصابی کتب کو بڑے ہی انہماک سے پڑھتا۔ علم کی ایک بھوک تھی جو چین سے بیٹھنے نہیں دیتی تھی۔ میں اپنے علم کے آفاق کو نہ صرف وسعت دینے کی کوشش میں لگا رہتا بلکہ اس کوشش سے لطف اندوز بھی ہوتا۔ لیکن اس علمی کاوش کو نصابی یا امتحانی علم کہنا مناسب نہیں ہوگا۔ یعنی ایسا علم جو صرف ڈگریوں اور ڈپلوموں تک محدود ہو کر رہ جائے۔ مجھے تو بس ایک ہی تڑپ اور لگن تھی کہ کسی نہ کسی طرح علم کی پیاس کو بجھاتا چلا جاؤں۔

امتحانات کا تو قصہ ہی اور تھا۔ یہ قواعد کا ایک نپا تلا روایتی نظام تھا۔ جس کے مطابق فیل ہونے والے کو پانچ اضافی مارکس دیکر رعایتی طور پر پاس کر دیا جاتا تھا۔ اگرچہ نتیجے کے ساتھ ساتھ اس رعایت کا اندراج بھی کر دیا جاتا تھا کہ متعلقہ طالب علم رعایتی طور پر پاس ہوا ہے۔ اس طرح کبھی کبھی مجھے بھی رعایتی پاس ہونے والوں میں جگہ مل جایا کرتی تھی۔ یہاں تک کہ اگر کبھی مجھے پانچ رعایتی مارکس سے زیادہ

کی ضرورت پڑ جاتی تو میں آسانی سے فیل بھی ہو سکتا تھا۔

مجھے خوب یاد ہے کہ جب میں نے پہلے پہل انگریزی کا امتحان دیا تو میں نے ایک سو پچاس میں سے صرف تین مارکس حاصل کئے۔ اگرچہ طالبعلم تو میں اچھا تھا نہیں۔ لیکن مجھے اس پر یہ افسوس ضرور ہوا کہ میں کیوں اپنی والدہ محترمہ کی توقعات پر پورا نہ اتر سکا۔ ظاہر ہے میرے اس نتیجے نے انہیں بہت صدمہ پہنچایا"۔

آپ کے چچازاد بھائی ایم۔ایم احمد کہتے ہیں :

"(حضرت) ام طاہر کی شدید خواہش تھی کہ ان کا بیٹا ہر میدان میں اول آئے۔ ان کی توقعات کا معیار بہت بلند تھا۔ انہیں جماعت احمدیہ اور اس کے مفاد سے ایک طرح کی والہانہ محبت تھی۔ اور اس تعلق کا قدم قدم پر اظہار ہوتا رہتا تھا۔

شروع شروع کی بات ہے جب ابھی آپ عمر کے ساتویں سال ہی میں تھے۔ اس وقت بھی ان پر (حضرت) ام طاہر کی امیدوں اور سوچ کی چھاپ صاف نظر آنے لگ گئی تھی۔ ان کی بہن امتہ القیوم بتاتی ہیں کہ جب ننھے طاہر سے پوچھا جاتا کہ آپ بڑے ہو کر کیا بنیں گے۔ تو بڑی سنجیدگی سے جواب دیتے: 'میں لوگوں کا گلہ بان بنوں گا'۔"

ظاہر ہے اس جواب میں بڑوں کی خواہشات کا عکس صاف نظر آ رہا ہے۔ لیکن بایں ہمہ اس سے یہ تاثر ہرگز نہیں لینا چاہئے کہ ننھے طاہر کی اپنی کوئی

شخصیت نہیں تھی یا وہ بڑوں کی توقعات کے زیر اثر موم کا ایک گول مٹول کھلونا بن کر رہ گئے تھے۔

چنانچہ صاحبزادی امتہ القیوم بتاتی ہیں :

"ہماری ایک خالہ ہوا کرتی تھیں۔ جنہیں سب سے الگ تنہائی میں عبادت کا بہت شوق تھا۔ ایک دفعہ یوں ہوا کہ جس کمرے میں وہ نوافل ادا کیا کرتی تھیں ننھا طاہر وہیں ایک پلنگ کے نیچے چھپ گیا۔ ادھر خالہ نے نماز شروع کی اور ادھر پلنگ کے نیچے سے دھیمی سسکیوں کی پُراسرار آوازیں آنے لگیں۔ ساتھ ہی کاغذ کی چڑ مڑ کی ہوئی ایک چھوٹی سی گیند بھی کھٹ سے آن گری۔

خالہ ان عجیب و غریب آوازوں سے اتنی پریشان ہوئیں کہ انہوں نے کسی اور کمرے میں جا کر نوافل ادا کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ لیکن پیشتر اس کے کہ وہ وہاں پہنچتیں۔ ننھا طاہر پہلے ہی وہاں پہنچ چکا تھا۔ وہ ایک اور دروازے اور برآمدے میں سے ہوتا ہوا پہلے ہی اپنی نئی کمین گاہ میں ان کے استقبال کے لئے منتظر بیٹھا تھا۔

اب ایک بار پھر انہی عجیب و غریب سسکیوں اور کاغذ کی گولیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اب تو خالہ اور بھی پریشان ہو گئیں اور فوراً ایک اور کمرے میں منتقل ہو گئیں۔ اس کمرے میں خالہ کے پہنچنے سے پہلے داخلہ ممکن نہ تھا۔ اس لئے ننھا طاہر رینگتا ہوا روشن دان تک جا پہنچا۔ اب سسکیوں

کی آوازیں اس روشن دان میں سے بھی آنے لگیں۔

اب تو خالہ بے حد پریشان ہوئیں۔ وہ گھر کے بڑے کمرے میں پہنچیں اور ہم سب بہنوں سے شکایت کی کہ سب کمروں پر بے چین ارواح نے قبضہ کر رکھا ہے۔ میں جس کمرے میں بھی جاتی ہوں۔ سسکیوں کی آوازیں سنائی دینے لگتی ہیں یہاں تک کہ میں اطمینان سے نوافل بھی ادا نہیں کر سکتی۔

بہنوں کو ننھے طاہر کی ان طفلانہ حرکات کا بخوبی اندازہ ہو چکا تھا چنانچہ انہوں نے آپ کو خوب ڈانٹا اور کہا کہ میاں اب بس کرو کافی مذاق ہو چکا۔ لیکن ننھے طاہر کی مزاح کی حس کو قابو میں رکھنا ان کے بس کی بات نہیں تھی چنانچہ اس قسم کے مذاق ایک بار نہیں بار بار ہوتے رہتے تھے"۔

آپ خود کہتے ہیں :

"بچپن میں مجھ میں تجسس اور استعجاب کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ میں دوسرے ہم عمروں کو کچھ کر گزرنے کا چیلنج اکثر دیا کرتا تھا اور یہ تو آئے دن کا مشغلہ تھا کہ کبھی کوئی دیوار پھلانگی جا رہی ہے کبھی کمروں میں چھلانگیں لگ رہی ہیں۔ غرضیکہ کون سی طفلانہ حرکت ہے جو نہ کی ہو۔ جب آم اور جامن پکنے پر آتے تو ہم میں سے ایک لڑکا درخت پر چڑھ کر پھل سے لدی ہوئی شاخیں ہلاتا۔ ہم جونہی گرے ہوئے پھل پکڑنے کیلئے جھپٹتے تو ہم کسی اور بچے کے اینٹ روڑوں کی زد

میں بھی آجاتے جو ہماری طرح اپنے طور پر مصروف عمل ہوتا۔ کم از کم میری تو کئی بار ایسے اینٹ روڑوں سے ملاقات ہوئی۔

جب بچوں کو جیب خرچ ملتا تو ہنگامے کی سی صورت پیدا ہو جاتی۔ شروع شروع میں جیب خرچ کی شرح ایک آنہ فی ہفتہ مقرر تھی۔ یہ رقم بے حد قلیل تھی۔ مجبوراً ہم سب جیب خرچ کو ایک جگہ اکٹھا کر لیتے اور اس رقم سے بھنی ہوئی مونگ پھلی یا بھنے ہوئے تِلوں والی کڑاکے دار ریوڑیاں خریدی جاتیں۔ اس اجتماعی سودے کی باقاعدہ تقسیم ہوتی اور ہم میں سے ہر ایک کو حصہ رسدی کچھ نہ کچھ مل ہی جاتا اور جو حصہ بچ جاتا اسے ہوا میں اچھال دیا جاتا اور ہم سب اس پر جھپٹ پڑتے۔ بڑا ہی مزا آتا!"

فرماتے ہیں :

"بچپن کی اس مار دھاڑ کے نشانات آج تک ٹانگوں پر موجود ہیں۔ مجھے سب سے خطرناک چوٹ اس وقت آئی جن دنوں ہمارے گھر کے پاس ہی ایک کنواں کھودا جا رہا تھا۔ میں کنواں کھودنے والے مزدوروں اور کارکنوں کو کام کرتے ہوئے دیکھتا۔ وہ رسے کی مدد سے جھولا جھولتے ہوئے اپنے پاؤں سے کنویں کی دیوار کا سہارا لیتے ہوئے کنویں میں اتر جاتے۔ میں اس نظارے کو دیکھ کر حیرت میں آجاتا۔ ایک دن یوں ہوا کہ جب سب لوگ چلے گئے اور کوئی دیکھنے والا نہ رہا تو

میں نے چھلانگ لگا کر رسے کو پکڑ لیا اور کنواں کھودنے والے مزدوروں کی طرح نیچے اترنے کیلئے کنویں کی دیوار کا سہارا ڈھونڈنا شروع کر دیا۔ لیکن میری ٹانگیں تو بہت ہی چھوٹی تھیں وہ کنویں کی دیوار تک کیسے پہنچتیں؟ نتیجہ ظاہر ہے میں بڑی تیزی سے نیچے گھسٹتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ اپنی رفتار کو قابو میں رکھنا میرے بس کا روگ نہ رہا۔ رسے کی رگڑ سے میری دونوں ہتھیلیوں کی کھال اتر گئی۔ اور درد بھی اس قدر شدید ہوا کہ خدا کی پناہ!

میں نہیں چاہتا تھا کہ میری اس حرکت کی کسی کو خبر ہو اس لئے میں کنویں میں سے جلد سے جلد باہر نکلنا چاہتا تھا۔ مجھے بخوبی علم تھا کہ اگر مجھے غیر حاضر پا کر میری تلاش شروع ہو گئی اور مجھے کنویں کے اندر سے ڈھونڈ نکالا گیا تو میرے ساتھ کیا گزرے گی۔

مزدور تو رسہ پکڑ کر دیوار سے پاؤں کی ٹیک لگا کر آسانی سے باہر نکل آتے تھے لیکن میرے لئے یہ ممکن نہ تھا۔ خوش قسمتی سے انہوں نے کنویں کی دیوار کے ساتھ ساتھ پاؤں جمانے کیلئے چھوٹے چھوٹے سوراخ کر دیئے ہوئے تھے۔ چنانچہ رسے کا سہارا لیتے ہوئے ان گڑھوں میں پاؤں جما کر میں کسی نہ کسی طرح کنویں سے باہر نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ شکر ہے جب میں کنویں سے باہر نکلا تو وہاں مجھے کوئی دیکھنے والا نہیں تھا۔ لہٰذا میری اس حرکت کی کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی

یہاں سے میں نے سیدھا اپنے خاندانی ڈاکٹر کا رخ کیا۔ وہ میرے ہاتھوں کی حالت دیکھ کر سناٹے میں آگئے۔ ان کا اصرار تھا کہ ہاتھوں کی مرہم پٹی لازماً کی جانی چاہیے لیکن میں نے ڈاکٹر صاحب کو کسی نہ کسی طرح قائل کر ہی لیا۔ کہ صرف مرہم ہی کافی رہے گا۔ اگرچہ ہاتھوں کے ان زخموں کو والدہ محترمہ سے چھپانا ایک ناممکن سی بات تھی لیکن میں اس ناممکن کو ممکن بنانے میں بھی کامیاب ہو گیا۔

امی بچوں سے بے جا لاڈ پیار کی قائل نہیں تھیں خواہ بچے بیمار ہی کیوں نہ ہوں۔ ان کا عقیدہ تھا کہ بے جا لاڈ پیار بچوں کی شخصیت کو تباہ کر دیتا ہے۔

مجھے ملیریا بخار ہوتا جو ان دنوں ایک عام سی بات تھی تو میں اس بخار کی پروا نہ کرتا۔ بات بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ قادیان میں ہر بچہ تین تین چار چار مرتبہ ملیریا بخار کا شکار ضرور ہوا کرتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں بیمار پڑتا تو کبھی کسی سے نہ کہتا کہ میری طبیعت خراب ہو رہی ہے۔ مجھے ڈاکٹر کے پاس لے چلو۔ کئی مرتبہ تو ایسا بھی ہوا کہ میں بخار کی شدت کے باعث بے ہوش ہو جاتا تو مجھے اٹھا کر گھر پہنچا دیا جاتا۔ ان دنوں یہ ایک خاص انداز فکر تھا جو ہمارے اندر کوٹ کوٹ کر بھر دیا گیا تھا یعنی یہ کہ ہمیں اوروں سے مدد مانگ کر انہیں بلاوجہ تکلیف دینے سے احتراز کرنا چاہیے"۔

بچپن میں آپ گھڑ سواری کرتے ہوئے کئی دفعہ گرے اور چوٹیں بھی

آئیں۔ تاہم آپ ایک بہت اچھے سوار ثابت ہوئے۔ ایک ریٹائرڈ فوجی نے جو رسالے میں ملازم رہے تھے آپ کو پہلا اور آخری سبق اس سلسلے میں یہ دیا کہ "اپنے گھٹنوں کو گھوڑے کے جسم سے اس طرح زور سے پیوست کردو کہ چھوٹا سا سکہ بھی اگر درمیان میں رکھ دیں تو پھسلنے نہ پائے"۔

فرماتے ہیں :

"کام تو یہ مشکل تھا۔ لیکن میرے لئے یہ ایک طرح کی فطرت ثانیہ بن گیا۔ میں گھٹنوں کے بل گھوڑے کی کمر سے چسپاں ہو کر رہ جاتا۔ مجھے یاد نہیں کہ میں نے کب گھڑسواری شروع کی۔ گھڑسواری تو ان دنوں روزانہ کا معمول تھا۔ ایک دفعہ میں ایک نہایت عمدہ گھوڑی پر سوار تھا جو ٹریفک اور کثرت آمدورفت سے قطعاً نامانوس تھی۔ میں سادگی میں اسے سڑک پر لے گیا۔ جونہی ایک بس آئی گھوڑی خوف کے مارے بدک گئی اور دھڑام سے گر گئی۔ خوش قسمتی سے میں بس کے نیچے آنے سے تو بچ گیا لیکن اس حادثے کی یاد کے طور پر ایک نشان آج تک میرے بدن پر موجود ہے۔

ہمارا سارا خاندان کھیل کا شوقین تھا۔ ہاکی 'فٹ بال' کرکٹ اور ٹینس وہ کھیل تھے جو خصوصیت سے کھیلے جاتے تھے۔ کچھ کھیل ایسے بھی تھے جو برصغیر کے اس حصے میں جہاں ہم رہ رہے تھے بہت مقبول تھے مثال کے طور پر کبڈی کا کھیل۔ جو کُشتی ہی کی ایک شکل ہے۔ اس میں دو ٹیمیں ایک دوسرے کو چُھونے کی کوشش کرتی ہیں۔ اور یہ کوشش بھی

کہ پکڑی نہ جائیں۔ ایک اور کھیل بھی تھا جسے ایک طرح کا
دیہاتی بیس بال کہا جا سکتا ہے"۔

اگرچہ امتحانات میں آپ نے کوئی کارہائے نمایاں سرانجام نہیں دیئے لیکن آپ کے اساتذہ آپ کا بڑی محبت سے تذکرہ کیا کرتے ہیں اور اس زمانے کی خوشگوار یادوں کے ذکر سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ ایک دفعہ ان کے والد محترم نے صاحبزادہ طاہر احمد اور ان کے بھائی انور احمد کے لئے تعطیلات کے دوران خاص ٹیوشن کا بندوبست کیا کیونکہ دونوں بھائی اپنے ہم جماعت طالب علموں سے بہت پیچھے رہ گئے تھے۔ دونوں تعلیم الاسلام ہائی سکول قادیان کے طالبعلم تھے۔ اگرچہ ایک قدیم اور معزز خاندان کے افراد ہونے کی حیثیت سے انہیں یہ حق حاصل تھا کہ وہ چیفس کالج ایسے مشہور و معروف سکول میں داخل ہوتے جسے برطانوی حکومت نے بڑے بڑے زمیندار اور رؤسا کے بچوں کی تعلیم و تدریس کیلئے جاری کیا ہوا تھا تاکہ یہ بچے فارغ التحصیل ہو کر مستقبل قریب میں ہندوستان کی حکومتی ذمہ داریاں سنبھال سکیں۔ لیکن آپ کے والد (حضرت) خلیفۃ المسیح الثانی (رضی اللہ عنہ) اس قسم کی طبقاتی تفریق کے سخت مخالف تھے۔

چنانچہ (حضرت) مرزا طاہر احمد فرماتے ہیں:

"قادیان کے سکول میں ہر خاص و عام کو داخلے کی اجازت تھی اور داخلے کیلئے احمدی ہونا بھی ضروری نہیں تھا۔ یہ ایک ایسا اصول ہے جسے ہم نے سختی سے اپنا لیا ہے۔ حتیٰ کہ افریقہ اور دوسرے ممالک میں بھی جہاں جہاں ہم نے سکول جاری کئے ہیں وہاں بھی اس اصول کی لازمی طور پر پابندی کی جاتی ہے"۔

موسم گرما میں قادیان میں شدید گرمی پڑتی ہے۔ طاہر اور انور اپنے ٹیوٹر کے ہمراہ شدت گرما سے بچنے کیلئے ڈلہوزی چلے جاتے۔ ان کے ٹیوٹر آج تک ان خوشگوار لمحات کا مزے لے لے کر ذکر کرتے ہیں :

"ہم لوگ اشیائے خوردنی کی خرید کیلئے ڈلہوزی کے بازار کا چکر لگایا کرتے تھے۔ (حضرت) خلیفۃ المسیح (رضی اللہ عنہ) یعنی ان کے اباجان کھانے اور دیگر ضروریات کیلئے اتنی محدود اور نپی تلی رقم دیتے جو کھانے کے اخراجات کیلئے بمشکل کفایت کرتی۔ اس لئے دونوں صاحبزادگان کو سودا سلف خریدتے وقت بڑی احتیاط اور جزرسی سے کام لینا پڑتا۔ لیکن کفایت کے اس عمل میں بھی دلچسپی کے کئی پہلو پیدا ہو جایا کرتے تھے۔ ایک دفعہ جب ضرورت کا سامان خریدا جا چکا تو چند پیسے بچ گئے (صاحبزادہ) طاہر احمد نے پوچھا کہ ان پیسوں سے کیا خریدا جائے؟ ٹیوٹر صاحب نے مشورہ دیا کہ کیوں نہ وہ بانسری خرید لی جائے جس کی طرف آپ اکثر للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا کرتے ہیں؟ اس بانسری کا قصہ بھی بہت دلچسپ ہے۔ یہ ایک معمولی قسم کی بانسری تھی۔ اگرچہ اس کی قیمت تو چند پیسوں سے زیادہ نہ تھی لیکن اب تک وہ اتنے پیسے نہیں بچا پائے تھے جن سے یہ بانسری خریدی جا سکتی۔

چنانچہ یہ بانسری خریدی گئی۔ اب کیا تھا فارغ وقت میں طاہر میاں تھے اور بانسری۔ ڈلہوزی میں صرف پڑھنے لکھنے ہی میں وقت نہیں گزرتا تھا۔ ان کے ٹیوٹر بتاتے ہیں کہ ہم لوگ لطائف سے بھی خوب لطف اندوز ہوتے تھے۔ اور شام کے وقت تو ہم انواع واقسام کے تفریحی اور دل لگی کے پروگرام ترتیب دیا کرتے تھے اور کبھی کبھی (حضرت) خلیفۃ المسیح الثانی (رضی اللہ عنہ) کی اپنے بیٹوں کے بارے میں لکھی گئی ایک نظم میں مزاحیہ تصرفات سے بھی دل بہلایا کرتے تھے۔ چنانچہ آپ نے اپنے سب سے چھوٹے اور تیرہویں بھائی کے متعلق جنکا مختصر نام پھیقی یعنی

(صاحبزادہ مرزا) رفیق احمد تھا۔ لکھا :

"بھائیوں کی پوری ایک درجن کھیپ کے بعد "بھیقی" کی تشریف آوری کی ضرورت ہی کیا تھی"

کبھی کبھار ہم عمر بھائیوں میں برادرانہ چشمک کا رنگ بھی پیدا ہو جاتا۔ ایک مرتبہ طاہر احمد اور انور احمد دونوں صاحبزادگان نے پروگرام بنایا کہ ڈلہوزی کے قریب واقع ایک جھیل پر پکنک منائی جائے۔ دونوں نے اپنے ٹیوٹر کو کسی نہ کسی طرح اس بات پر بھی آمادہ کرلیا۔ کہ وہ (حضرت) خلیفۃ المسیح الثانی (رضی اللہ عنہ) سے اس کی اجازت لینے کی کوشش کریں۔ دونوں کا اصرار تھا کہ اس پروگرام کی کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے پائے۔ لیکن جیسا کہ اس عمر میں ہوتا ہے۔ حسب توقع یہ راز فاش ہوگیا۔ اب کیا تھا باقی بھائی بھی ایک ایک کر کے ابا حضور کی خدمت میں ٹرپ پر جانے کی اجازت لینے کیلئے پہنچنے شروع ہو گئے۔ اس پر تو یہ دونوں بھائی بہت سٹ پٹائے ان کو گلہ یہ تھا کہ پروگرام ان کا تھا اور اس پر قبضہ دوسروں نے جمالیا۔ جب ان دونوں نے زیادہ ہی احتجاج کیا تو (حضرت) خلیفۃ المسیح الثانی (رضی اللہ عنہ) نے فیصلہ فرمایا کہ "سوائے تم دو کے باقی سب کو جھیل پر سیر کیلئے جانے کی اجازت ہے"۔

اس پر ان کے ٹیوٹر نے انہیں مشورہ دیا کہ اپنی غلطی تسلیم کرلو اور فوراً معافی مانگ لو کہ ہم سے غلطی ہو گئی باقی بھائیوں کا بھی حق ہے کہ وہ بھی اس ٹرپ میں شامل ہوں چنانچہ بڑے جوش و خروش سے معافی مانگی گئی اور ظاہر ہے کہ معافی مل بھی گئی۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہ تفریحی سفر بہت کامیاب اور پُر لطف رہا۔ طاہر اور انور کا شروع شروع میں ارادہ تو یہ تھا کہ گرمیوں کی تعطیلات میں سارا وقت پڑھنے لکھنے ہی میں نہ گزارا جائے۔ اکثر یوں ہوتا کہ دوپہر کے وقت گھنٹوں

سوئے رہتے۔ جب حضور کو اس کا علم ہوا تو وہ سخت خفا ہوئے۔ اور ان کے ٹیوٹر سے فرمایا کہ میں نے بچوں کو ان کی عادات خراب کرنے کیلئے آپ کی نگرانی میں نہیں دیا تھا بلکہ مقصد تو یہ تھا کہ آپ ان کی تعلیم و تربیت کا بھی خیال رکھیں۔

ٹیوٹر نے ادب سے عرض کی کہ اگر دوپہر کے وقت ایک بجے سے چار بجے تک سونے کی اجازت دے دی جائے تو مناسب ہو گا (گرمی کے دنوں میں اتنا لمبا قیلولہ کوئی غیر معمولی بات نہ تھی) آپ نے فرمایا۔ آرام کیلئے صرف ایک گھنٹہ کافی ہے۔ اب ان دونوں ننھے بھائیوں کے لئے چوبیس گھنٹوں کا ٹائم ٹیبل تجویز ہوا اور حکم ہوا کہ اس ٹائم ٹیبل کی سختی سے پابندی کی جائے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ حسب ارشاد دوپہر کے وقت آرام کے لئے صرف ایک گھنٹے کی اجازت دی گئی۔

یہی ٹیوٹر اپنی خوشگوار یادوں کو آج تک بڑے مزے لے لے کر بیان کرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں: "ننھا طاہر اس عمر میں بھی بڑی توجہ سے قرآن (کریم) کی تلاوت کرتا اور دیکھنے والے کو صاف محسوس ہوتا کہ تلاوت کرتے وقت اسے دلی خوشی اور لذت محسوس ہو رہی ہے۔ ایسی خوشی کہ دیکھنے والا بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

اگرچہ ننھا طاہر ایک کم سن بچہ تھا لیکن اس وقت بھی یوں لگتا تھا کہ اگر یہ بچہ دعا کرے تو دعا ضرور قبول ہو گی۔

اس کم سنی میں دونوں بھائیوں نے باہم معاہدہ کیا کہ ہم ایک دوسرے کو دعاؤں میں یاد رکھیں گے۔

☆ ☆ ☆

4

ایثار و قربانی

۱۹۳۷ء میں جب صاحبزادہ طاہر احمد اپنی عمر کی نو منزلیں طے کر چکے تھے۔ اور پھر ۱۹۴۴ء میں جب ان کی عمر سولہ سال کی ہو چکی تھی جماعت احمدیہ کی تاریخ میں یکے بعد دیگرے کچھ ایسے واقعات وقوع پذیر ہوئے جن سے ان کی زندگی پر بہت گہرے اور دیرپا اثرات مرتب ہوئے۔

۱۹۳۴ء میں ایک جماعت دشمن تنظیم نے قادیان کے قرب و جوار میں ایک بہت بڑے جلسے کا اعلان کیا۔ اس جلسے کے منتظمین نے بڑے وثوق اور تحدی سے ڈنکے کی چوٹ پر اعلان کیا کہ جلسے کے بعد جماعت کا صفحہ ہستی سے نام و نشان تک مٹا دیا جائے گا۔ اخبارات میں جماعت کے خلاف اشتعال انگیز پراپیگنڈے کی ایک وسیع مہم چلائی گئی۔ بہت گند اچھالا گیا اور جسمانی تشدد کی دھمکیاں دی گئیں۔ بہت شور اٹھا لیکن خیر گزری۔ بالآخر جماعت محفوظ رہی۔ پھر بھی اس بے بنیاد پراپیگنڈے کے نتیجے میں اور کچھ جہالت اور عدم علم کے باعث عام طبائع میں

اشتعال بھی بہت پیدا ہوا۔ اس تناظر میں صورت حال اس امر کی متقاضی تھی کہ جماعت کے عقاید اور موقف کو واضح اور معین الفاظ میں کھل کر دنیا کے سامنے پیش کیا جائے تا کہ غلط فہمی کی کوئی گنجائش نہ رہے۔ علاوہ ازیں جماعت کی تبلیغی سرگرمیوں کی رفتار کو تیز تر کرنے کے لئے بجائے خود ایسے رضا کاروں کی ضرورت بھی تھی جو اپنے مال اور جان کی قربانی دے کر اس جماعتی ضرورت کو پورا کر سکیں۔ چنانچہ (حضرت) خلیفہ ثانی (رضی اللہ عنہ) نے بالآخر وہ تاریخ ساز اعلان کیا۔ جسے "تحریک جدید" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ابتداً یہ تحریک صرف تین سال کے لئے تھی۔ اس تحریک کے ضمن میں آپ نے جماعت سے انیس مطالبات کئے۔

چوہدری محمد ظفر اللہ خاں جو (حضرت) مسیح موعود (علیہ السلام) کے صحابی تھے جو بعد میں پاکستان کے وزیر خارجہ۔ مجلس اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے صدر اور عالمی عدالت انصاف کے صدر بھی مقرر ہوئے ان مطالبات کے متعلق کہتے ہیں:

> "بنیادی مقصد ان مطالبات کا یہ تھا کہ جماعت میں قربانی کی روح کو ابھارا جائے۔ اخلاقی اور روحانی قدروں کے حصول کی مساعی کو تیز تر کیا جائے اور جماعت کے پیغام کی وسیع تر بنیادوں پر نشر و اشاعت کی جائے۔
>
> مثال کے طور پر (حضرت) خلیفہ ثانی (رضی اللہ عنہ) نے مطالبہ کیا کہ کھانے۔ لباس۔ رہائش اور دیگر امور میں نمود و نمائش اور اسراف سے اجتناب کیا جائے۔ انتہائی سادگی کو اپنایا جائے۔ چنانچہ سینما۔ تھیٹر۔ سرکس اور دیگر کھیل تماشوں وغیرہ پر پابندی لگادی گئی۔

آپ نے یہ مطالبہ بھی کیا کہ افراد جماعت محنت ‘مشقت
اور ہاتھ سے کام کرنے کی عادت ڈالیں۔ علاوہ ازیں یہ اپیل
بھی فرمائی کہ کچھ لوگ اپنی زندگیاں خدمت دین کے لئے
وقف کریں۔ آپ نے مطالبہ کیا کہ فارغ لوگ جماعتی کاموں
کے لئے آگے آئیں اور سلسلے کے کاموں کے لئے اپنی بلا
معاوضہ خدمات پیش کریں یا تنخواہ کی بجائے معمولی الاؤنس
پر اکتفا کریں۔ آپ نے ہر احمدی سے مطالبہ کیا کہ وہ اپنا زیادہ
تر وقت خدا تعالیٰ کے حضور دعائیں کرنے میں گزارے۔
خدا تعالیٰ ہی کو مدد کے لئے پکارے۔ اسی سے راہنمائی چاہے
اور اسی سے استقامت کی بھیک مانگے”۔

ایک خطبہ جمعہ کے موقع پر تحریک جدید کی تفصیل بیان کرتے ہوئے فرمایا :

”ہم وہ تمام فرائض جو خدا تعالیٰ اور (حضرت) محمد
(رسول اللہ ﷺ) کی طرف سے عائد کئے گئے ہیں پورے
کریں گے اور چین سے نہیں بیٹھیں گے جب تک تحریک
جدید کے جملہ مقاصد کو حاصل نہ کرلیں۔ خدا تعالیٰ نے چاہا تو
جماعت کی روحانی کشتی کو اس کا کپتان خوفناک چٹانوں سے
بچتے بچاتے اسے صحیح سلامت بندرگاہ کے محفوظ پانیوں تک
پہنچانے میں انشاء اللہ تعالیٰ ضرور کامیاب ہو جائے گا“

چوہدری محمد ظفر اللہ خان بتاتے ہیں کہ تحریک جدید کے اعلان کے ساتھ
جماعت بھر میں زندگی کی ایک برقی لہر دوڑ گئی اور جماعت ایک نئے عہد آفریں دور
میں داخل ہو گئی۔

اس اپیل پر لبیک کہتے ہوئے بہت سے لوگوں نے رضاکارانہ طور پر اپنے نام پیش کر دیئے۔ انہیں مختلف شعبوں میں کام کرنے کی تربیت دی گئی۔ جماعت کی تعلیمات۔ عقائد اور اغراض و مقاصد سے متعلق لٹریچر کی تیاری اور اس کی طباعت اور اشاعت کا کام وسیع پیمانے پر شروع ہو گیا۔۔۔ غرضیکہ جماعتی کاموں میں ایک نیا جوش و جذبہ اور ایک نئی روح جاری و ساری نظر آنے لگی۔

آغاز کار میں تو یہ تحریک طوعی اور رضاکارانہ تھی۔ لیکن ۱۹۳۷ء ہی میں ایک اور خطبے میں (حضرت) خلیفہ ثانی (رضی اللہ عنہ) نے اعلان کیا کہ اب یہ تحریک لازمی قرار دی جاتی ہے اور اب یہ باقی دنیا میں تبلیغ اسلام کے ہراول دستے کے طور پر کام کرے گی۔ آسمان پر خدا نے ارادہ کیا ہے کہ جماعت آگے بڑھے اور کامیابی کی منازل سے ہم کنار ہوتی چلی جائے۔

پہلے کی طرح اب بھی ساری راہنمائی اور ہدایت کا منبع اور ماخذ قرآن (کریم) تھا یا بانی اسلام (حضرت) محمد (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کی ذات بابرکات تھی۔ نیز ان کے نائب اور غلام اور عاشق زار (حضرت) مسیح موعود (علیہ السلام) کا زندگی بخش نمونہ تھا جو آپ نے اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے اس دور میں اپنے آقا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کی متابعت میں پیش کیا تھا۔ آپ کے جانشین خلیفہ وقت اور ساری جماعت احمدیہ نے یہ عہد کیا تھا اور اس عہد کی تجدید کی تھی کہ اس ہدایت اور روشنی کو دنیا کے کونے کونے تک پھیلا کر رہیں گے۔ اس اعلان نے بجلی کا سا کام کیا۔ ہزاروں احمدیوں نے بے دریغ اپنی زندگیاں خدا کے نام پر وقف کے لئے پیش کر دیں۔ صاحبزادہ طاہر احمد بھی انہی واقفین میں سے ایک تھے۔ آپ کی عمر اس وقت نو سال کی تھی۔ طفولیت کے اس زمانے میں بھی وہ اپنے والد بزرگوار کے خطبات کو ایک حد تک سمجھنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ وہ اپنے ارد گرد بسنے والے احمدیوں کے جوش و جذبہ

سے بھی یقیناً متاثر ہوئے ہونگے۔ جس کا اظہار بڑھ چڑھ کر ساری جماعت کی طرف سے ہو رہا تھا۔

فرماتے ہیں :

"میں ابھی بچہ ہی تھا جب تحریک جدید کا اعلان ہوا۔ لیکن (حضرت) خلیفہ ثانی (رضی اللہ عنہ) کے خطبے نے جوش اور قربانی کا جو طوفان جماعت کے دلوں میں پیدا کیا وہ اتنا شدید تھا کہ اسے میری عمر کے بچے بھی محسوس کر رہے تھے اور جسے وہ کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔ میں اس خطبے کے موقع پر مسجد میں موجود تھا۔ ہم سب پر ایک محویت کی کیفیت طاری تھی۔ عجیب ربودگی کا عالم تھا جس کا نظارہ اب تک میرے ذہن پر نقش ہے۔ یہ کیفیت خطبے کے بعد بھی قائم رہی۔ جدھر جاؤ ہر طرف خطبے ہی کی باتیں ہو رہی تھیں۔ وارفتگی کی ایک عجیب لذت تھی ایک عجیب نشہ تھا۔ ایک دھن تھی۔ ہر شخص چاہتا تھا کہ وہ اپنی زندگی اور اپنے اوقات خدمت اسلام کے لئے وقف کر دے۔

مجھے خوب یاد ہے کہ میری والدہ محترمہ نے مجھے اور میری بہنوں کو بلایا اور فرمایا کہ تم اپنے اپنے جیب خرچ میں سے تحریک جدید کا چندہ ادا کیا کرو۔ ہم نے وعدہ کیا کہ ہم پانچ یا دس روپے فی کس چندہ ادا کیا کریں گے۔ اگرچہ میرے لئے تو یہ بات ہرگز ممکن نہ تھی کہ میں یہ چندہ ادا کر سکتا۔ میرا سال بھر کا جیب خرچ پانچ روپے سالانہ سے بھی کم تھا۔ ان دنوں

مجھے ایک آنہ ہفتہ وار جیب خرچ ملا کرتا تھا' آجکل کے حساب سے یہ ایک پاؤنڈ کا 1/640 حصہ بنتا ہے۔ خاص خاص مواقع پر کبھی کبھی ہمیں ایک سالم روپیہ بھی بطور تحفے کے مل جایا کرتا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ جیب خرچ دیتے وقت یہ روپیہ بھی محسوب کر لیا جاتا تھا۔

والدہ محترمہ نے خود ہی ہمیں اس مشکل سے نکال بھی لیا یعنی آپ نے ہمارا جیب خرچ بڑھا دیا تاکہ ہم وعدے کے مطابق پانچ یا دس روپے کی رقم تحریک جدید کے چندے کے طور پر ادا کر سکیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ والدہ محترمہ نے جو عظیم احسانات ہم پر کئے ان میں سے ایک احسان یہ بھی ہے کہ انہوں نے ہمیں اپنے پاس سے کچھ دینے کے عمل اور اس کی لذت سے روشناس کرادیا اور قربانی کے اس عمل میں شرکت کا موقع بہم پہنچایا۔ بچپن کے اس تجربے ہی کی برکت تھی کہ ہمارے اندر قربانی اور ایثار کا جذبہ پیدا ہو گیا اور ذرا بڑے ہوئے تو ہمارے اندر ایثار اور قربانی کی یہ صلاحیت پروان چڑھ چکی تھی اور ہم انشراح صدر اور دلی خوشی کے ساتھ قربانی کے لئے اپنے آپ کو آمادہ پاتے تھے"۔

(حضرت) خلیفہ ثانی (رضی اللہ عنہ) کے خطبے پر جماعت احمدیہ نے اس والہانہ انداز سے لبیک کہا اور اتنے خطوط آئے کہ دفتر خلافت سے صاحبزادہ طاہر احمد کو اپنے خط کا جواب 18 ماہ کے لمبے انتظار کے بعد جا کر ملا۔ دفتر نے بتایا کہ ان کی درخواست نوٹ کر لی گئی ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کے حضور اپنی زندگی وقف کرنا چاہتے ہیں۔ وقت

آنے پر (حضرت) خلیفہ ثانی رضی اللہ عنہ) انہیں بلا بھیجیں گے اور ان سے استدعا کی گئی کہ وہ مشمولہ فارم کو پر کرنے کے بعد اسے دفتر میں جمع کروادیں۔

فرماتے ہیں :

"میں اس انقلاب کو کیسے بھول سکتا ہوں جو اس ایک خطبے سے ہمارے اندر برپا ہوا۔ میرا خیال ہے کہ اس ایک خطبے کی وجہ سے بہتوں کا زندگی کے متعلق نقطہ نظر یکسر تبدیل ہو کر رہ گیا۔ ہمارے اندر وسعت قلبی پیدا ہوئی۔ محنت اور مشقت کی عادت پڑی اور ہم اس یقین پر قائم ہو گئے کہ اپنے ہاتھ سے کام کرنے میں کسی قسم کا عار محسوس نہیں کرنا چاہئے۔

ہم نے رضاکارانہ طور پر اپنے ہاتھ سے شجر کاری بھی کی اگرچہ ہماری اس قسم کی طفلانہ کاوشیں ہمیشہ خراج تحسین پر منتج نہیں ہوا کرتی تھیں۔ ہم گلی کوچوں اور نالیوں کی صفائی کرتے اور جلسہ سالانہ کے موقع پر جمع ہونے والے کوڑے کرکٹ کے ڈھیر اٹھا اٹھا کر زمین کو ہموار کیا کرتے تھے"۔

(حضرت) خلیفہ ثانی (رضی اللہ عنہ) کا طریق کار تھا کہ جو مطالبہ بھی آپ افراد جماعت سے فرماتے اس میں اپنے سب بچوں کو بھی شریک فرمالیا کرتے تھے۔ اس میں چھوٹے بڑے کی تمیز نہ تھی نہ ہی رشتے کا کوئی لحاظ تھا۔ اگر ہم سے کوئی کوتاہی سرزد ہوتی تو ہم سے جو نسبتاً بڑی عمر کے ہوتے وہ ہمیں سزا بھی دے لیا کرتے تھے اور کبھی کبھار چانٹے سے بھی ہماری مرمت ہو جایا کرتی تھی اور میں تو اس قسم کی سزا کا کئی بار مزا چکھ چکا تھا۔

کبھی کبھی یوں بھی ہوتا کہ مثلاً آپ مٹی اٹھا رہے ہیں یا اس قسم کا وقار عمل کر رہے ہیں۔ اگر آپ قطار سے ذرا بھی ادھر ادھر ہوئے یا آپ کی ہنسی نکل گئی تو بس اللہ دے اور بندہ لے۔ فوراً آپ کی کمر یا گدی ایک فرمائشی قسم کے طمانچے سے سہلا دی جاتی تھی اور یہ خدمت صرف نگران ہی کے سپرد نہیں تھی بلکہ یہ کارنامہ کوئی بھی سرانجام دے سکتا تھا۔ جو بچے کام کر رہے ہوتے تھے ان میں کسی قسم کی تمیز روا نہیں رکھی جاتی تھی سب کے ساتھ یکساں اور مساوی سلوک کیا جاتا تھا"۔

ذرا بڑے ہوئے تو (صاحبزادہ) طاہر احمد نے موسیقی اور سینما کے بارے میں اپنے والد محترم کا نقطہ نظر بیان کرتے ہوئے فرمایا :

"(حضرت) ابا جان (رحمہ اللہ) اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ اس قسم کے مشاغل لہو و لعب میں شامل تھے اور وہ ذہنوں میں ایک قسم کی سہل انگاری' بے راہ روی اور قانون سے عدم احترام کے رجحانات کی حوصلہ افزائی کے ذمہ دار تھے۔ لوگ حدود سے تجاوز کرنے اور ناواجب تعلقات کی برداشت کے عادی ہو جاتے ہیں۔ اور بالآخر نوبت یہاں تک پہنچ جاتی ہے کہ مصنوعی چکا چوند اور رنگ و روغن پر فریفتگی ان کا اوڑھنا بچھونا بن جاتی ہے۔ حتیٰ کہ غرباء بھی جو امراء کی سی معیاری عیاشی کی سکت نہیں رکھتے۔ بری طرح اس رو میں بہہ جاتے ہیں۔ بے راہ روی کا مزا چکھنے کے بعد اصل مسرت ان سے

ہمیشہ کے لئے چھن جاتی ہے۔ اطمینان مفقود ہو جاتا ہے اور نشہ کرنے والے ایک عادی مریض کی طرح ان کی تسلی ہی نہیں ہوتی۔ جب تک وہ عیاشی میں آگے سے آگے بڑھتے چلے نہ جائیں"۔

سینما دیکھنے پر پابندی کے متعلق فرماتے ہیں:

"میں عمر کی جس منزل میں تھا ظاہر ہے کہ اس میں سینما دیکھنے کو جی تو چاہتا ہے لیکن چونکہ سینما بینی کی ممانعت تھی اس لئے ہم لوگ کبھی سینما دیکھنے نہیں گئے"۔

پھر سوچ کر بولے :

"مجھے یاد آیا، ابتداً ہم ایک بار اپنے ابا جان کے ہمراہ چارلی چپلن کی ایک فلم بھی دیکھنے گئے تھے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سینما کے متعلق ان کا فیصلہ کوئی مذہبی فیصلہ نہیں تھا۔ بلکہ وقتی حالات اور تقاضوں کی بنا پر یہ فیصلہ کیا گیا تھا۔ اور اس کے محرکات خالصتاً مذہبی نہیں تھے۔

مذہب اسلام میں تو بڑی صحیح قسم کی لچک ہے۔ یہ تو صرف اصولی ہدایات دیتا ہے اور باقی آپ کی سمجھ بوجھ اور صوابدید پر چھوڑ دیتا ہے۔ (حضرت) خلیفہ ثانی (رضی اللہ عنہ) کو بعض نئے رجحانات پسند نہیں تھے۔

انہیں یہ فکر تھی کہ کہیں جماعت کی نئی نسل ان رجحانات میں گم ہو کر نہ رہ جائے اور اس طرح اپنی سنجیدگی اور وقار کی اس متاع عزیز سے ہاتھ نہ دھو بیٹھے جو مذہبی اور

روحانی فرائض کی ادائیگی کے لئے ضروری ہوا کرتی ہے۔

اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ من جملہ اور وجوہات کے یہی ایک خاص وجہ تھی جس سے مجبور ہو کر انہوں نے جماعت سے اپیل کی تھی کہ اس قسم کے مشاغل سے اجتناب کریں۔

یقیناً کفایت شعاری کی ضرورت بھی اس کا دوسرا سبب بنی ہوگی' اپنے متعدد خطبات میں انہوں نے اپنے اس فیصلے کے عوامل کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ ہم ایک غریب جماعت ہیں۔ ہمیں ایک عظیم مہم درپیش ہے۔ اس لئے لامحالہ ہمیں اپنی ذاتی دلچسپیوں اور اخراجات کو محدود کرنا پڑے گا تاکہ اس طرح سے جو رقم ہم پس انداز کریں اسے خدمت اسلام پر خرچ کیا جاسکے ۔

(حضرت) خلیفہ ثانی (رضی اللہ عنہ) کے اپنے گھر میں انتہائی کفایت شعاری کا ماحول تھا۔ ان کا اصرار تھا کہ کھانے پر ان کے سامنے صرف ایک سالن رکھا جائے جس پر وہ خوشی سے اکتفا کرلیں گے۔ ان کے نزدیک ایک وقت میں تین تین چار چار قسم کے کھانے اور پکوان نہ صرف غیر ضروری تھے بلکہ گناہ کی حد تک فضول خرچی کے مترادف بھی تھے۔

ان دنوں ریڈیو پر فلمی گانوں کا بہت رواج ہو چلا تھا اور کئی احمدی تو ان گانوں کو سننا ناواجب ہی نہیں بلکہ ایک گناہ اور پاپ کا کام خیال کرتے تھے۔

اباجان ؒ گانے بجانے کے سخت مخالف تھے لیکن کبھی کبھار بچے گانا سن رہے ہوتے اور وہ اچانک وہاں آجاتے تو چشم پوشی سے کام لیتے اور درگزر فرماتے۔ مثال کے طور پر انہیں میرے کمرے کے سامنے سے گزرنے کا اتفاق ہوتا۔ کبھی کمرے میں ریڈیو بج رہا ہوتا اور اچانک درمیان میں گانا شروع ہو جاتا تو مخل نہ ہوتے۔ انہیں تجسّس کی عادت نہیں تھی لیکن اگر موسیقی یا اسی قسم کے کسی اور شغل میں ہمیں منہمک خیال فرماتے تو فوراً سختی سے روک دیتے۔

اگرچہ فطرتاً گھر میں خالص قسم کا مذہبی ماحول تھا لیکن اس کا متشدد اور کٹر قسم کی عصبیت سے دور کا واسطہ بھی نہیں تھا۔ اس زندگی بخش ماحول کی ہیئت ترکیبی کسی خشک قاعدے قانون کی محتاج نہ تھی۔ اس کی بنیاد ان انسانی قدروں پر اٹھائی گئی تھی جو مذہب ہی سے پھوٹتی ہیں۔ جو کیریکٹر کی تشکیل اور اخلاق کی نشوونما پر اثر انداز ہوا کرتی ہیں اور جن کا زندہ اظہار جیتے جاگتے زندہ انسانوں کے ذریعے ہوتا رہتا ہے۔

اس طرح پر بچپن میں کئی لحاظ سے میں اپنی والدہ محترمہ سے بے حد متاثر ہوا۔ کئی لحاظ سے اپنی پھوپھیوں سے اور کئی لحاظ سے اپنے والد محترم سے۔ ان سب نے میرے دل و دماغ پر مستقل اور انمٹ نقوش رقم کئے۔ میں آج جو کچھ بھی ہوں بہت حد تک انہی کے فیض سے ہوں۔ حضرت والد محترم ؒ کو جب نہایت نازک قسم کے فیصلے درپیش ہوتے تو وہ ہم بچوں کو

بلوا بھیجتے اور ان سے فرماتے :

"بچو! دعا کرو۔ مجھے تمہاری دعاؤں کی ضرورت ہے"

(حضرت) مسیح موعود (علیہ السلام) نے فروری ۱۸۸۶ء میں جن اہم پیشگوئیوں کا اعلان فرمایا ان میں سے ایک پیشگوئی یہ بھی تھی "کہ میرے بعد ایک عظیم مصلح آئے گا جو مصلح موعود ہو گا۔ میں نے جو کام شروع کیا ہے وہ اس کے کچھ حصے کو تکمیل تک پہنچائے گا۔ وہ کئی اداروں اور کئی قسم کے امور میں اصلاح کرے گا۔ جس کے نتیجے میں دنیا بھر کو حلقہ بگوش اسلام کرنے کی مہم سرعت کے ساتھ آگے بڑھ سکے گی۔

۱۹۳۷ء میں (حضرت) خلیفہ ثانی (رضی اللہ عنہ) نے لکھا :

"میرے نزدیک آنے والا مصلح (حضرت) مسیح موعود (علیہ السلام) کے بیٹوں ہی میں سے ہو گا۔ یہ کوئی ایسا فرد نہیں ہو گا جو کسی بہت بعد کے زمانے میں ظاہر ہو، جہاں تک میں نے مصلح موعود سے متعلق پیشگوئیوں پر غور کیا ہے ان میں سے نوے فیصد میرے عہد خلافت کے کارناموں پر صادق آتی ہیں .... میں ضروری نہیں سمجھتا کہ کوئی ایسا دعویٰ کروں.... بایں ہمہ میں سمجھتا ہوں کہ خدا نے میرے ذریعے ان پیش گوئیوں کے مقصد کو بہت حد تک پورا کر دیا ہے"۔

بعد میں آنے والے سالوں میں ان کی فتوحات اور کارناموں کے حوالے سے ان کے متبعین نے کئی بار ان سے باصرار تقاضا کیا کہ وہ مصلح موعود ہونے کا دعویٰ کریں لیکن وہ شروع ہی سے اس قسم کے اعلان سے محترز رہے۔ حتیٰ کہ جنوری ۱۹۴۴ء کا مہینہ آن پہنچا۔ آپ نے اعلان کیا کہ خدا نے مجھے بتایا ہے کہ

پیشگوئی میں جس مصلح موعود کا ذکر ہے وہ میں ہی ہوں' آپ نے اپنے اس دعوے کی صداقت کے حق میں تحریک جدید کے ماتحت تبلیغ اسلام کے سلسلے میں کی جانے والی ان کامیاب مساعی کا ذکر بھی کیا جو ساری دنیا میں کی جارہی تھیں۔

آپ نے فرمایا :

"خدا تعالیٰ نے الہاماً مجھ پر حقیقت کا انکشاف کر دیا ہے اور اب میں بلاتردد تصدیق کرتا ہوں کہ وہ الٰہی پیشگوئی پوری ہو چکی ہے اور اس نے تحریک جدید کے ذریعے ایک مضبوط بنیاد فراہم کر دی ہے۔

خدا تعالیٰ نے مجھے بتایا ہے کہ میں (حضرت) مسیح موعود (علیہ السلام) کا بروز اور عکس ہوں اور میں ہی وہ مصلح موعود ہوں جس کو دوسرے مذاہب بالخصوص عیسائیت کی غلطیوں اور غلط فہمیوں کا ازالہ کرنا تھا۔ اب اس پیشگوئی کے نتیجے میں دنیا بھر کے ممالک پر اسلام کی حقانیت منکشف ہو جائیگی اور وہ جوق در جوق خدا تعالیٰ کی بادشاہت میں داخل ہو جائیں گے۔ اس کی بادشاہت جس طرح آسمان پر ہے اسی طرح زمین پر بھی قائم ہو جائے گی۔ انشاءاللہ"۔

اسی سال انہوں نے مجلس شوریٰ کے اراکین کو خطاب کرتے ہوئے اعلان فرمایا :

"خدا مخلص کارکنوں اور ساتھیوں کے ذریعے میری مدد کرے گا۔ پس اپنے اندر ایک خارق عادت تبدیلی پیدا کرو اور عدیم المثال قربانیاں دینے کیلئے تیار ہو جاؤ"۔

آپ نے یہ اعلان بھی فرمایا کہ مصلح موعود سے متعلق پیشگوئیوں کے پورا ہونے کے تسلسل میں ان پانچ شہروں اور قصبوں میں جلسے منعقد کئے جائیں گے جن کا (حضرت) مسیح موعود (علیہ السلام) کی مقدس زندگی سے گہرا تعلق ہے۔ نیز فرمایا کہ یہ خشیت اللہ اور تقویٰ و طہارت کے اظہار کا موقع ہے نہ کہ دنیوی جشنوں اور نمود و نمائش کا۔ اس لئے ان جلسوں میں وہی لوگ شمولیت کریں جو متقی، دعائیں کرنے والے اور اپنے گناہوں کی معافی چاہنے والے ہوں۔ جو دن رات یادالٰہی میں غرق اور اس کی حمد و ثناء میں مصروف رہنے والے ہوں۔

بچے بالے، نابالغ، کم سن نوجوان اور وہ لوگ جنہیں اپنے جذبات پر پوری قدرت حاصل نہیں اور وہ جنہیں کچھ دیر خاموش بیٹھنا پڑ جائے تو بے چین ہو جاتے ہیں ان جلسوں میں شمولیت کے لئے نہ جائیں چنانچہ پہلے ہی جلسے پر جماعت نے ان پابندیوں پر اس خلوص سے اور سنجیدگی سے عمل کیا کہ جماعت کا ایک جانی دشمن مبہوت ہو کر رہ گیا اور یہ لکھنے پر مجبور ہو گیا :

"یوں لگتا تھا جیسے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے صحابہؓ کی فوج مکہ مکرمہ کو فتح کرنے کے لئے جا رہی ہو"۔

صاحبزادہ طاہر احمد بھی ان جلسوں میں شامل ہونے والوں میں سے ایک تھے اور سوائے لدھیانہ کے جلسہ کے باقی تمام جلسوں میں انہیں (حضرت) خلیفہ ثانی (رضی اللہ عنہ) کے پہلو میں کھڑا ہونے کا موقع ملا۔ یقیناً یہ ایک بہت بڑا اور غیر معمولی اعزاز تھا۔ ان جلسوں کے ایام میں جماعت کے جذبات اور جوش و خروش کا تذکرہ کرتے ہوئے (حضرت) خلیفہ رابع فرماتے ہیں :

"ہر شخص خوش اور مسرور تھا۔ ہر طرف ایک ہیجان کی سی کیفیت تھی۔ ایک عید کا سا سماں تھا۔ میں کیا تھا۔ کچھ بھی تو

نہیں تھا جیسے سمندر میں ایک قطرہ۔ یہ کسر نفسی نہیں اپنے بارے میں یہ میرا دیانت دارانہ احساس تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میری والدہ محترمہ دلی طور پر شاد کام اور مسرور تھیں۔ وہ اکثر دعائیں کرتیں کہ اے خدا! (حضرت) خلیفہ ثانی (رضی اللہ عنہ) کو کوئی نشان دکھا۔ وہ اتنی خوش اس لئے تھیں کہ ان کی زندگی ہی میں خدا تعالیٰ نے (حضرت) خلیفہ ثانی (رضی اللہ عنہ) کو الہاماً بتادیا تھا کہ ان کے متبعین کا یہ دعویٰ کہ (حضرت) خلیفہ ثانیؓ ہی مصلح موعود ہیں غلط نہیں تھا"

پہلے دو جلسے جن میں (حضرت) خلیفہ ثانی (رضی اللہ عنہ) نے اپنے الہام کی تفصیل بتائی بخیر و خوبی امن و امان سے اختتام پذیر ہوئے۔ دوسرے مذاہب کے ہزاروں لوگوں نے ان جلسوں میں شمولیت کی لیکن اپریل ۱۹۴۴ء میں دہلی میں ہونے والے جلسے کے موقع پر مخالف مسلمان علماء بالآخر پبلک کے جذبات کو جماعت کے خلاف برانگیختہ کرنے میں کامیاب ہو گئے'

دہلی میں تقریباً دس ہزار احمدی مرد و زن ایک کھلی جگہ پر جہاں عام طور پر جلسے ہوتے رہتے تھے ایک شامیانے کے نیچے جمع تھے۔ ایک وسیع و عریض میدان تھا جو اتنا بڑا تھا کہ اس میں فٹ بال کے کئی میدان سما جاتے۔ اس جلسے میں شامل دس ہزار احمدی مرد و زن کا کئی گنا بڑے اور مشتعل ہجوم نے گھیراؤ کیا ہوا تھا۔ اینٹ' پتھر اور لاٹھیوں سے مسلح یہ ہجوم گلے پھاڑ پھاڑ کر نعرے لگا رہا تھا اور (حضرت) خلیفہ ثانی کے قتل کا مطالبہ کر رہا تھا۔

(حضرت) خلیفہ رابع فرماتے ہیں :

"میرے والد صاحبؓ اس شور اور ہنگامہ آرائی کے

درمیان پورے صبر و تحمل اور سکون سے تقریر کرتے رہے۔ نہ تو یہ شور ان کی توجہ میں خلل ڈال سکا' نہ ہی ان کی پیشانی پر بل آیا۔ چاروں طرف ہونے والے اس شور و غوغا کو انہوں نے قطعاً قابل التفات نہیں گردانا۔ البتہ ان رضاکار پہریداروں سے جو نظم و ضبط قائم رکھنے کے لئے مقرر تھے صرف ایک بار مخاطب ہو کر فرمایا کہ : "جایئے اور ہجوم کو جلسہ گاہ کے بہت قریب نہ آنے دیجئے کہ حاضرین جلسہ پریشان ہوں" لیکن پھر یوں ہوا کہ ہجوم اس جگہ پر خشت باری اور پتھراؤ کرنے کی حماقت کر بیٹھا جہاں خواتین بیٹھی ہوئی تھیں۔ میرے والد محترم خواتین کے تحفظ' عزت و آبرو اور احترام کے متعلق بہت حساس تھے۔ وہ خواتین کی بے حرمتی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ آپ نے حاضرین جلسہ سے جو بڑے صبر و تحمل اور نظم و ضبط کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے فرمایا کہ خواتین کی حفاظت کے لئے اٹھیں اور جیسا بھی بن پڑے حملہ آوروں کا جواب دیں۔ یوں لگا کہ جیسے احمدیوں کا اچانک قلب ماہیت ہو گیا ہو۔ سبھی بیک وقت اٹھ کھڑے ہوئے۔ مجھے یاد ہے کہ دوسروں کے ساتھ میں بھی پنڈال سے باہر نکل آیا۔ یہ صورت حال اتنی اچانک اور غیر متوقع تھی اور خواتین کی حفاظت کے لئے ارشاد کی تعمیل میں ہم اس جوش اور جذبے سے اٹھ کھڑے ہوئے تھے کہ حملہ آور جو ہم سے تعداد میں کئی گنا زیادہ تھے سراسیمہ ہو گئے۔ ان میں

بھگدڑ مچ گئی اور وہ اس سراسیمگی کے عالم میں ایک دوسرے پر گرتے پڑتے یوں سر پر پاؤں رکھ کر بھاگے گویا تھے ہی نہیں۔ پلک جھپکتے میں میدان خالی ہو گیا۔"

صاحبزادہ طاہر احمد جو اس مدافعتی جنگ لڑنے کے لئے اوروں کے ہمراہ شامیانے سے باہر نکل آئے تھے، ابھی چند ایک قدم ہی اٹھانے پائے تھے کہ کسی نے انہیں پیچھے سے دبوچ لیا اور اٹھا کر واپس شامیانے کے نیچے لا ڈالا۔ فرماتے ہیں :

"اگر میں کسی ایک کی گرفت میں ہوتا تو اس سے دامن چھڑا کر ضرور واپس دوڑ جاتا۔ پھر مجھے پکڑنے والے صاحب بھی سید اقبال رضا تھے جو عمر میں مجھ سے تین چار سال بڑے تھے اور بڑے مضبوط اور چوڑے چکلے جسم کے مالک تھے۔ زور آزمائی تو میں ان سے بھی کر لیتا۔ کیونکہ میں کبڈی کا کھلاڑی تھا اور کبڈی ایک اچھا خاصہ کشتی نما کھیل ہے جس میں دوڑنے جھپٹنے اور بچ نکلنے کا بھرپور مظاہرہ ہوتا ہے۔ لیکن مشکل یہ آن پڑی کہ اور کئی لوگ بھی سید اقبال رضا کی مدد کو آن پہنچے۔ بس پھر کیا تھا سب نے مل کر مجھے اپنی اپنی گرفت کے شکنجے میں کس لیا۔ اور عملاً گھسیٹ کر مجھے شامیانے کے اندر لے آئے اور اسی پر ہی بس نہیں کی، مجھ پر کڑا پہرہ بھی بٹھا دیا گیا جس کی نگرانی سے بچ نکلنا میرے لئے امر محال ہو گیا۔ البتہ مجھے زخمیوں کی فوری طبی امداد کے کام میں حصہ لینے کی اجازت ضرور مل گئی۔ اس سے کچھ نہ کچھ میری اشک شوئی

بھی ہو گئی۔ زخمیوں میں سے بعض کو شدید چوٹیں بھی آئی تھیں"

جب ان سے پوچھا گیا کہ کیا یہ سب کچھ اس لئے تو نہیں ہوا کہ آپ (حضرت) خلیفہ ثانیؓ کے فرزند تھے اور ان کے متبعین نہیں چاہتے تھے کہ آپ کو کوئی بدنی گزند پہنچے؟

جواباً بتایا:

"میں اس سلسلے میں کیا کہہ سکتا ہوں لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ ان کی نظر انتخاب صرف مجھ پر ہی کیوں پڑی۔ یوں لگتا تھا کہ میں سید مذکور کو ان کی اس حرکت پر کبھی معاف نہیں کر سکوں گا۔ میں ان سے سخت خفا تھا بلکہ بچپن میں کئی سال تک جب کبھی میرا سید صاحب موصوف سے آمنا سامنا ہوتا تو غصے سے میرا خون کھولنے لگتا" :

صاحبزادہ طاہر احمد کبڈی کے کھلاڑی تھے اور بلا مبالغہ ایک ماہر کھلاڑی تھے' وہ کہتے ہیں :

"ہم دو ٹیموں میں منقسم تھے اور ایک دوسرے کو پکار پکار کر مقابلے کا چیلنج دیا کرتے تھے۔ مجھے مخالف کھلاڑی کو پکڑنے کا فن خوب آتا تھا۔ پکڑنے کا یہ طریقہ میں نے ایک مشہور کھلاڑی کو دیکھ کر سیکھا تھا۔ یہ ایک طرح کی اٹھتی ہوئی چھلانگ تھی۔ جو قینچی کی طرح لگائی جاتی تھی۔۔ جس سے مخالف کھلاڑی کی ٹانگیں شکنجے میں آجاتی تھیں' شروع بچپن ہی سے جب میری عمر بہت چھوٹی تھی' میں قسما قسم کے لوگوں پر اس

داؤ کی مشق کیا کرتا تھا۔ جس میں دوسرے لوگوں کے ساتھ وہ مہمان بھی شامل ہوا کرتے تھے جو اتفاق سے ہمارے ہاں تشریف رکھتے ہوں۔ میں مضبوط سے مضبوط آدمی کو بھی گرا لیا کرتا تھا۔ میری اس حرکت پر والدہ محترمہ بہت خفا ہوتیں۔ مہمانوں پر اپنی مہارت آزمانے پر کئی مرتبہ تو میری پٹائی بھی ہوئی۔

نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ بطور کھلاڑی میری مانگ بڑھ گئی۔ ایک مرتبہ جلسہ سالانہ کے موقع پر ہم کبڈی کھیل رہے تھے۔ میں نے ایک کھلاڑی پر قینچی لگائی تو اس کی ٹانگ ٹوٹ گئی۔ میں نے دیکھا کہ اس کی ہڈی گوشت کو چیر کر باہر نکل آئی ہے اور نظر آ رہی ہے تو میں سناٹے میں آ گیا اور وہاں سے بھاگ گیا اور شرم کے مارے کئی دن تک گھر سے نہ نکل سکا۔ میں اپنے کیے پر سخت پشیمان بھی تھا اور یہ سوچ کر شرمندہ بھی کہ لوگ مجھ جیسے لڑکے کے متعلق کیا کہتے ہوں گے جو لوگوں کی ٹانگیں توڑتا پھرتا ہے۔

اس واقعے کے کچھ دنوں بعد میری دادی جان یعنی (حضرت) اماں جان (رضی اللہ عنہا) نے فرمایا کہ وہ مجھ سے ملنا چاہتی ہیں۔ مجھے اندیشہ تھا کہ وہ سخت خفا ہوں گی اور ڈانٹیں گی' لہٰذا میں نے پوری کوشش کی کہ ان کے سامنے نہ جاؤں لیکن جب انہوں نے مجھے باصرار بلا بھیجا تو میں ڈرتا ڈرتا ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ انہوں نے مجھے بڑے پیار سے سمجھایا

کہ بیٹا! تم نے کوئی دانستہ جرم تو نہیں کیا۔ اس لئے اس قدر شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ ساتھ یہ مشورہ بھی دیا کہ اگر تم ڈرتے ہو کہ پھر کسی اور کی ٹانگ نہ توڑ دو تو کبڈی کھیلنا ہی چھوڑ دو۔

میں نے اپنے اس وعدے کو پوری طرح نبھانے کی اپنی سی کوشش کی لیکن ایک دن کچھ لڑکے میرے پاس آئے اور مصر ہوئے کہ میں ان کی ٹیم میں کم از کم ایک بار تو شامل ہو جاؤں اور میچ میں حصہ لوں ان کی دلیل یہ تھی کہ ان کا مقابلہ ایک بہت ہی مضبوط ٹیم سے ہو رہا ہے اور انہیں میرے تعاون کی شدید ضرورت ہے۔ ان کے پیہم اصرار پر میں نے ہاں کر دی۔ اور ان کی ٹیم میں شامل ہو گیا۔ کھیل شروع ہوا تو میں نے پہلی باری جس کھلاڑی کو پکڑا اور اس پر اپنی روایتی "قینچی" کا داؤ آزمایا تو اس کی بھی ٹانگ ٹوٹ گئی!

مجھ پر تو قیامت گزر گئی۔ میں سخت کرب میں مبتلا تھا، خدا تعالیٰ نے مجھے عبرت ناک سبق سکھایا تھا کہ اگر تم کوئی عہد کرو تو اپنے عہد پر قائم رہو"۔

☆ ☆ ☆

5

نیکی کسی کی جاگیر نہیں

یہ ۱۹۴۴ء کا ذکر ہے صاحبزادہ طاہر احمد اب سولہ برس کے ہو چکے تھے ان کا میٹرک کا امتحان ہونے والا تھا کہ ان کی والدہ محترمہ کا انتقال ہو گیا۔ وہ ایک عرصہ سے بیمار تھیں اور کئی ماہ سے لاہور کے ایک ہسپتال میں زیر علاج تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ (حضرت) خلیفۃ المسیح الثانی (رضی اللہ عنہ) بھی تقریباً مستقل طور پر لاہور ہی میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ صاحبزادہ طاہر احمد کی بہنیں بھی وہیں لاہور میں ان کے ہمراہ تھیں۔

صاحبزادہ طاہر احمد اگرچہ اپنے امتحان کی وجہ سے مجبوراً قادیان ہی میں رکے ہوئے تھے لیکن اختتام ہفتہ پر وہ بڑے التزام سے اپنی بیمار والدہ کی عیادت کے لئے لاہور آتے جاتے رہتے تھے۔

چوہدری محمد ظفر اللہ خاں خاندان (حضرت) مسیح موعودؑ کے گہرے دوستوں میں سے تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ (حضرت سیدہ) ام طاہر کی وفات سے طاہر احمد پر

غم و اندوہ کا ایک پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ اگر سوچیں تو یہیں سے ان کی ہنسی اداسی میں بدل گئی اور ان کی مسرت میں غم کا وہ مخصوص اور منفرد رنگ شامل ہو گیا جس کی جھلک ان کی شعری تخلیقات میں بھی نمایاں طور پر نظر آنے لگی۔

ان کے چچازاد بھائی جناب ایم۔ ایم احمد پرانی یادوں کو تازہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:-

"جس واقعہ کو میں کبھی بھلا نہیں سکتا اور جس کی یاد بڑی ہی شدت اور کسک کے ساتھ ذہن پر مرتسم ہو کر رہ گئی ہے وہ (حضرت) ام طاہر (رضی اللہ عنہا) کی رحلت کا سانحہ ہے۔ وفات کے وقت انکی عمر تقریباً چالیس برس کے لگ بھگ ہوگی۔ ان کی وفات کا صدمہ سارے خاندان بلکہ ساری جماعت کے لئے ایک بہت بڑا حادثہ تھا جسے ہر چھوٹے بڑے نے بڑی شدت کے ساتھ محسوس کیا۔ یقیناً آپ ایک نہایت محترم 'نافع الناس' غریب پرور اور محبوب شخصیت کی مالک تھیں جن کی وفات نے سب کو ہلا کر رکھ دیا۔

میری چشم تصور دیکھ رہی ہے کہ ایک چھوٹا سا بچہ مسجد مبارک سے ملحقہ ایک کمرے میں کھڑا ہے۔ مسجد بھر جائے تو نمازی یہاں بھی آجاتے ہیں۔ نماز ہو رہی ہے۔ یہ نوعمر نمازی اپنے رب کے دربار میں بڑے ہی خشوع و خضوع سے دست بدعا ہے۔ شدت غم سے چشم پُر آب ہے۔ اپنے خالق سے کوئی التجا کر رہا ہے۔ میں یہ نظارہ بھلاؤں بھی تو نہیں بھول سکتا۔ چھیالیس برس ہونے کو آئے یوں لگتا ہے جیسے یہ کل کی بات

ہو۔ سوچتا ہوں اس بچے کے اخلاص اور دردو اور غم میں کوئی
ایسی سچائی اور غیر معمولی صداقت ضرور جگمگا رہی ہوگی جس
کی وجہ سے میں یہ دلکش نظارہ ایک لمحے کے لئے بھی ذہن
سے محو نہیں کر سکا"۔

صاحبزادہ طاہر احمد کی روایتی نصابی تعلیم جوں توں چل رہی تھی۔ اس دوران اب انہیں نت نئی غیر نصابی کتب کے مطالعے کا اچھا خاصہ چسکا پڑ چکا تھا۔ یہ انہی دنوں کی بات ہے جب انہوں نے صرف اردو ادب کے کلاسیکی مصنفین ہی کا مطالعہ نہیں کیا بلکہ شیکسپئر، چارلس ڈکنز، کینن ڈائیل اور انگریزی ادب کے دوسرے ہر نوع کے معروف مصنفین کی کتب بھی کھنگال ڈالیں۔ خصوصاً جیروم کے ۔ جیروم (Jerome K. Jerome) کی کتاب "Three men in a boat" (تین آدمی ایک کشتی میں) کا مزاحیہ انداز تو انہیں بے حد پسند آیا۔
ان میں یورپ کی تہذیبی قدروں کا شعور اور احساس تو پہلے سے موجود تھا چنانچہ وہ خود کہتے ہیں۔

"یورپ کی اعلیٰ قدریں ہمارے لئے اجنبی نہیں تھیں۔
ہمارے والد محترم (حضرت) خلیفۃ المسیح الثانی (رضی اللہ عنہ) بعض
امور میں بے حد ترقی پسند واقع ہوئے تھے۔ اپنی بیٹیوں کی
تعلیم کے بارے میں تو وہ بڑے ہی لبرل اور فراخ دل تھے
چنانچہ ان کی تعلیم کے لئے پہلے ایک جرمن خاتون اور پھر
ایک انگریز استانی کو بطور معلمہ ملازم بھی رکھا گیا تھا۔
یہی وجہ ہے کہ میں بچپن ہی میں جرمن اور انگریزی
ادب اور مغرب کے سوشل رکھ رکھاؤ اور ادب آداب سے

بخوبی متعارف ہو چکا تھا اور پھر انگریزی لٹریچر کے مطالعے کے
بعد تو مجھ میں انگریزی طرز تمدن خصوصاً انگریزی مزاج سے تو
کسی قسم کی نامانوسیت یا اجنبیت کا احساس تک نہیں تھا"۔

انہی ایام میں صاحبزادہ طاہر احمد کے شعری سفر کا صحیح معنوں میں آغاز ہوا۔ شروع شروع میں تو انہوں نے اپنی شعری کاوشوں کو صیغہ راز میں رکھا اور کسی کو اس تخلیقی عمل کی خبر نہ ہوئی۔ لیکن خوشبو تو چھپائے سے نہیں چھپ سکتی۔ بالآخر یہ راز فاش ہو گیا اور سب کو پتہ چل گیا کہ آپ شعر بھی کہتے ہیں۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ ہر طرف سے فرمائشیں شروع ہو گئیں کہ آؤ میاں اپنے شعر سناؤ۔

وہ خود فرماتے ہیں۔

"اس میں شک نہیں کہ یہ اشعار درد اور غم میں ڈوبے
ہوئے ہوتے تھے۔ بایں ہمہ یہ دیکھ کر مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ
ان اشعار کو سن کر کچھ افراد خاندان تو اتنے متاثر ہوئے کہ
بے اختیار ان کے آنسو نکل آئے۔ پھر کیا تھا فرمائشوں پر
فرمائشیں ہونے لگیں۔ اکثر مجھ سے اصرار کیا جاتا کہ دیکھو اس
طرح چھٹکارا نہیں ہو گا پہلے اپنے اشعار سناؤ۔ یہ اشعار طربیہ
بھی ہوتے اور مزاحیہ اور حزنیہ بھی۔ اتفاق کی بات ہے میں
بین بین قسم کی مرکب جذبات نگاری پر کبھی قادر نہیں
ہو سکا"۔

(حضرت) والدہ (صاحبہ) کی وفات کے بعد ان کی دو خالاؤں نے صاحبزادہ طاہر احمد کو ماؤں کی طرح بڑی ہی محبت اور شفقت سے اپنے کنار عاطفت میں لے لیا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ بھی ان کے لئے انتہائی محبت اور احترام کے جذبات رکھتے

ہیں۔

تربیت ان کی اپنے والد (حضرت) خلیفۃ المسیح الثانیؓ کی کڑی نگرانی میں ہوئی اور صاحبزادہ طاہر احمد کو پورا یقین تھا کہ ان کے والد (حضرت) خلیفہ ثانیؓ اپنے باقی بچوں کی طرح ان سے بھی بے حد پیار کرتے ہیں چنانچہ آپ فرماتے ہیں۔

"بچوں سے اپنی محبت کے اظہار میں ہمارے والد محترم بڑے محتاط واقع ہوئے تھے۔ ان کی کوشش ہوا کرتی تھی کہ پدرانہ شفقت اور محبت کے جذبات کا اظہار حدود کے اندر رہے اور اعتدال سے تجاوز نہ کرنے پائے۔

بعض امور میں (حضرت) ابا جان بڑی سختی سے کام لیتے تھے اور بعض میں خاصی نرمی سے۔ دراصل وہ جس قدر دلچسپ انسان تھے اسی قدر بااصول بھی تھے یعنی نرمی اور سختی کا ایک حسین اور معتدل امتزاج۔ وہ بشری خامیوں کو خوب سمجھتے تھے۔ اس لئے نہیں چاہتے تھے کہ ہماری اس قسم کی بچپن کی بے ضرر شرارتیں اور حرکات ان کے علم میں لائی جائیں۔ وہ ہمیں اپنی اصلاح کا موقع بھی دیتے تھے اور مہلت بھی اور اگر کبھی کوئی کمزوری سر اٹھانے لگتی تو بغیر ہمارا نام لئے ہمیں ڈانٹ پلاتے اور فرماتے کہ دیکھو بچو یہ اچھی بات نہیں ہے۔ اس سے بچو۔ لیکن ہم میں سے اگر کوئی رنگے ہاتھوں پکڑا جاتا تو اس سے سختی سے نمٹتے۔ وہ بڑے ہی بااصول انسان تھے۔ مالی معاملات میں ذرا سی لاپرواہی بھی برداشت نہیں کرتے تھے۔ بحیثیت خلیفۃ المسیح ان کے

فرائض میں شامل تھا کہ وہ جماعت احمدیہ کو مالی قربانیوں کے ایک ایسے نظام کے لئے تیار کریں جو مکمل طور پر طوعی اور سراسر رضاکارانہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ان معاملات میں بے قاعدگی پر کسی قسم کی نرمی کے روادار نہیں تھے۔

اس سلسلے میں افراد خاندان کے ساتھ تو نرمی کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ ان پر تو خصوصیت سے کڑی نگاہ رکھتے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ میں نے کسی چیز کے بارے میں کسی دوست کو کلکتہ لکھا کہ مجھے بھجوادیں۔ اباجان تاڑ گئے اور مجھ سے پوچھا۔ "کیا تم نے یہ چیز کہہ کر منگوائی ہے اور قیمت ادا کردی ہے؟ میں نے عرض کیا کہ اس چیز کی تحفے کے طور پر پیشکش ہوئی تو تھی لیکن میں نے انکار کردیا تھا۔ میں نے کچھ قیمت تو ادا کردی ہے اور باقی ادا کررہا ہوں۔

اس پر فرمایا۔ تحفے کہہ کر نہیں لئے جاتے وہ تو بن مانگے رضاکارانہ طور پر پیش کئے جاتے ہیں۔ اگر تم کوئی چیز کہہ کر طلب کرتے ہو تو اس کی قیمت فوراً ادا کردینا چاہئے ورنہ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ فریق ثانی پر جس کے ذریعہ تم نے کوئی چیز منگوائی ہے' بلاجواز مالی بوجھ ڈال رہے ہو۔ اگر انہیں کسی خاص امر پر زور دینا مقصود ہوتا تو (حضرت) مسیح موعودؑ کے حوالے سے بات کرتے۔ یہ نہ کہتے کہ تمہارے داداجان نے کہا ہے بلکہ کہتے کہ (حضرت) بانی سلسلہ (عالیہ احمدیہ) کا ارشاد ہے۔ مثلاً ایک دفعہ انہوں نے مجھے گھر سے ننگے سر نکلتے ہوئے

دیکھ لیا۔ مغرب میں تو بڑوں کے سامنے ننگے سر ہو جانا احترام کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ لیکن مشرق میں معاملہ اس کے برعکس ہے۔ مشرقی ممالک میں احترام کا تقاضا یہ ہے کہ بزرگوں کے سامنے سر ڈھانپ لیا جائے چنانچہ (حضرت) خلیفہ ثانیؓ نے مجھے ننگے سر جاتے دیکھ کر واپس بلایا اور کہا "یاد رکھو (حضرت) بانی سلسلہ (عالیہ احمدیہ) تمہیں اس طرح ننگے سر گھر سے باہر جاتے دیکھ کر کبھی خوش نہ ہوتے۔ اس لئے آئندہ کے لئے محتاط رہو اور کبھی ننگے سر گھر سے باہر مت جاؤ۔

وہ اسلامی رسم و رواج اور مسنون آداب کی پابندی پر بھی اصرار کرتے مثلاً یہ کہ جوتا پہنتے وقت دایاں جوتا پہلے پہنیں۔ مسجد میں داخل ہوتے وقت دایاں پاؤں پہلے رکھیں۔ وغیرہ۔

بچوں کی تعلیم و تربیت کے سلسلے میں اس بات پر خصوصیت سے زور دیتے کہ بچے دوسرے مذاہب کا احترام کرنا سیکھیں اور کبھی بھولے سے بھی دل میں یہ خیال نہ لائیں کہ صرف اسلام ہی نیکی، پارسائی اور اخلاقی قدروں کے حصول کی تلقین کرتا ہے اور دوسرے مذاہب اس سے یکسر خالی ہیں اور یہ اچھے مسلمان کی علامت نہیں کہ اپنے پڑوسی سے صرف اس وجہ سے اجتناب کرے کہ وہ ہندو یا سکھ مذہب سے تعلق رکھتا ہے۔"

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ (حضرت) خلیفہ ثانیؓ کو اس پل کا خوب علم تھا
ننھے طاہر احمد اور ان کے بھائیوں اور پڑوس میں رہنے والے ہندو بچوں

دونوں گھروں کے درمیانی فاصلے کو پاٹنے کے لئے بنا رکھا تھا۔ بلکہ اس پر تو آپ خوشنودی اور پسندیدگی کا اظہار بھی فرما چکے تھے۔

اگرچہ ہندوؤں کے ایک کٹر اور بنیاد پرست فرقے کے لوگ گاہے بگاہے قادیان میں آکر اشتعال انگیز کانفرنسیں منعقد کرتے اور فخریہ اعلان کیا کرتے تھے کہ وہ قادیان کی اینٹ سے اینٹ بجادیں گے اور جماعت احمدیہ کیا' ایک ایک احمدی کا نام ونشان تک مٹا کر چھوڑیں گے۔

لیکن یہ شدید قسم کی مذہبی اشتعال انگیزی بھی (حضرت) خلیفہ ثانیؓ کے بچوں اور پڑوس میں رہنے والے ہندو بچوں کے باہمی تعلقات کو مکدر نہ کر سکی۔ فرمایا:۔

> "ہمیں تعلیم ہی یہ دی گئی تھی کہ عقائد میں اختلاف کا مطلب مخالفت نہیں۔ بلکہ ہونا یہ چاہئے کہ اختلاف کی صورت میں دیانتداری سے دلائل کی بناء پر اپنی رائے قائم کی جائے اور اس کی تو کسی صورت میں بھی اجازت نہیں دی جاسکتی کہ یہ اختلاف ہماری روز مرہ کی زندگی میں تلخیاں گھول دے اور ایک دوسرے کے درمیان نفرت کی دیواریں حائل کردے"۔

(صاحبزادہ) طاہر احمد عمر کے ایک نازک دور میں سے گذر رہے تھے۔ عقل سلیم کہتی تھی اسلام سچا ہے اور وہ اسلام کی سچائی کے صدق دل سے قائل بھی تھے۔ لیکن ہستی باری تعالیٰ کے متعلق عقل یہ تو کہتی تھی کہ خدا کو موجود ہونا چاہئے لیکن کیا وہ واقعی موجود تھا بھی؟ یہ وہ سوال تھا جس کا عقل محض کے پاس کوئی جواب نہیں تھا اور یہ سوال ان کے دل میں رہ رہ کر اٹھ رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

6

کیا خدا ہے؟

مسلمان قرآن (کریم) کے حفظ اور اس کے سارے متن کو زبانی یاد کرنے کو ایک بہت بڑی سعادت اور نیکی خیال کرتے ہیں۔ دنیا بھر میں بے شمار مرد و زن اسی نیت سے قرآن (کریم) حفظ کرنا شروع کرتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ سب کے سب منزل تک نہیں پہنچ پاتے کیوں کہ قرآن کریم کو حفظ کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ قرآن (کریم) میں ۱۱۴ سورتیں یا باب ہیں اور ۶۶۶۶ آیات ہیں۔ اور اب تو اکثر مسلمان یہ خیال کرنے لگے ہیں کہ قرآن کو محض حفظ کر لینا ہی کافی نہیں وہ کہتے ہیں کہ چونکہ قرآن اللہ کا کلام ہے اس لئے اس کے متن کی تلاوت کے ساتھ ساتھ اس کے ترجمے کو جاننا اور اس کے مفاہیم اور معانی کو سمجھنا بھی از ضروری ہے۔

(صاحبزادہ) طاہر احمد نے قرآن (کریم) حفظ کرنا شروع کیا تو فوراً ہی یہ انداز ہو گیا کہ وہ حفظ کے کام کو پایہ تکمیل تک نہیں پہنچا سکیں گے۔ وہ آیات کو از

کرنے کی نسبت ان کے الفاظ کے مفاہیم اور معانی میں زیادہ دلچسپی لیتے۔ اپنے اساتذہ سے لفظوں کے معنی پوچھتے۔ بھائیوں سے پوچھتے اور اگر تسلی نہ ہوتی تو ابا حضور یعنی (حضرت) خلیفہ ثانیؓ سے بھی جا کر دریافت کرتے۔ قرآن (کریم) کی التزام سے تلاوت اور اس کا بغور مطالعہ تو پہلے ہی سے ان کی عادت اور زندگی کا معمول بن چکا تھا۔ روزانہ تلاوت قرآن کے بعد وہ بانی اسلام (حضرت) محمد (ﷺ) کی تعلیمات اور اقوال جو احادیث کی شکل میں محفوظ ہو چکے ہیں "کا بغور مطالعہ کرتے۔ دن میں پانچ مرتبہ نماز باجماعت میں شامل ہوتے اور تنہائی میں نوافل بھی ادا کرتے۔ دراصل دعا اور نماز تو (حضرت) خلیفہ ثانیؓ کے بچوں کی گھٹی میں شامل تھی اور ان کی زندگی کا جزو لاینفک بن چکی تھی۔ چنانچہ اس سلسلے میں کئی قابل ذکر واقعات بھی ہوتے رہتے تھے۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے (حضرت) خلیفہ ثانی اپنے اہل و عیال سمیت قادیان واپس آ رہے تھے۔ راستے میں پتہ چلا کہ گاڑی کا پٹرول تو ختم ہونے کو ہے اور پٹرول کے پیمانے کی سوئی صفر کے نشان تک پہنچ گئی ہے۔ دراصل انہیں چلتے وقت پٹرول لینا یاد نہیں رہا تھا۔ اب آدھا سفر ہو چکا تھا اور آدھا باقی تھا اور منزل مقصود یعنی قادیان تک راستے میں دور دور تک کسی پٹرول پمپ کا وجود تک نہیں تھا۔ (حضرت) خلیفہ ثانیؓ بچوں کو مخاطب کر کے فرمانے لگے۔ "بچو! آؤ ہم سب اللہ تعالیٰ کے حضور دعا کریں کہ اے اللہ! اس مشکل کو راستے کا روگ نہ بنا اور اپنے خاص تصرف سے ہمیں اسی طرح قادیان پہنچا دے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ جس کی بھی دعا قبول ہوئی میں اسے قادیان پہنچ کر دو گیلن پٹرول اور کار کے استعمال کی اجازت دے دوں گا۔

ہو سکتا ہے یہ بات (حضرت) خلیفہ ثانیؓ نے سرسری طور پر ان کی تربیت کے

لئے کہی ہو۔ بہر حال ہوا یہ کہ صاجزادہ طاہر احمد کے بھائی بہنوں نے تو کوئی خاص توجہ اس طرف نہیں دی لیکن کم سن طاہر احمد بڑی سنجیدگی اور یک سوئی سے اللہ کے حضور دعا میں مشغول رہے یہاں تک کہ اسی حالت میں کار قادیان پہنچ گئی. قادیان پہنچے تو طاہر احمد بے اختیار پکار اٹھے۔ "ابا جان میں مسلسل دعا کرتا رہا ہوں. میں اس وقت سے دعا کرتا چلا آرہا ہوں جس وقت آپ نے دعا کے لئے فرمایا تھا"۔

چنانچہ (حضرت) خلیفہ ثانیؓ نے وعدے کے مطابق دو گیلن پٹرول اور کار کے استعمال کی اجازت دے دی اور طاہر احمد مزے سے سیرو تفریح کے لئے روانہ ہو گئے۔

اب صاجزادہ صاحب عمر کے چودھویں سال میں قدم رکھ رہے تھے ان کے ذہن میں طرح طرح کے سوالات بھی اٹھنے لگے تھے۔ انہیں سائنس کی تعلیم سے دلچسپی تو تھی لیکن جہاں تک سکول کی مختلف جماعتوں میں ان کے امتحانی کارہائے نمایاں کا تعلق ہے تو بس یوں کہئے کہ جوں توں گذارہ ہو رہا تھا۔ یہی حال سائنس کے مضمون کا تھا۔ البتہ انہوں نے اپنے طور پر سائنسی تجربات کرنے بھی شروع کر دیئے تھے یعنی ایسے تجربات جن کا سکول کی نصابی سائنس سے دور کا بھی تعلق نہیں تھا۔

انہی دنوں انہوں نے اپنے والد محترم کی لائبریری بھی ڈھونڈ نکالی۔ یہ ایک معرکے کی دریافت تھی۔ لائبریری میں سائنسی موضاعات پر کتنی ہی کتابیں تھیں۔ ڈارون کے نظریہ ارتقاء پر کتب تھیں۔ حیاتیات پر کتب کا ذخیرہ تھا۔ سگمنڈ فرائڈ کی تصانیف کا سیٹ بھی موجود تھا وہ خود کہتے ہیں۔

"میری عمر تو ابھی اتنی نہیں تھی کہ میں ان کتب کو

پورے طور پر سمجھ سکتا۔ لیکن ان کتب کے مطالعے سے
میرے ذہن پر ایک دھندلا اور مبہم سا مجموعی اثر ضرور رہوا۔
اور میں کبھی کبھی سوچا کرتا تھا کہ کیا خدا تعالیٰ واقعی موجود
ہے؟"

پھر تو مطالعے کا شوق اتنا بڑھا کہ اکثر رات کے وقت کتاب ہاتھ میں ہوتی اور وہ پڑھتے پڑھتے سو جاتے۔ انہی دنوں غالباً کثرت مطالعہ کی وجہ ہی سے ان کو شدید قسم کا درد سر بھی رہنے لگا۔

دیگر مذاہب کے مقابلے میں اسلام کی حقانیت کے بارے میں انہیں کبھی کوئی شک پیدا نہیں ہوا۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

"مجھے کامل یقین تھا کہ اسلام کی حقانیت دلائل و براہین
پر مبنی ہے۔ جماعت احمدیہ کی سچائی کے متعلق تو مجھے کبھی ہلکا
سا بھی شک نہیں ہوا۔ کبھی بھی نہیں۔ میں اس یقین پر قائم تھا
کہ احمدیت ہی حقیقی اسلام ہے اور میں اس یقین پر اب بھی
پورے وثوق سے قائم ہوں۔ اس سلسلے میں زندگی بھر کبھی
کسی قسم کا ہلکا سا اشتباہ بھی پیدا نہیں ہوا"۔

مزید فرماتے ہیں۔

"ان دنوں یہ احساس میرے لئے سخت اضطراب کا
باعث تھا کہ اسلام کی عمارت تو ایمان باللہ پر استوار کی گئی ہے
اگر بنیاد ہی موجود نہ ہو تو مذہب کی حیثیت خالی موشگافیوں اور
دماغی ورزش کے سوا اور کیا رہ جاتی ہے۔ بین المذاہب
قدروں کا روایتی تقابل محض مجرد قدروں کے تقابل تک ہی

محدود ہو کر رہ جاتا ہے اور بس۔

یہ پہلا سوال تھا جس کا مجھے زندگی کے اس دور میں بڑی شدت سے سامنا کرنا پڑا۔ بلکہ اس احساس نے تو مجھے ہلا کر رکھ دیا۔ میں گھنٹوں سوچا کرتا کہ بنیادی سوال تو دراصل یہی ہے کہ آیا خدا ہے بھی یا نہیں؟

مجھے یاد ہے کہ میں یہ سوچ کر خوف کے مارے سہم سا گیا تھا کہ اس سوال کا جواب دیا جائے تو کیسے؟ دراصل مجھے یقین کامل کی تلاش تھی اور یقین کامل کی دولت محض بے جان کتابوں کی ورق گردانی سے ملنی محال تھی۔ ادھر مجھے بھی اس مسئلے کا فوری' بلاواسطہ اور یقینی حل درکار تھا"۔

چنانچہ انہوں نے پہلے پہل تو خالصتاً معقولی اور منطقی نقطہ نگاہ سے ہستی باری تعالیٰ کے امکانات کا جائزہ لینا شروع کیا۔

فرماتے ہیں۔

"میں سمجھتا ہوں کہ میں فطرتاً معقولی انداز کو پسند کرتا ہوں۔ معقولیت میرے مزاج کا حصہ بن چکی ہے۔ اس لئے جب میں نے خالصتاً معقولی انداز میں ہستی باری تعالیٰ کے امکان پر غور شروع کیا تو میں نے محسوس کیا کہ جس طرح انسانی اور حیوانی ذہن اور شعور میں باہمی فرق اور فاصلہ ہے اسی طرح انسانی شعور کے مختلف مراحل میں بھی اسی قسم کے طویل فاصلے حائل رہے ہوں گے۔ سیدھے سادھے لفظوں میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ ایک انسان چیونٹی کے وجود کا

شعور تو رکھتا ہے لیکن چیونٹی کو انسانی وجود کے متعلق یہ شعور حاصل نہیں۔ لہٰذا اگر انسان اور چیونٹی کے درمیان اتنا بڑا خلا ہو سکتا ہے تو خدا اور انسان کے درمیان تو اس سے کہیں بڑا خلا ہو گا۔ چنانچہ اپنی اس بشری بے مائیگی اور عجز کے احساس ہی میں مجھے میرے سوال کا جواب مل گیا"۔

عجز کا یہ احساس ہی تھا جس نے صاحبزادہ طاہر احمد کی توجہ کا رخ دعا کی طرف پھیر دیا۔ فرماتے ہیں

"یہ میری زندگی کا سخت ترین دن تھا۔ ایک کرب اور اضطراب کی کیفیت تھی جو اندر ہی اندر کھائے جا رہی تھی۔ ایک غیر مرئی اور غیر محسوس قوت پر ایمان لانا اور اس پر اپنی ساری زندگی کی نظری اور فکری عمارت تعمیر کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ یہ ایک چیلنج تھا جو درپیش تھا۔ جس نے مجھے شدید خلجان میں مبتلا کر دیا ایک عجیب اذیت ناک کیفیت تھی جس سے میں دوچار تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اصولاً تو خدا کا وجود لازمی ہے۔ لیکن کیا حقیقتاً بھی وہ موجود ہے؟ اور اگر ہے تو کیا مجھے وہ اپنا چہرہ دکھائے گا؟"

کبھی وہ مسجد میں جا کر گھنٹوں عبادت میں مشغول رہتے اور کبھی اپنے کمرے ہی میں ساری ساری رات عبادت میں گزار دیتے۔ چنانچہ آپ فرماتے ہیں۔

"میں خدا کے حضور دعا کرتا اور کہتا کہ "اے خدا! اگر تو موجود ہے تو مجھے تیری تلاش ہے۔ تو مجھے بتا کہ تو ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں بھٹک جاؤں۔ کیا مجھ پر اس گمراہی کی ذمہ

داری تو نہیں ہو گی؟ اور پھر سوچتا کہ شاید ہو بھی۔ پھر میں دعا کرتا کہ اے خدا یہ ذمہ داری مجھ پر تو عائد نہیں ہونی چاہئے"۔

پھر ایک سہ پہر وہ ایک ایسے روحانی تجربے سے گذرے جس کی وجہ سے ہستی باری تعالیٰ سے متعلق سوال ان پر ہمیشہ کے لئے حل ہو گیا۔ وہ خود کہتے ہیں کہ اگر اس تجربے کو معروضی انداز سے جانچا جائے تو اسے ہستی باری تعالیٰ کا بہت زبردست اور طاقتور ثبوت تو نہیں کہا جا سکتا لیکن انہیں یقین ہے کہ یہ جواب تھا اس دعا کا جو انہوں نے کی تھی۔ فرماتے ہیں۔

"یہ خواب اور بیداری کے درمیان ایک قسم کی نیم غنودگی کی سی کیفیت تھی۔ میں نے دیکھا کہ ساری زمین سکڑ کر ایک گیند کی شکل اختیار کر گئی ہے۔ جس پر دور دور تک کسی جاندار مخلوق کے کوئی آثار نظر نہیں آتے۔ نہ زندگی کی چہل پہل ہے نہ ہی شہر ہیں نہ آبادیاں۔ غرضیکہ کچھ بھی تو نہیں۔ بس زمین ہی زمین ہے کیا دیکھتا ہوں کہ اچانک زمین کا ذرہ ذرہ کانپنے لگا ہے اور ایک زناٹے سے پکار پکار کر کہہ رہا ہے ہمارا خدا! ہمارا خدا! ایک ایک ذرہ اپنے وجود کی علّت غائی کا باآواز بلند اعلان کر رہا تھا۔

ساری کائنات ایک عجیب قسم کی روشنی سے بھر گئی۔ ایک ایک ذرے اور ایک ایک ایٹم نے ایک سر اور تال کے ساتھ پھیلنا اور سکڑنا شروع کیا میں نے محسوس کیا کہ ان کے ہمراہ میں بھی یہ الفاظ دو ہرا رہا ہوں اور کہہ رہا ہوں 'ہمارا

خدا۔ ہمارا خدا ''

اب وہ مکمل بیداری کی حالت میں واپس آچکے تھے لیکن اس نظارے کو بدستور دیکھ رہے تھے اس کے بعد ان کے تمام شکوک ہمیشہ کے لئے رفع ہو گئے۔ عجیب بات ہے کہ مئی ۱۹۹۰ء میں کائناتی طبیعیات (Cosmic Physics) کے ایک ماہر نے اپنے نظریہ کی وضاحت کرتے ہوئے کائنات کی تخلیق کی جو تصویر پیش کی ہے وہ اس نظارے سے حیران کن حد تک ملتی جلتی ہے جو اُن دنوں صاحبزادہ طاہر احمد کے تجربے میں آیا۔ آپ فرماتے ہیں۔

"میں یہ تو نہیں کہتا کہ ہر شخص اسی قسم کے روحانی تجربے سے گذرتا ہے لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ خدا اپنے بندے پر اس کی اس صلاحیت کے مطابق ظہور ضرور فرماتا ہے جو خدا شناسی کے لئے ضروری ہے۔ وہ خدا تو سب کا خدا ہے البتہ یہ ہر شخص کے ظرف پر منحصر ہے کہ اسے یہ معرفت الٰہی کس رنگ اور کس شکل میں نصیب ہوتی ہے۔"

برسوں بعد جب صاحبزادہ طاہر احمد خلیفہ رابع بن چکے تھے تو آپ نے فرمایا:۔

"معمول کی فرض نمازوں کے علاوہ قرآن (کریم) مومنوں کو تلقین کرتا ہے کہ وہ دن رات اس کی یاد میں محو رہیں۔ اپنے روزانہ کے معمولات میں اپنی خوشی اور اپنی غمی میں ہر آن اسے یاد کرتے رہیں۔ میں نے ذاتی طور پر اس نصیحت سے بے حد فائدہ اٹھایا ہے۔ یعنی میں نے خوشی غمی اور زندگی کے ہر تغیر و تبدل کے موقع پر جب جذبات کی شدت ہمارے شعور اور ذہن کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتی ہے خدا کو

یاد کرنا سیکھ لیا ہے۔

یہ میرے والد محترم کی شخصیت ہی تھی جس نے مجھے سچائی کا یہ راستہ دکھایا۔ اگرچہ وہ جماعت احمدیہ کے واجب الاحترام امام تھے۔ اور لوگ ان کے پاس دعا کی درخواستیں لے کر آتے رہتے تھے لیکن ان کا اپنا طریق یہ تھا کہ آڑے وقت میں آپ ہم بچوں سے بھی فرماتے کہ آؤ بچو! دعا کرو۔ دعا کرو کہ اللہ تعالیٰ میری مدد فرمائے۔ دعا کرو کہ اللہ تعالیٰ جماعت کا معین ومددگار ہو"۔

اس روحانی تجربے کے بعد تو ہستی باری تعالیٰ کے پے در پے ثبوت ملنے لگے۔ اب دعاؤں کا جواب آنے لگا اور دعائیں قبول ہونے لگیں۔ فرماتے ہیں۔

"دراصل جب میں بچپن میں بھی دعا کرتا تو اسے قبولیت کا شرف حاصل ہو جاتا لیکن کبھی کبھی میں یہ بھی سوچا کرتا کہ کہیں اس احساس میں میرے اپنے ذہن ہی کا عمل دخل نہ ہو۔ لیکن جب میں نے ہستی باری تعالیٰ کے ناقابل تردید ثبوت کو اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرلیا اور میری عاجزانہ دعائیں اس کثرت سے قبول ہونے لگیں تو لامحالہ یہ امر بجائے خود میرے لئے ایک معین اور زندہ ثبوت کے طور پر کھل کر میرے سامنے آگیا۔ مجھے یقین ہے کہ قبولیت دعا کے ان واقعات کا اتفاق یا حادثات سے ہرگز کوئی تعلق نہیں تھا۔ یہاں تک کہ ہستی باری تعالیٰ کی یہ تائیدی شہادت پھیلتی بڑھتی اور مضبوط سے مضبوط تر ہوتی چلی گئی حتیٰ کہ وہ وقت

بھی آن پہنچا جب خدا تعالیٰ نے اپنے فضل سے مجھے براہ راست اپنے الہام کے انعام سے سرفراز فرمادیا"۔

☆ ☆ ☆

7

ربوہ

پندرہ اگست ۱۹۴۵ء کا تاریخ ساز دن تھا۔ برطانوی دار العوام اور دار الامراء کا مشترکہ اجلاس ہونے والا تھا۔ جارج ششم تاجدار برطانیہ شہنشاہ ہندوستان کا جلوس بڑے شاہانہ کروفر کے ساتھ پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں کے اس نئے اجلاس کے افتتاح کے لئے ویسٹ منسٹر کے قصر عالیشان کی جانب رواں دواں تھا۔ حالیہ انتخابات میں قدامت پسند پارٹی کے مقابل پر لیبر پارٹی بھاری اکثریت سے کامیاب ہو چکی تھی۔ تخت شاہی سے جو تقریر شاہ جارج نے دار العوام اور دار الامراء کے مشترکہ اجلاس کے سامنے کی وہ دراصل نئی لیبر حکومت کی آئندہ حکمت عملی کی آئینہ دار تھی۔ آئین کے مطابق برطانیہ کے بادشاہ وقت کی نہ تو کوئی اپنی رائے ہوا کرتی ہے نہ ہی وہ سیاست میں حصہ لے سکتا ہے اور لیبر پارٹی کے انتخابی منشور میں یہ وعدہ شامل تھا اور اس کے مطابق اس کی حکمت عملی یہ تھی کہ برطانیہ کے زیر تسلط جملہ ممالک کو فی الفور آزاد کر دیا جائے۔

شاہ جارج نے فرمایا۔ "ان وعدوں کی روشنی میں جو ہندوستان میں بسنے والی رعایا سے کئے جا چکے ہیں میری حکومت کی انتہائی کوشش ہوگی کہ ہندوستان کی رائے عامہ کے مشورے سے ہندوستان کو جلد تر آزاد کر دیا جائے"۔

چوہدری ظفر اللہ خاں نے تقسیم ہند کے بعد ہونے والے واقعات پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا۔

"شاہ جارج کے اس وعدے کا ایفاء نہایت المناک انداز میں ہوا"۔

ہندوستان کے آخری وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی پوری کوشش تھی کہ برصغیر کسی نہ کسی طرح ایک سیاسی وحدت کے طور پر برقرار رہے۔ برصغیر کی دو بڑی تہذیبیں آٹھ سو سال سے ایک دوسری کے بالمقابل نبرد آزما تھیں۔ طبعاً دونوں تہذیبوں نے ایک دوسری کو ایک حد تک متاثر تو کیا لیکن کسی بڑے پیمانے پر نہ تو ان کا حقیقی رنگ میں باہم ملاپ ہوا اور نہ ہی اس سطحی ملاپ اور امتزاج سے کوئی تیسری مرکب قسم کی مستقل تہذیب معرض وجود میں آسکی اور یہ دو تہذیبیں مل کر بھی نہ مل سکیں۔ مبصرین کی رائے میں اس کا منطقی نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان اور ہندو الگ الگ دو مختلف قوموں کی حیثیت سے کھل کر سامنے آگئے۔ مسلمان اقلیت میں تھے۔ ان کو یہ خدشہ تھا کہ متحدہ ہندوستان میں وہ ایک مستقل اقلیت بن کر رہ جائیں گے۔ ایسی اقلیت جو ہمیشہ ہندو اکثریت کے رحم و کرم پر ہوگی اور اس کے ظلم و ستم کا نشانہ بنی رہے گی۔ چنانچہ ہندوستان کی تقسیم کا عمل کچھ اس اذیت ناک طریقے سے شروع ہوا کہ ہمسایہ ہمسائے کا دشمن بن گیا۔ کیا چھوٹا اور کیا بڑا، کوئی بھی محفوظ نہ رہا۔ جگہ جگہ لوگ اپنے آپ کو مسلح کرنے لگے صاحبزادہ طاہر احمد ان دنوں خدام الاحمدیہ کے رکن تھے۔ یہ نوجوانوں

کی ایک اصلاحی تنظیم تھی۔ نوجوانوں اور بچوں کی صرف اخلاقی اور روحانی تربیت اس کا مقصد تھا۔ اس نئی صورت حال کے پیش نظر اسے قادیان کے دفاع کے لئے از سرِ نو منظم کیا گیا۔ شہر کو مختلف سیکٹروں میں تقسیم کر دیا گیا اور اہل شہر کی کمپنی وار اور بٹالین وار گروہ بندی کی گئی۔ تقسیم ہند کے وقت قادیان کے گردو نواح سے کم از کم ستر ہزار مسلمان اپنا گھر بار چھوڑ کر قادیان میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے تھے۔ تشدد پسند ہندوؤں اور سکھوں کے جتھوں نے چاروں طرف سے گھیرا ڈال رکھا تھا۔ مسلمان کے خون سے ہولی کھیلی جا رہی تھی۔ آپ فرماتے ہیں:۔

"بندوق چلانا تو ہمیں بچپن ہی سے آتا تھا۔ منظم طریقہ سے کام کرنے اور حکم ماننے کی عادت تو ہماری گھٹی میں داخل تھی یہی وجہ تھی کہ ہم اپنے دفاعی نظام کو مکمل کرنے میں نسبتاً جلد کامیاب ہو گئے۔ اس نظام میں کوئی درجہ بندی نہ تھی ہمیں اتنا بتا دیا جاتا تھا کہ فلاں شخص تمہارا افسر ہے اور بس۔ بعد میں کچھ تربیت یافتہ فوجیوں نے بھی ہماری مدد کے لئے اپنی خدمات پیش کر دیں۔ چنانچہ ان کو سیکٹر وار کمان سونپ دی گئی۔ پھر ان کے ماتحت افسر مقرر کر دیئے گئے۔ ہمیں صرف اتنا علم ہوتا تھا کہ ہمارا اپنا افسر کون ہے جس کے حکم کی تعمیل ہم پر فرض تھی۔ ہم اور کسی کو نہیں جانتے تھے۔ باقی افسران کا ہمیں کچھ علم نہیں ہونے پاتا تھا۔ مقصد اس احتیاط کا یہ تھا کہ اگر ہم کبھی پکڑے جائیں اور ہم سے پوچھ گچھ کی جائے تو ہم بتا ہی نہ سکیں کہ ہمارے علاقے کا کمانڈر کون ہے۔ دراصل

اپنے تحفظ کے لئے یہ ایک بڑی موثر احتیاطی تدبیر تھی۔
ویسے بھی افسری ماتحتی تو تھی ہی نہیں۔ بس اتنا پتہ تھا کہ حکم
کون دے گا اور کس کو دے گا۔"

صاجزادہ طاہر احمد کھیل کے میدان میں اپنا لوہا منوا چکے تھے۔ نشانچی بھی اچھے
تھے۔ اس لئے بلا تکلف ایک دستے کے انچارج مقرر ہو گئے۔ جو کام ان کے سپرد
ہوا وہ یہ تھا کہ کسی بھی ممکنہ حملے کی صورت میں قادیان کے مرکزی حصے کی حفاظت
ان کی ذمہ داری ہو گی۔ فرماتے ہیں:۔

"یہ ایک بہت اہم اور بڑی ذمہ داری کا کام تھا لیکن میں
اس مفوضہ ڈیوٹی پر بہت خوش بھی نہیں تھا۔ میں جانتا تھا اور
اب بھی سمجھتا ہوں کہ یہ سب کچھ مجھے زیر نگرانی اور قابو میں
رکھنے کے لئے کیا گیا تھا تاکہ میں خواہ مخواہ اپنے لئے کوئی خطرہ
مول نہ لے سکوں۔

خطرے سے میری اپنی ذات کے لئے کسی قسم کا خطرہ مراد
نہیں۔ مراد یہ تھی کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ حملے کی صورت میں
میں نوجوانی کے جوش میں بچاؤ کی بجائے براہ راست ٹکراؤ کو
دعوت دے دوں۔ اس لئے قادیان کی بیرونی سرحدوں پر
جہاں خطرے کا زیادہ احتمال تھا مجھ سے بڑی عمر والوں کا تقرر
کیا گیا اور مجھے شہر کے مرکز ہی میں رکھا گیا۔ ذمہ داری تو
بہرحال ذمہ داری تھی لیکن اس محدود ذمہ داری پر میں
مطمئن نہیں تھا۔ چنانچہ وہی کچھ ہوا جس کا مجھے اندیشہ تھا یعنی
مجھے کسی دفاعی معرکے میں حصہ لینے کی حسرت ہی رہی۔ لیکن

یہ بھی نہیں کہ کچھ بھی نہ ہوا ہو۔ خطرے کے الارم بھی ہوتے رہتے تھے۔ کچھ دفاعی مشقیں بھی ہوا کرتی تھیں۔ زیادہ تر یہ مشقیں ان بندوقوں سے متعلق ہوتیں جو ہم نے قادیان میں جمع کرلی تھیں ان میں سے ایک ایک بندوق باقاعدہ سرکاری طور پر لائسنس یافتہ تھی البتہ ان کا ایک جگہ رکھنا قانون سے ہلکا سا ہی سہی لیکن کچھ نہ کچھ لفظاً انحراف ضرور تھا۔ مقصد صرف اتنا تھا کہ اگر حملہ ہو تو بروقت فوری طور پر یہ بندوقیں مل جایا کریں اور خطرہ ٹل جانے پر بلا توقف انہیں ٹھکانے لگایا جاسکے۔ بہت کم لوگوں کو علم تھا کہ یہ بندوقیں رکھی کہاں گئی ہیں۔ چنانچہ میرے مفوضہ فرائض میں یہ امر بھی شامل تھا کہ ان بندوقوں کو اپنی حفاظت میں رکھوں۔ ایک دفعہ یوں ہوا کہ خاصی بڑی تعداد میں کچھ اور بندوقیں پہنچ گئیں۔ ان کو چھپانے کے لئے میرے کمرے کے فرش میں گڑھا کھودا گیا اور بندوقیں اس میں رکھ کر اسے پر کردیا گیا اور مجھے حکم دیا گیا کہ بلا اجازت ان بندوقوں کو ہاتھ تک نہ لگاؤں اور اس سارے معاملے کو یکسر دماغ سے نکال دوں اور بھول جاؤں۔ چنانچہ کمرے کو مقفل کردیا گیا اور سب لوگ وہاں سے چلے گئے۔ جب پہلے پہل میں نے اسلحہ چھپانے کے لئے جگہ کی تلاش شروع کی تو میں نے اپنے ساتھیوں سے مشورہ طلب کیا کہ کوئی ایسی جگہ بتائیں جس کا کسی کو پتہ نہ چل سکے۔ چنانچہ طرح طرح کے مشورے دیئے

گئے بالآخر میں نے اپنے ساتھیوں سے دریافت کیا کہ کیا کوئی
ایسی جگہ بھی ہے جس کا مشورہ ابھی تک کسی نے نہ دیا ہو۔ پتہ
چلا کہ صرف ایک ایسی جگہ تھی جس کا کسی کو خیال نہیں آیا تھا
اور وہ میرے کمرے کی انگیٹھی کی چمنی تھی۔ چنانچہ فیصلہ ہوا
کہ یہ ہتھیار انگیٹھی ہی میں رکھے جائیں گے چنانچہ انگیٹھی
کو کھول کر اس کے اندر ریک بنادیئے گئے تاکہ بوقت
ضرورت بندوقوں کو آسانی سے رکھا اور نکالا جا سکے۔ یہ
احتیاط کی گئی کہ اس خوش قسمت انگیٹھی کو ہمہ وقت فعال
اور زندہ رکھا جائے اور اس میں رات دن ہلکی آگ جلتی
رہے ایک دن بادل چھائے ہوئے تھے اور بارش کا قوی
امکان تھا۔ میں نے ایک رضاکار کو حکم دیا کہ کمرے کی چھت
پر جاکر چمنی کا منہ بند کردے تاکہ بارش کا پانی چمنی کے اندر نہ
آنے پائے اور بندوقیں نقصان سے بچ جائیں۔ جس وقت
چھت پر یہ کام ہو رہا تھا تو میں نے محسوس کیا کہ ایک سکھ
عورت یہ سارا عمل بہت مشتبہ نظروں سے دیکھ رہی ہے۔
اس پر مجھے کچھ گھبراہٹ ضرور ہوئی۔ چنانچہ جتنی جلدی ہو سکا
میں نے تمام بندوقیں چمنی سے نکلوا کر اپنی آئندہ ہونے والی
خوش دامن کے ہاں پہنچادیں۔ چونکہ مجھے اپنی ڈیوٹی پر فوری
طور پر واپس پہنچنا تھا اس لئے اپنی نگرانی میں بندوقوں کو
چھپانے کا وقت تو نہیں تھا لیکن حالات کے مطابق اپنی طرف
سے انہیں چھپادیا۔ یہ بندوقیں چھپانے کی بھی ایک ہی رہی۔

بندوقیں کیا تھیں ایک انبار تھا جسے میں پلنگ پر کھلا چھوڑ آیا تھا۔ اگلے دن علی الصبح باہر نکلا تو کیا دیکھتا ہوں کہ قدم قدم پر انڈین آرمی کے سپاہی موجود ہیں۔ مرہٹوں اور ڈوگروں کے یہ بڑے ہی سخت قسم کے آرمی یونٹ تھے جن کی خاص طور پر قادیان میں تقرری کی گئی تھی۔ ان میں بہت سے سپاہی ایسے تھے جو مسلمانوں کے جانی دشمن تھے۔ جلد ہی حکومت کی طرف سے یہ اعلان بھی کر دیا گیا کہ اسلحہ کی بازیافت کے سلسلے میں ایک ایک گھر کی تلاشی لی جائے گی۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ہمارا مکان ہی ان اولین مکانوں میں سے تھا جو ان کے زیر نظر تھا اور جہاں سے انہوں نے اس تازہ ترین خانہ تلاشی کی ابتداء کی۔ میں بے حد فکر مند تھا۔ اس کی کئی وجوہ تھیں سب سے پہلے تو یہ کہ میرے کمرے کے فرش میں بندوقیں مدفون تھیں۔ دوسرے میرے کمرے کی چمنی میں لگے ہوئے رائفل کے ریک تھے جہاں بندوقیں رکھی ہوئی تھیں اور یہ امر بھی خارج از امکان نہ تھا کہ اگر وہاں سے بندوقیں ہٹا بھی لی گئی ہوں تو پھر بھی عجلت میں کوئی بندوق رہ نہ گئی ہو۔ تیسرا فکر مجھے یہ تھا کہ میرے اپنے سونے کے کمرے میں کارتوس بھی خاصی تعداد میں موجود تھے۔ جہاں میں چھروں کے سائز تبدیل کیا کرتا تھا۔ الغرض تلاشی شروع ہوئی تو سپاہی سیدھے اس کمرے میں گئے جہاں بندوقیں مدفون تھیں اور جاتے ہی کمرے کے فرش کو کھودنا شروع کر دیا۔

لیکن کچھ بھی تو نہیں ملا۔ بندوقیں سب غائب تھیں۔ میں خود بھی حیران تھا کہ یہ کیا ماجرا ہے؟ درحقیقت ہوا یوں اور جس کا مجھے بعد میں پتہ چلا کہ کچھ عرصہ پہلے ان مدفون بندوقوں کی کہیں اوراچانک ضرورت پڑ گئی تھی اور جب انہیں کمرے کا فرش کھود کر نکالا گیا تو میں وہاں موجود نہیں تھا بلکہ دوسری بندوقوں کو سنبھالنے کے لئے گھر سے باہر گیا ہوا تھا۔ یعنی میری غیر حاضری میں بندوقیں غائب ہو چکی تھیں۔ یہ مخبری ہمارے ایک ہندو ہمسائے نے کی تھی جس نے میرے کمرے میں کھدائی کی آواز سن کر انڈین آرمی کو مطلع کر دیا تھا کہ کمرے میں کچھ دفن کیا جا رہا ہے۔ کمرے کے فرش کی تلاشی کے بعد ناکام ہو کر سپاہیوں نے سیدھا میرے کمرے کی چمنی کا رخ کیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس سکھ خاتون نے واقعی فوج کو جا بتایا تھا۔ کہ ہم لوگ چمنی میں کچھ ردوبدل کر رہے ہیں۔ چنانچہ ایک سپاہی چھت پر چڑھ کر چمنی میں اتر گیا۔ لیکن وہاں بھی سوائے پچیس کارتوسوں کے ایک ڈبے کے کچھ نہ ملا۔ چونکہ ہمارے پاس لائسنس تھا اس لئے قانوناً ہمیں ان کارتوسوں کو رکھنے کا حق حاصل تھا۔ یہ اور بات ہے کہ ان کو رکھنے کے لئے جس جگہ کا ہم نے انتخاب کیا تھا وہ انوکھی اور عجیب وغریب ضرور تھی۔ اب سپاہی میرے سونے کے کمرے میں گئے جہاں میری میز کی دراز میں کارتوسوں کے ڈبے پڑے تھے۔ ایک سپاہی نے ایک دراز کو کھولا ایک ڈبہ

اٹھایا اسے زور سے ہلایا اور کہنے لگا۔ "اخروٹ ہیں اخروٹ" اور دروازکو بند کردیا۔

بس صحیح معنوں میں یہی ایک نازک لمحہ تھا جس کا ان دنوں مجھے سامنا کرنا پڑا اگرچہ قادیان چاروں طرف سے حملہ آوروں میں گھرا ہوا تھا لیکن جہاں میری ڈیوٹی تھی وہاں کبھی براہ راست حملہ نہیں ہوا"۔

انہی دنوں صاحبزادہ طاہر احمد نے ایک خط میں جو انہوں نے اپنی آنٹی کو لکھا تھا اپنے اور اپنے ساتھیوں کے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے لکھا تھا:

"یہ قادیان کے دفاع کا معاملہ ہے۔ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہمیں اس خدمت کا موقع مل رہا ہے۔اس کے لئے ہم نہ صرف مرنے کے لئے تیار ہیں بلکہ موت کا خوف بھی دل سے نکال چکے ہیں۔ بے شک ہم سخت خطرناک حالات میں رہ رہے ہیں۔ لیکن اس پر ہمیں کسی قسم کی گھبراہٹ یا افسوس نہیں ہے۔ نہ ہی ہم سمجھتے ہیں کہ ہم کوئی بڑی قربانی دے رہے ہیں یہ جان تو اللہ تعالیٰ کی دین ہے۔ جان دی دی ہوئی اسی کی ہے اور ہم تو یہ احساس تک دل سے نکال چکے ہیں کہ ہم اس دنیا میں کبھی اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں سے مل سکیں گے"۔

آگے چل کر آپ نے لکھا۔

"کم وبیش ہر تین ہفتے کے بعد ہم میں سے کچھ لوگوں کو واپس جانے کے لئے فراغت مل جاتی ہے اور انہیں پاکستان

بھیج دیا جاتا ہے۔ یہ لوگ جنہیں یہاں سے واپسی کا حکم ملتا ہے۔ وہ ساری رات اس غم میں رو رو کر گذارتے ہیں کہ اب انہیں قادیان چھوڑ کر واپس جانا پڑ رہا ہے"

پھر فرماتے ہیں:

"میں نے خط میں اتنا کھل کر اور لگی لپٹی رکھے بغیر اپنے جذبات کا اظہار کیا تھا اور میری آنٹی اس سے اتنا متاثر ہوئیں کہ وہ خط کی نقل جماعت احمدیہ کے اخبار روزنامہ الفضل کے ایڈیٹر صاحب کے پاس لے گئیں۔ آنٹی کا خیال تھا کہ اخبار کے قارئین بہت شوق سے جاننا چاہیں گے کہ چاروں طرف سے خطرات میں گھرے ہوئے ایک سترہ اٹھارہ سالہ نوجوان کی سوچ کا انداز کیا ہے۔ لیکن ایڈیٹر نے یہ کہہ کر خط چھاپنے سے انکار کر دیا کہ یہ خط تو بہت ہی بے لاگ اور بے باک ہے۔ سالوں بعد جب میں اس خط کے مندرجات کو بالکل بھول چکا تھا۔ آنٹی کو یہ خط ایک ڈبے میں پڑا مل گیا۔ انہوں نے مجھے دکھایا تو اپنے لکھے ہوئے اس خط کو پڑھ کر مجھے بھی حیرت ہوئی۔ لیکن اس خط کے بعض بہت ہی غیر متوقع نتائج نکلے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ خط (حضرت) خلیفہ ثانیؓ کے ملاحظے میں بھی آیا ہوگا جسے پڑھ کر وہ ضرور فکر مند ہوئے ہوں گے۔ وہ مجھے اور میری طبیعت کو خوب جانتے تھے اس لئے عین ممکن ہے انہیں خیال آیا ہو کہ میں کہیں جان بوجھ کر اپنی زندگی کو خطرے میں ڈال کر بلا سبب موت کو دعوت نہ

دے دوں چنانچہ ہوا یہ کہ ایک مہینے کے اندر اندر مجھے قادیان سے لاہور بلوا لیا گیا۔ مجھے خوب یاد ہے کہ اس فیصلے سے مجھے کتنا دکھ ہوا تھا۔ میرا پہلا ردعمل تو یہ تھا کہ مجھے قادیان سے واپس اس لئے بلایا گیا ہے کہ شاید میرے بزرگوں کو مجھ میں کوئی خامی نظر آئی ہے۔ جس کی مجھے سزا دی جارہی ہے یا پھر انہوں نے مجھے اپنے مفوضہ فرائض کی ادائیگی کا اہل نہیں سمجھا۔ بہرحال میری زندگی کے یہ نہایت تکلیف دہ لمحات تھے"۔

خدام الاحمدیہ کی تنظیم کو اب خود حفاظتی کی خاصی ٹریننگ مل چکی تھی یہی وجہ ہے کہ تقسیم ملک کے وقت اس تنظیم نے بے شمار مسلمانوں کی جانیں بچائیں۔ لیکن غور کریں تو اصل میں یہ کارنامہ (حضرت) خلیفہ ثانیؓ کی دوراندیش نگاہوں ہی کا مرہون منت تھا۔ پنجاب کے دیہات میں مسلمانوں کا قتل عام ہو رہا تھا۔ پاکستان کی طرف ہجرت کرنے والے قافلوں پر حملے جاری تھے۔ لوٹ مار اور قتل وغارت کا بازار گرم تھا۔ جو مسلمان حملہ آوروں کے ہتھے چڑھ جاتے بھیڑ بکریوں کی طرح ذبح کر دیئے جاتے۔ یہ احمدی رضا کاروں ہی کا دل گردہ تھا کہ وہ اپنی جان پر کھیل کر قادیان کے قرب وجوار میں تیس تیس میل دور تک واقع دیہات کے دورے کرتے اور وہاں کے رہنے والے مسلمانوں کو حملہ آوروں سے بچانے کی اپنی سی کوشش میں اپنی نیندیں حرام کر رہے تھے۔ پھر یہ بھی ہوا کہ اتنے بڑے ہنگامے میں کوئی بھی تو بھوکوں نہیں مرنے پایا۔ قادیان جو محض بیس ہزار نفوس پر مشتمل ایک چھوٹا سا قصبہ تھا یہاں اب اسی ہزار سے زائد پناہ گزین جمع تھے۔ ان کو خوراک مہیا کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ فرماتے ہیں:

"میرے والد محترم (حضرت) خلیفہ ثانیؓ نے پہلے سے حکم دے دیا تھا کہ ایک جلسہ سالانہ کی بجائے دو تین جلسوں کے لئے گندم خرید کر سٹاک کرلی جائے انہیں اندیشہ تھا کہ پناہ گزینوں کا ایک سیلاب آنے والا ہے جن کے لئے خوراک کی ضروت ہوگی۔" لیکن اب الٹی گنگا بہہ رہی تھی یعنی اب گندم سے بھرے ہوئے ٹرک قادیان آنے کی بجائے قادیان سے امرتسر جیسے بڑے بڑے شہروں کی طرف جارہے تھے۔ ان دنوں مسلمان اخبارات نے بڑی سچائی سے اس بروقت امداد کا کھل کر اعتراف کیا جو جماعت احمدیہ کی طرف سے مسلمانوں کو اس موقع پر دی جارہی تھی انہوں نے صاف لکھا کہ یہ بڑے بڑے شہر نہیں ہیں جو اس وقت اپنے مسلمان بھائیوں کی مدد کے لئے آگے آئے ہیں بلکہ یہ ایک دورافتادہ گاؤں قادیان کے رہنے والے لوگ ہیں جنہیں ہم ماضی میں کافر کہتے رہے ہیں۔ جو اس نازک وقت میں بے قرار ہو کر ہماری مدد کے لئے پہنچے ہیں۔ ان دنوں سونے کی مہلت کم ہی ملتی تھی۔ دو ہی کام تھے ٹرکوں پر گندم لادنا یا پھر پہرہ کی ڈیوٹی"

اگست ۱۹۴۷ء جماعت احمدیہ کے لئے ایک غیر متوقع مصیبت بن کر آیا۔ قادیان اور اس کا نواحی علاقہ اب ہندوستان میں شامل کیا جاچکا تھا۔ بڑے غور و فکر کے بعد (حضرت) خلیفہ ثانیؓ نے فیصلہ فرمایا کہ اب قادیان سے انخلا ناگزیر ہوگیا ہے یعنی وہی قادیان جہاں جماعت احمدیہ کے بانی پیدا ہوئے' پلے بڑھے اور وفات کے بعد دفن ہوئے۔ وہی قادیان جو جماعت کا مقدس مرکز اور رہ

احمدی کے دل کی دھڑکن ہے۔

اب اگرچہ جماعت کے مستقبل کا پاکستان سے ایک گہرا تعلق قائم ہو چکا تھا یعنی وہ ملک جس کی تخلیق میں جماعت احمدیہ نے اتنا بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا اور اتنی قربانیاں دی تھیں بایں ہمہ (حضرت) خلیفہ ثانیؓ نے بڑے وثوق سے جماعت کو یقین دلایا کہ جماعت ایک نہ ایک دن قادیان ضرور واپس جائے گی۔۳۱۰ اگست کو حکومت کی طرف سے قادیان کی مساجد۔ مدارس۔ دفتری عمارات اور نجی مکانات کو سربمہر کر کے مقفل کر دیا گیا تھا۔ قادیان کے احمدی دوسرے مسلمانوں کی طرح پاکستان میں پناہ لینے کے لئے ہجرت کر رہے تھے۔ چنانچہ ٹرکوں کا ایک عظیم قافلہ پاکستان کے فوجی دستوں کی حفاظت میں قادیان سے روانہ ہوا۔ جانے والوں نے جاتے وقت عجلت میں تھوڑا بہت ضرورت کا جو سامان ہاتھ لگا ساتھ لے لیا۔ یہ قافلہ روانہ تو ہو گیا لیکن پناہ گزینوں کے اس قافلے کو نوزائیدہ مملکت پاکستان کی سرحد تک قدم قدم پر حملہ آور جتھوں کا سامنا کرنا پڑا۔

قادیان خالی ہو گیا۔ صرف تین سو تیرہ احمدی پیچھے رہ گئے۔ یہ وہ درویش تھے جنہوں نے خطرات کی پروانہ کرتے ہوئے اپنی خدمات حفاظت مرکز کے لئے پیش کردی تھیں اور یہ عہد کیا تھا کہ جانے والوں کی واپسی تک وہ جماعت کے مقامات مقدسہ اور املاک کی حتی الامکان حفاظت اور دیکھ بھال کی کوشش کریں گے۔ عجیب بات یہ ہے کہ ان مجاہدین کی تعداد بھی تین سو تیرہ ہی تھی جو (حضرت) محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی عظیم قیادت میں بدر کے معرکے میں شامل ہوئے تھے۔

پاکستان پہنچ کر احمدی پناہ گزین ملک کے طول و عرض میں پھیل گئے اب ان کی نئی مادر ملک اور پناہ گاہ یعنی پاکستان کو ان کے ہنر تجربے اور علمی اور تعلیمی صلاحیتوں کی اشد ضرورت تھی۔

(حضرت) خلیفہ ثانیؓ پہلے ہی پیش گوئی کر چکے تھے کہ احمدیوں کو قادیان چھوڑنا پڑے گا۔ ان کی یہ رؤیا جماعت کے روزنامہ الفضل دسمبر ۱۹۴۱ء کی ایک اشاعت میں شائع بھی ہو چکی تھی لیکن ساتھ ہی انہیں یہ یقین بھی تھا کہ وہ ضرور قادیان واپس آئیں گے۔ آپ نے قبل از وقت یہ بھی بتادیا تھا کہ اس اثناء میں وہ ایک نیا شہر آباد کریں گے جو ایک سرسبز اور شاداب علاقے میں ہو گا جہاں بہتے چشمے، ہرے بھرے درخت اور جگہ جگہ پہاڑیاں ہوں گی۔

لیکن دریائے چناب کے مغربی کنارے پر واقع ۱۰۳۴ ایکٹر پر مشتمل خالی اراضی کا جو قطعہ جماعت احمدیہ نے اس مقصد کے لئے قیمتاً خریدا وہ (حضرت) خلیفہ ثانیؓ کی الہامی پیشگوئی سے پوری مطابقت نہیں رکھتا تھا۔ وہاں درخت تھے نہ پانی اور زمین بھی شور آلود تھی۔ اس اجاڑ بیابان میں سانپوں، بچھوؤں، گیدڑوں اور بھیڑیوں کا راج تھا۔ اس کی اس حالت کو دیکھ کر ایک احمدی مضمون نگار نے اسے ایک چیختی ہوئی اجاڑ تنہائی سے تشبیہ دی تھی۔

یہ بے آب و گیاہ بنجر وادی دریائے چناب کے کنارے چنیوٹ سے چھ میل دور لاہور سے سرگودھا جانے والی سڑک پر واقع تھی۔ کم و بیش تین میل لمبی ایک میل چوڑی اور شمال کی جانب ایک سیاہ پتھریلے پہاڑ سے گھری ہوئی تھی۔ اس جگہ میں کچھ خوبیاں بھی تھی۔ دریائے چناب اس کے پہلو میں بہہ رہا تھا اور لاہور سے سرگودھا جانے والی ریلوے لائن اس نئے خرید کردہ قطعہ اراضی کے عین وسط میں سے گذرتی تھی جس سے یہ امید ضرور بندھتی تھی کہ آئندہ کبھی نہ کبھی آمدورفت میں کچھ سہولت ضرور رہے گی۔ لیکن اس کی سب سے بڑی خوبی اس کی تنہائی تھی آبادیوں سے دور یہ ایک ایسی پناہ گاہ تھی جس کے آباد کار دنیا و مافیہا سے الگ تھلگ اپنی مرضی کی ایک بستی بسا سکتے تھے۔ چنانچہ (حضرت) خلیفہ ثانیؓ

نے فرمایا:-

"ہم نے اس لق ودق بیابان اور ویرانے کو شہروں اور آبادیوں پر اس لئے ترجیح دی ہے تاکہ یہاں کے باسیوں میں اپنے تشخص' اپنی شناخت اور اپنے فرائض کی ادائیگی کا شعور بیدار رہو۔ اور انہیں خالص اخلاقی اور روحانی تناظراور ماحول میں اپنی اعلیٰ صلاحیتیں اجاگر کرنے کا موقع ملے۔ اور انہیں تعلیم وتربیت کی اعلیٰ روحانی آب وہوااور ارفع مواقع مہیا کئے جائیں جو کسی بھی صحت مند معاشرے کے قیام اور نشوونما کے لئے بے حد ضروری ہیں۔"

یہ وادی سطح سمندر سے تقریباً ۶۰۰ فٹ اور اردگرد کے میدانی علاقے سے کم وبیش بیس فٹ بلند ہے۔ اب ان لوگوں کو بالکل اسی طرح کی جائے پناہ مل گئی جس طرح کی ایک ملتی جلتی جائے پناہ خدا تعالیٰ نے (حضرت) مسیح ناصری (علیہ السلام) اور ان کی والدہ محترمہ (حضرت) مریم (علیہا السلام) کو عطا کی تھی اور جس کا ذکر قرآن (مجید) میں اس طرح کیا گیا ہے۔

"اور ہم نے ابن مریم اور اس کی ماں کو ایک نشان بنایا اور انہیں ایک اونچی جگہ پر پناہ دی جس میں سرسبز وادیاں تھیں اور بہتے ہوئے پانیوں کے چشمے"۔

عربی زبان میں اس قسم کی سطح مرتفع کو ربوہ کہتے ہیں اس لئے (حضرت) خلیفۃ المسیح الثانیؓ نے فیصلہ فرمایا کہ اس تاریخی نسبت سے اس نئے شہر کا نام ربوہ ہوگا۔ آپ نے جب اس جگہ کو پہلی بار دیکھا تو فرمایا۔

"ہماری پناہ گاہ کا جو نقشہ مجھے خواب میں دکھایا گیا تھا اس

سے یہ جگہ کئی قسم کی مشابہت رکھتی ہے۔ مثال کے طور پر یہ جگہ اونچی بھی ہے۔ اور یہاں جگہ جگہ پہاڑیاں بھی موجود ہیں لیکن یہ ایک ویران اور سنسان میدان ہے۔ اس کے برعکس جو جگہ میں نے خواب میں دیکھی تھی وہ بڑی ہی سرسبز وشاداب تھی۔ امید ہے کہ اگر اللہ نے توفیق دی اور ہم نے پوری کوشش کی تو انشاء اللہ یہ خشک اور چٹیل میدان بھی ایک دن ایک سرسبز اور شاداب وادی میں تبدیل ہو جائے گا"۔

چنانچہ جلد ہی نئے شہر کا نقشہ بھی متعلقہ سرکاری محکمے سے منظور ہو کر آ گیا۔ اور ۱۹ ستمبر ۱۹۴۸ء کو احمدی رضا کاروں کے ہراول دستے نے اللہ کا نام لے کر اس بے آب و گیاہ ویرانے میں ڈیرے ڈال دیئے۔ کچھ خیمے نصب کر دیئے گئے اور اس خیمہ بستی کے ساتھ ہی اس نئے شہر کی آباد کاری کے کام کا آغاز ہو گیا۔ یہ امر دلچسپی سے خالی نہ ہو گا کہ آباد کاروں کے اس ہراول دستے میں صاحبزادہ طاہر احمد بھی شامل تھے۔ پہلے گارے کی کچی اینٹوں کے مکان بنے۔ کباڑیوں سے پرانے مکانوں کی پرانی کھڑکیاں اور دروازے خریدے گئے اور آہستہ آہستہ یکے بعد دیگرے چھوٹے چھوٹے سادہ اور حقیر سے کچے کوٹھے اس لق و دق صحرا کے سینے پر نمودار ہونے شروع ہو گئے۔ اور جلد ہی شہر کے تین ہزار رہائشی پلاٹوں میں زندگی کی حرکت نظر آنے لگی۔

لیکن بایں ہمہ روزمرہ کی زندگی کیا تھی؟ بے حد سادہ۔ ضروریات زندگی سے معرا۔ صبح کو شام کرنا بڑا ہی جان جوکھوں کا کام تھا۔ فی خاندان جو سامان دیا گیا وہ بھی قابل دید تھا یعنی دو چارپائیاں، ایک لالٹین، ایک بالٹی اور بس۔ پانی کی فراہمی

نہ ہونے کے برابر تھی۔ ماہرین ارضیات نے اپنے ایک جائزے میں اس رائے کا اظہار تو کیا تھا کہ زیر زمین پانی موجود ہے لیکن ابھی اس جنس گراں مایہ کی تلاش جاری تھی۔ فی الحال کوئی کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ سات ماہ کی صبر آزما جدوجہد کے بعد جاکر کہیں اپریل ۱۹۴۹ء میں ایک مقام پر پانی دریافت ہوا۔ چنانچہ فوراً پہلا کنواں کھودا گیا۔ شہریوں کا حوصلہ قائم رکھنے کے لئے لاؤڈ سپیکر کا انتظام بھی کیا گیا جس کے ذریعے اعلانات کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ ایک رات کا ذکر ہے (حضرت) خلیفۃ المسیح الثانیؓ اپنے کمرے میں تشریف فرما تھے۔ اچانک لاؤڈ سپیکر پر کھڑکھڑاہٹ سی پیدا ہوئی اور پھر ایک نوجوان کی بڑی ہی ولولہ انگیز اور پُر اعتماد آواز سنائی دی۔ کوئی صاحب ایک نظم بڑی خوش الحانی سے اور بڑے ڈرامائی انداز میں پڑھ رہے تھے نظم کچھ اس طرح تھی۔

"ہماری محنت کا ثمر ملنے والا ہے۔ کامیابی ہمارا مقدر بن چکی ہے۔ آؤ ہم سب مل کر، کچھ اور، تھوڑا سا اور زور لگائیں۔

نظم کو سن کر (حضرت) خلیفہ ثانیؓ بہت متاثر ہوئے اور فرط مسرت سے بے تاب ہو کر کمرے سے باہر نکل آئے تاکہ نظم کو آسانی سے سن سکیں۔ نظم سنی تو فرمایا "اس موقع پر ہمیں ایسے ہی حوصلہ افزا ولولہ انگیز اور پُر عزم منظوم کلام کی ضرورت ہے"۔ پھر فرمایا "نہ جانے یہ نظم پڑھ کون رہا ہے" ان کی بیگم نے جواب دیا "کیا آپ آواز نہیں پہچانتے؟ یہ تو طاہر احمد ہیں جو نظم پڑھ رہے ہیں"۔ (حضرت) خلیفہ ثانی یہ سن کر بہت مسرور ہوئے۔ آپ کچھ کہنا چاہتے تھے لیکن فرط جذبات سے آواز گلوگیر ہوگئی۔ کچھ بھی تو نہ کہہ سکے اور واپس اپنے کمرے میں چلے گئے۔ سرسری نظر سے دیکھنے والا تو شاید یہ سمجھے کہ آپ محبت اور

تشکر کے جذبات کو چھپانا چاہتے تھے اور ایک طرح سے یہ بات ٹھیک بھی تھی۔ دراصل (حضرت) خلیفہ ثانیؓ اس راز سے بخوبی واقف تھے جس کے متعلق (حضرت) ام طاہر کے سامنے ان کی ایک سہیلی نے عہد باندھا تھا کہ وہ اس راز کو ظاہر نہیں کرے گی۔

8

سفر لندن

سرسبز وادیوں اور بہتے ہوئے چشموں والی پناہ گاہ کا جو نظارہ (حضرت) خلیفہ ثانی کو خواب میں دکھایا گیا تھا ۱۹۵۴ میں اس کی تعبیر بھی کچھ کچھ نظر آنی شروع ہو گئی تھی۔ اب ربوہ ایک اچھے خاصے قصبے کی شکل اختیار کر چکا تھا۔ دل یقین اور اعتماد سے پُر تھے۔ چہروں پر عزم کی روشنی تھی۔ ہر طرف گہما گہمی تھی۔ ربوہ کی آبادی اب ۵۰۰۰ تک پہنچ چکی تھی اور سالانہ جلسے کے موقع پر تو یہ تعداد دو لاکھ پچاس ہزار تک بھی پہنچ جایا کرتی تھی۔ گارے اور کچی اینٹوں سے بنے ہوئے عارضی گھروندوں کی جگہ اب صاف ستھرے پُر رونق دو منزلہ پختہ مکانات اور کچے راستوں کی جگہ پختہ کوچے نظر آنے لگے تھے۔ سڑکوں پر دو رویہ درخت تھے۔ شہر کے وسط میں مسجد مبارک دعوت نظارہ دے رہی تھی یہ ایک خوبصورت اور سفید براق وسیع عمارت تھی جس میں بیک وقت پانچ ہزار نمازی نماز ادا کر سکتے تھے۔

یہ اسی مسجد کا واقعہ ہے مارچ کا مہینہ تھا اور ۱۹۵۴ء کا سال (حضرت) خلیفہ ثانی عصر کی نماز پڑھا رہے تھے جب ایک غیراز جماعت نوجوان نے جو پہلی صف میں نماز ادا کرنے کے لئے کھڑا تھا، عقب سے ایک تیز دھار خنجر سے (حضرت) خلیفہ ثانیؓ کی گردن پر وار کیا۔ حملہ آور کو پکڑ کر پولیس کے حوالے کردیا گیا۔ زخم سے خون بے تحاشا بہہ رہا تھا جسے کسی نہ کسی طرح فوری مرہم پٹی سے بند کردیا گیا۔ باوجود زخمی ہونے کے (حضرت) خلیفہ ثانی مسجد مبارک سے اپنی رہائش گاہ تک سہارا لے کر لیکن پیدل چل کر پہنچ گئے۔ قاتلانہ حملہ کرنے والے نوجوان کو عدالت سے لمبی قید کی سزا ہو گئی۔ زخم گہرا اور شدید تھا۔ بظاہر جلد مندمل بھی ہو گیا۔ لیکن اس سے (حضرت) خلیفہ ثانیؓ کی صحت بری طرح متاثر ہوئی۔ اب ان کی عمر بھی پینسٹھ سال سے تجاوز کرچکی تھی۔ اگرچہ پہلے بھی ان کی عام صحت تو کوئی اتنی اچھی نہیں تھی اور نہ ہی وہ بہت مضبوط جسم کے مالک تھے اس پر مستزاد یہ کہ انہیں مسلسل محنت شاقہ کی عادت تھی جس میں اب انہیں دقت محسوس ہو رہی تھی۔ قاتلانہ حملے پر دو سال گذر چکے تھے۔ مقامی علاج سے صحت بحال نہیں ہو رہی تھی۔ چنانچہ فیصلہ کیا گیا کہ لندن کے ماہر ڈاکٹروں سے مشورہ کیا جائے خاندان کے وہ افراد جو اس سفر میں (حضرت) خلیفہ ثانی کے ہمراہ گئے ان میں صاحبزادہ طاہر احمد بھی شامل تھے۔ (حضرت) خلیفہ ثانی نے اپنے تمام بیٹوں کو اشاعت احمدیہ کی خدمت کے لئے وقف کردیا ہوا تھا صاحبزادہ طاہر احمد اپنی یونیورسٹی کی تعلیم کو درمیان ہی میں چھوڑ کر واپس آچکے تھے اور خدام الاحمدیہ میں ہو کر ایک ذیلی تنظیم سے مصروف عمل تھے۔ جلد ہی انہوں نے ثابت کردکھایا کہ وہ نہ صرف ایک اچھے منتظم ہیں بلکہ غیر معمولی طور پر سخت محنت کے عادی بھی ہیں۔ ان کے ایک دوست کہتے ہیں:۔

"وہ اکثر ہمارے ہاں آتے جاتے رہتے۔ ان کے آنے سے ہمیں بے حد مسرت ہوتی۔ جماعتی کاموں کی خاطر وہ ملک کے طول و عرض میں دور دور تک دورے کرتے لیکن یوں نہیں کہ لدے پھندے سفر کر رہے ہوں۔ سفر میں ہمیشہ سادگی ملحوظ خاطر ہوتی اور کبھی کبھی تو ایسا بھی ہوتا کہ ڈرائیور کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھا ہوا ہے اور یہ خود کار ڈرائیو کر رہے ہیں۔ ہمارے ہاں اکثر رات گئے پہنچتے۔ ہم لوگ سو رہے ہوتے اور ہمارے جاگنے سے پہلے ہی صبح سویرے فجر کے وقت چلے بھی جاتے اس طرح ہمیں ان سے ملنے کا موقع کبھی کبھار ہی ملتا"۔

(حضرت) خلیفہ ثانی علاج کی غرض سے انگلستان کے لئے روانہ ہوئے تو انہوں نے صاحبزادہ طاہر احمد کو پہلے سے ہی انگلستان بھجوا دیا کہ وہ وہاں جا کر ان کی آمد کا انتظار کریں۔ انہوں نے اس موقع سے خوب فائدہ اٹھایا اور راستے میں سوئٹزر لینڈ۔ جرمنی اور دیگر ممالک میں جہاں جہاں بھی احمدی رہ رہے تھے ان سے ملے اور نہایت بے تکلفی کے ماحول میں ان سے ملاقاتیں کیں۔

لندن کے طبی ماہرین کی رائے حوصلہ افزا نہیں تھی۔ چاقو کی نوک (حضرت) خلیفہ ثانی کی گردن میں ٹوٹ کر ان کی شہ رگ میں پیوست ہو چکی تھی۔ اور خطرہ مول لئے بغیر اس کا نکلنا آسان نہ تھا۔ بہر حال ڈاکٹری مشورہ یہی تھا کہ ابھی اور آرام کیا جائے۔ اندیشہ تھا کہ اگرچہ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ عام صحت تو آہستہ آہستہ بحال ہو جائے گی لیکن مکمل صحت کے بعد بھی اب (حضرت) خلیفہ ثانی پہلی سی مسلسل محنت شاقہ نہیں کر سکیں گے۔

چنانچہ انہوں نے فیصلہ کیا کہ انگلستان میں ٹھہرنے کی بجائے واپس ربوہ چلے

جائیں تاکہ خلافت کی عظیم ذمہ داریوں سے کماحقہ عہدہ برآ ہو سکیں۔

صاحبزادہ طاہر احمد کو جو اب چھبیس برس کے ہو چکے تھے انگلستان ہی میں ٹھہر جانے کا فیصلہ کیا گیا۔ اگرچہ آغاز میں خیال یہی تھا کہ وہ اپنے والد کے ہمراہ پاکستان واپس آجائیں گے وہ خود کہتے ہیں۔

"میرا تعلیمی ریکارڈ چنداں حوصلہ افزا نہیں تھا اس لئے لندن یونیورسٹی میں معمول کے مطابق تو داخلہ مشکل تھا لیکن خوش قسمتی سے سر ریلیف ٹرنر جو سکول آف افریقن اینڈ اورینٹل سٹڈیز کے ڈائریکٹر تھے میرے والد ماجد کے دوست تھے۔ انہوں نے داخلے کی شرائط کو نرم بلکہ حذف کرتے ہوئے مجھے داخلہ دے دیا۔ اس طرح میں لندن یونیورسٹی کا طالب علم بن گیا"۔

لیکن بد قسمتی سے میرے طالب علمانہ لیل و نہار ویسے کے ویسے رہے۔ نصاب کے مطابق جو کچھ مجھے پڑھنا اور سیکھنا چاہئے تھا اس کی بجائے دیگر دلچسپیاں بدستور میری توجہ کا مرکز بنی رہیں۔ عام لوگوں سے میل ملاپ ہو یا شہروں دیہاتوں کی سیر، جزائر برطانیہ کی سیاحت ہو یا تعلقات عامہ اور سکواش کا کھیل۔ میں نے نصابی سرگرمیوں کے علاوہ ہر کام میں حصہ لیا۔ ان دنوں میں اپنی کلاس سے اکثر غیر حاضر رہتا۔ یوں لگتا تھا جیسے میری غیر حاضری کو قانونی طور پر تسلیم کر لیا گیا ہو۔

یہ کہنا تو شاید صحیح نہ ہو کہ سب لوگ مجھے پسند کرتے تھے لیکن اتنا ضرور تھا کہ میں اپنے جملہ ہم مکتب ساتھیوں سے

اچھی طرح متعارف ہو گیا تھا۔ کتنے اچھے تھے وہ دن، کتنے دوست ملے اور کتنی خوشیاں سمیٹیں۔ اس کا اندازہ کون کر سکتا ہے"

سوتے وقت بی بی سی کی عالمی خبریں اور لکسمبرگ ریڈیو کے پروگرام سنتے۔
انہی دنوں صاحبزادہ طاہر احمد نے ایک کار بھی خریدی۔ اپنے والد کی طرف سے جو جیب خرچ ملتا وہ کھانے اور رہائش کے لئے بمشکل کفایت کرتا۔ رہائش کیا تھی کرائے کا ایک کمرہ۔ کھانا وہ خود پکاتے اور بس۔ یا کبھی کبھار فارغ وقت میں اِدھر اُدھر کے معمولی اخراجات کی گنجائش بھی نکل ہی آتی۔ لیکن کار کا خریدنا ان کے بس کا روگ نہ تھا۔ ایک دن وہ اپنے دوستوں سے رائل ایئر فورس کالج میں جو کرینول میں واقع تھا ملنے گئے۔ وہیں ایک طالب علم سے پتہ چلا کہ ایک کار بِک رہی ہے۔ یہ ایک سال خوردہ کار تھی۔ تیئس سال پرانی۔ دس ہارس پاور والی۔ ۴۲ پاؤنڈ میں سودا ہو گیا۔ اور طاہر احمد کار کے مالک بن گئے۔ لیکن یہ سودا خاصہ مہنگا ثابت ہوا۔ جلد ہی پتہ چل گیا کہ کار پندرہ پونڈ سے زیادہ قیمت کی نہیں تھی۔ وہ خود کہتے ہیں:۔

"یہ ایک عجیب وغریب قسم کی کار تھی اگرچہ مجھے کسی لحاظ سے بھی کاروں کا مکینک یا مستری نہیں کہا جا سکتا تھا لیکن یہ اس کار ہی کا کارنامہ تھا کہ اس نے آہستہ آہستہ مجھے کار کا مستری بنا کر ہی چھوڑا۔ اپنے دو ساتھیوں سید محمود احمد ناصر جو بحیثیت مشنری زیر تربیت تھے اور افضل باری کے ہمراہ میں نے یورپ کا کونہ کونہ دیکھ مارا۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ کبھی کبھی ہمیں اس کار کو دور دور تک

دھکیل کر بھی لے جانا پڑتا تھا"۔

اپنے ہم مکتب یونیورسٹی طلباء کے بیان کے مطابق وہ ایک بہت اچھے ساتھی اور دوست سمجھے جاتے تھے ان کے ایک ہم جماعت کہتے ہیں:۔

"ان کی آنکھوں سے مروت اور اپنائیت ٹپکی پڑتی تھی۔ وہ ذرا ذرا سی بات پر مسکرا سکتے تھے۔ مسرتیں اور مسکراہٹیں ان کی شخصیت کا حصہ بن چکی تھیں۔ واقعی وہ بڑے ہمدرد انسان تھے"۔

ایک اور طالب علم ساتھی کا بیان ہے۔

"ان کی مصاحبت میں گذرنے والے لمحات بڑے ہی پُرلطف اور مزیدار ہوا کرتے تھے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ انہیں بات بات پر اکتا دینے والے لطیفے سنانے کی عادت تھی۔ نہیں ہرگز نہیں۔ بات کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ان کی موجودگی ہی اس امر کی ضمانت تھی کہ ہم بور نہیں ہونے پائیں گے"۔

آفتاب احمد خان جو بعد میں مختلف ممالک میں پاکستان کے سفیر رہے اور ان دنوں ایک نوجوان سفارتکار کے طور پر پاکستان کے ہائی کمیشن میں کام کر رہے تھے کہتے ہیں۔ "ایک اتوار کا ذکر ہے صاحبزادہ طاہر احمد ایک دن ہمارے ہاں دوپہر کے کھانے پر تشریف لائے۔ ہماری بیٹی ان دنوں صرف ڈیڑھ سال کی تھی۔ کھانا کھا چکے تو کہنے لگے۔ "دیکھو مجھے یہیں بچی کے پاس چھوڑ دو اور آپ دونوں میاں بیوی کہیں دور گھومنے پھرنے نکل جاؤ۔ میں جانتا ہوں تم دونوں کو اس کے لئے فراغت نہیں ملتی"۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ ہم نے اس پیش کش کو جو ہمارے دل کی آواز تھی بلا تامل قبول کرلیا اور ہم دونوں میاں بیوی فوراً ہی سیر کے لئے

نکل کھڑے ہوئے"۔

ان کی شخصیت کا ایک رخ اور بھی تھا جس سے ان کے صرف چند ایک ہم عصر ہی واقف تھے۔ ان کا ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جو میڈا دیل میں واقع تھا یہ ان کا سونے کا کمرہ بھی تھا اور رہنے کا بھی۔ اس کمرے کی تنہائیوں میں وہ فکر سخن کرتے یعنی اردو زبان میں شعر کہتے۔ ان دنوں ٹیپ ریکارڈر کی ایجاد نئی نئی تھی۔ شروع شروع میں تو ٹیپ ریکارڈر اچھے بھلے دفتری ٹائپ رائٹر کی طرح اچھے بھاری بھر کم اور وزنی ہوا کرتے تھے۔ ان کے دوست انور کاہلوں ایسا ہی ایک ٹیپ ریکارڈر پاکستان جاتے وقت اپنے ساتھ لے جا رہے تھے۔ انہوں نے آپ سے خواہش ظاہر کی کہ اپنی کچھ نظمیں اور غزلیں ریکارڈ کروا دیں تاکہ ربوہ جا کر وہ ان اشعار کو (حضرت) خلیفہ ثانی کی خدمت میں پیش کر سکیں۔

انور کاہلوں پاکستان جانے ہی والے تھے کہ ایک دن اتفاقاً جناب چوہدری محمد ظفراللہ خاں ان سے ملنے کے لئے آ گئے۔ انور کاہلوں نے پہلے تو اپنے ٹیپ ریکارڈر سے چوہدری صاحب کا تعارف کروایا اور پھر صاجزادہ طاہر احمد کا ریکارڈ کردہ منظوم کلام سنایا جسے انہوں نے بڑی توجہ اور غور سے سنا۔ بہت متاثر ہوئے۔ کہنے لگے کہ ان اشعار میں تو ان زخموں کے نشان صاف دکھائی دے رہے ہیں جو ان کے قلب و ذہن پر ان کی والدہ کی وفات کی وجہ سے مرتسم ہوئے۔ سالوں بعد جب چوہدری محمد ظفراللہ خاں کے تبصرے کا آپ کو علم ہوا تو فرمایا:۔

"یہ صحیح ہے کہ میرے ابتدائی اشعار غم واندوہ میں ڈوبے ہوئے ہوتے تھے شعر کیا تھے میرے قلبی حزن وملال کا اظہار تھا۔ میں سطحی موضوعات پر شعر کہہ ہی نہیں سکتا تھا۔ شعر میں جذبے کا ہونا ضروری ہے۔ جذبے کی یہ سچائی مزاحیہ

ہو یا حزنیہ اس کے علاوہ اور تیسرا راستہ ہی نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ شعر کے اس تخلیقی عمل کا تعلق اس صدمے سے ہو جس کی طرف چوہدری محمد ظفراللہ خاں صاحب نے اشارہ کیا تھا۔

لیکن حقیقت تمام تر یہ نہیں تھی۔ میں اپنے گردوپیش اوروں کے غم دیکھ کر بھی اکثر غمگین ہو جایا کرتا تھا اور دل ہی دل میں غم کی یہ صلیب اٹھائے پھرتا تھا اور پھر غم کا یہ احساس شعر کے قالب میں ڈھل جاتا۔ مجھے بتایا گیا کہ جب میرے والد ماجد نے میرے اشعار کے ریکارڈ سنے تو فرمایا۔ "میری خواہش تو یہ ہے کہ نوجوان اپنی نظریں بلند رکھیں"۔ اس سے ان کی مراد یہ تھی کہ نوجوان چاروں طرف پھیلے ہوئے غم اور اندوہ کے اس طوفان کے سامنے ڈٹ جائیں اور اپنی منظومات میں اسی عزم کا اظہار کریں اور اسی کو موضوع سخن بنائیں۔ ہمارے والد ماجد ہماری تعریف کرتے وقت بڑے حزم و احتیاط سے کام لینے کے عادی تھے۔ اپنی خوشنودی کا اظہار بڑے محتاط لفظوں میں کرتے۔ کبھی کبھی تعریف بھی کرتے لیکن اکثر خاموش رہتے۔ ان کی خواہش تھی کہ ہماری شخصیت بلا روک ٹوک کسی قسم کی دخل اندازی اور سہارے کے بغیر پروان چڑھے۔

ان کی ہمیشہ یہ کوشش رہی کہ ہمارے اندر یہ شعور بیدار ہو کہ ہم بھی عام انسانوں کی طرح کے انسان ہیں اور امام

وقت کا فرزند ہونے کی وجہ سے ہمیں کوئی خصوصیت یا برتری حاصل نہیں"۔

صاجزادہ طاہر احمد نے سکول اور یونیورسٹی کے زمانے میں انگریزی زبان سیکھ لی تھی اور وہ انگریزی پڑھ تو سکتے تھے لیکن انہیں انگریزی بول چال میں مہارت نہیں تھی اس لئے انہوں نے لندن یونیورسٹی میں داخلہ لیا تو انگریزی صوتیات کے مضمون کا انتخاب کیا۔ وہ کہتے ہیں۔

"سب سے پہلے مجھے اپنے انگریزی لب ولہجہ سے جو میں نے سکول اور کالج میں سیکھا تھا نجات حاصل کرنی پڑی۔ واقعہ یہ ہے کہ جو لب ولہجہ میں نے اب تک سیکھا تھا کچھ بھی ہو وہ انگریزی لب ولہجہ تو ہرگز نہیں تھا۔ ہوتا بھی کیسے جن اساتذہ سے میں نے انگریزی سیکھی تھی وہ انگریزی بول چال سے واقف ہی نہیں تھے۔ یقیناً انہیں گرائمر کے اصولوں کے مطابق فقرے بنانا تو ضرور آتا تھا۔ لیکن ضروری نہیں کہ جہاں تک زبان کی بول چال اور روزمرہ کا تعلق ہے گرائمر کی پابند زبان صحیح بھی ہو۔ بلکہ ہو سکتا ہے سرے سے ہی غلط ہو" ستم تو یہ ہے کہ اگر آپ غلط تلفظ اور لہجے کے عادی ہو گئے ہیں تو لاکھ بی بی سی کے پروگرام سنیں آپ کو اندازہ ہی نہیں ہو سکتا کہ آپ لفظوں کو کس قدر بگاڑ کر بول رہے ہیں۔ مجھے یہی مشکل درپیش تھی۔ جو انگریزی میں نے سیکھی تھی پہلے اسے بھول جانا پڑا۔ چنانچہ میں نے اپنے دوستوں سے صاف صاف کہہ دیا کہ براہ کرم میرا لحاظ ہرگز نہ کریں اگر میں غلط انگریزی

بولوں تو مجھے ٹوکیں چنانچہ کبھی کبھی تو بڑے کڑوے گھونٹ پینا پڑے۔ میں ابھی فقرہ بھی مکمل نہ کرپاتا کہ کوئی نہ کوئی یہ کہہ کر ٹوک دیتا "ہم یوں نہیں بولتے" آہستہ آہستہ میں انگریزی زبان کے روز مرہ سے واقف ہوتا چلا گیا۔ اور اپنے مافی الضمیر کو ٹکسالی انگریزی میں نسبتاً زیادہ آسانی سے ادا کرنے کے قابل ہو گیا۔"

سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہنے لگے۔

"لیکن میں اپنے باقی ماندہ نصابی کورس میں کامیاب نہ ہو سکا۔ میں مانتا ہوں اور مجھے یہ کہتے ہوئے کوئی باک نہیں کہ میں نے اپنے نصاب کے اس حصے کی طرف کماحقہٗ توجہ نہیں دی یعنی اتنی محنت نہیں کی جتنی کرنی چاہئے تھی شاید اسی وجہ سے بالآخر میری تعلیمی سرگرمیوں کا رخ نصاب کی بجائے غیر نصابی امور کی طرف پھر گیا۔ مجھے کتنے ہی لوگوں سے ملاقات کا موقعہ ملا جن کا ماحول اور پس منظر ایک دوسرے سے بہت مختلف تھا۔ یوں لگتا ہے جیسے نادانستہ طور پر میں اپنے آپ کو ان ذمہ داریوں کی بجا آوری کے لئے تیار کر رہا تھا جو میرے کاندھوں پر پڑنے والی تھیں۔

قبل ازیں میری زندگی ہندوستان اور پاکستان میں ہی گذری تھی اب مجھے یورپ میں رہنے کا موقع مل رہا تھا اور سکول آف اورینٹل سٹڈیز میں تو ملک ملک کے رہنے والوں سے ملاقاتوں کا ایک طویل سلسلہ تھا جو ختم ہونے میں نہیں

آتا تھا۔ میں افریقہ۔ جرمنی۔ پولینڈ اور یورپ کے دیگر ممالک کے طلباء سے ملتا۔ کینیڈا۔ امریکہ اور جنوبی امریکہ کے رہنے والوں سے ملاقاتیں ہوتیں۔ اب سوچتا ہوں تو یوں لگتا ہے۔ جیسے ایک خدائی ہاتھ تھا جو کام کر رہا تھا۔ اگرچہ جو کچھ ہوا غیر محسوس طور پر ہوا لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ فیصلہ میرا نہیں بلکہ ایک بالا ہستی کا تھا کہ میں یورپ میں گھوم پھر کر لوگوں سے ملوں اور ان کے رہن سہن اور دکھ درد کا قریب سے مشاہدہ کروں۔

یقیناً یہ ایک خدائی فیصلہ تھا۔ ظاہر ہے کہ اس وقت تو اس کا احساس نہیں تھا۔ لیکن مستقبل قریب میں جماعت کو نہایت خطرناک مراحل میں سے گذرنا تھا اور جماعت کے مرکز کو بھی عارضی طور پر ہی سہی مجبوراً لندن منتقل ہونا تھا اس لئے ضروری تھا کہ میں انگریزی زبان جانتا اور بول سکتا۔ کیونکہ یہی وہ زبان تھی جس کے ذریعے میں ظلم و ستم کا دور شروع ہونے پر زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچ سکتا تھا۔ اب برطانیہ میں میری جلاوطنی کے دن گذر رہے ہیں اس سے ایک اور وعدہ بھی پورا ہو گیا جو خدا نے (حضرت) مسیح موعود (علیہ السلام) سے کیا تھا کہ "میں تیری تبلیغ کو زمین کے کناروں تک پہنچاؤں گا"۔

☆ ☆ ☆

9

کام اور تفریح

۱۹۵۷ء میں صاحبزادہ طاہر احمد برطانیہ سے واپس ربوہ تشریف لے آئے۔وہ انگلستان سے انگریزی زبان کی مہارت کے علاوہ کوئی اور سرٹیفکیٹ تو نہ لا سکے لیکن اب انگریزی زبان پر ان کو خوب عبور حاصل ہو چکا تھا۔جس کی سند بھی ان کے پاس تھی۔ان کے والد ماجد کی صحت آہستہ آہستہ گر رہی تھی تاہم ان کے واپس آنے پر ان کے والد کو بے حد اطمینان اور سکون حاصل ہوا۔انہی دنوں ایک ایسی تقریب بھی پیدا ہوئی جس سے یہ ثابت ہو گیا کہ آپ میں خود اعتمادی کے ساتھ آزادانہ فیصلہ کرنے کی صلاحیت بھی بدرجہ اتم موجود ہے۔

ہوا یوں کہ جب کراچی پہنچے تو آپ کے ایک احمدی دوست نے سنجیدگی سے مشورہ دیا کہ دیکھئے اب آپ یورپین طرز کا سوٹ نہ پہنیں ورنہ لوگ کہیں گے کہ آپ مغرب زدہ ہو گئے ہیں۔بہتر ہو گا کہ اب آپ سوٹ کی بجائے اچکن اور شلوار ہی زیب تن فرمائیں۔

اچکن ایک طرح کا لمبا کوٹ ہوتا ہے جس کے بٹن گلے تک ہوتے ہیں اور شلوار سوتی کپڑے کا ایک ڈھیلا ڈھالا پاجامہ ہوتا ہے۔ یہ عموماً ہندو پاکستان کے مسلمان عام طور پر یہی لباس پہنتے ہیں۔ صاحبزادہ طاہر احمد نے برجستہ جواب دیا کہ

"کیا آپ کا یہ مطلب ہے کہ میں اس نیت سے اچکن اور شلوار پہن لوں تا کہ دیکھنے والوں پر اچھا اثر پڑے؟ نہیں' ایسا نہیں ہو سکتا یہ تو ایک طرح کی ریاکاری ہوگی۔ میں ہرگز ایسا نہیں کروں گا"۔

چنانچہ آپ نے اچکن شلوار کی بجائے سوٹ ہی پہننا پسند فرمایا۔

"سوٹ بھی میں نے یہ ثابت کرنے کے لئے نہیں پہنا کہ میں یورپ میں ایک عرصہ گذار کر واپس آیا ہوں بلکہ اس لئے کہ مجھے ریاکاری اور تصنع سے نفرت ہے"۔

یورپ سے واپسی کے بعد چند دن آپ نے آرام کیا۔ پرانی یادیں تازہ کیں۔ دوستوں سے ملے۔ بدلے ہوئے طریقہ ہائے کار سے واقفیت حاصل کی۔ اس دوران میں انہیں (حضرت) خلیفہ ثانی کا حکم بھی مل گیا کہ آپ کی تقرری وقف جدید میں کی جاتی ہے۔ وقف جدید کا کام ان احمدی جماعتوں کے اخلاقی اور روحانی امور کی دیکھ بھال تھی جو دور افتادہ دیہات میں قائم تھیں۔ اس کے کچھ ہی عرصے بعد آپ نوجوانوں کی بین الاقوامی تنظیم خدام الاحمدیہ کے صدر بھی منتخب ہو گئے۔ وقف جدید کی ذمہ داریوں کی ادائیگی کے دوران انہیں کسانوں۔ [illegible] دکانداروں اور دور افتادہ دیہات میں رہنے والے عام آدمیوں سے براہ راست

ملنے کا موقع ملا۔ سوچیں تو یہی وہ لوگ ہیں جو جماعت کے لئے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں۔

چنانچہ آپ فرماتے ہیں۔

"دیہاتی جماعتوں کی نگرانی میرے فرائض منصبی میں شامل تھی۔ میں اب اس بات کا مکلف تھا کہ مسلسل جائزہ لیتا رہوں کہ آیا دیہاتی جماعتیں اپنے اخلاص اور قربانیوں کے معیار کو برقرار بھی رکھ پا رہی ہیں یا نہیں۔ مجھے ان کی دنیوی ضروریات پر بھی نظر رکھنی پڑتی تھی۔ میری کوشش ہوا کرتی تھی کہ ہر ممکن ذریعہ سے ان کی مدد کر سکوں۔ مثلاً زراعت کے ماہرین تھے جو زراعت کے میدان میں جدید ٹیکنالوجی اور کاشت کے ترقی یافتہ طریقوں سے انہیں روشناس کروا سکتے تھے۔ اسی طرح انجینیئر تھے، ڈاکٹر تھے، نرسیں تھیں، اساتذہ تھے جن کی خدمات سے فائدہ اٹھایا جا سکتا تھا۔ ان پس ماندہ علاقوں میں رہنے والوں کے لئے ازبس ضروری تھا کہ انہیں پینے کے لئے صاف پانی کی اہمیت کا علم ہو اور یہ لوگ حفظان صحت کے دیگر اصولوں سے کماحقہٗ واقف ہوں۔

جہاں تک تعلیم کا تعلق ہے ہمارا ہدف تو یہ تھا کہ ہر احمدی لڑکا اور لڑکی علم کے زیور سے آراستہ ہو۔ ہم تو سو فیصد شرح خواندگی کے خواہاں تھے۔ ہماری کوشش تھی کہ جہاں تک ممکن ہو دنیا بھر کی احمدی جماعتوں سے تعلق رکھنے والا ہر

احمدی نوجوان کم از کم ثانوی تعلیم کے معیار تک تو ضرور پہنچ جائے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس وقت ربوہ میں مستورات کی شرح خواندگی سو فیصد ہے۔ اور مردوں کی ستر فیصد۔ اندازہ ہے کہ مجموعی طور پر پاکستان بھر میں جماعت احمدیہ کی شرح خواندگی کم و بیش اسی فیصد ہے جبکہ پاکستان کی شرح خواندگی پچھلے دنوں تک ۲۷ فیصد کے لگ بھگ رہی ہے۔

وقف جدید میں تقرری کے بعد میں نے پاکستان اور بنگلہ دیش میں (جو ان دنوں مشرقی پاکستان کہلاتا تھا) متواتر سفر کئے۔ مجھے ملک بھر کے عوام سے ملنے اور انہیں قریب سے دیکھنے اور جاننے کا خوب موقع ملا۔ ایک نوجوان کی حیثیت سے میں نوجوانوں کی تنظیم خدام الاحمدیہ کا بھی رکن تھا۔ خدام الاحمدیہ کی تنظیم میں میں نے سب سے نچلی سطح سے خدمت کا آغاز کیا۔ مجھے متعدد افسروں کے ماتحت کام کرنے کا موقع ملا۔ اس سے میری خاصی تربیت ہوئی۔

میں نے ایسے افسروں کی ماتحتی میں بھی کام کیا جن کا مزاج سخت اور طبیعت آمرانہ تھی۔ جو اپنے ماتحتوں سے مکمل اطاعت تو چاہتے تھے لیکن اس اطاعت کے جواب میں ان سے محبت اور شفقت کا سلوک کرنا ان کے بس کا روگ نہ تھا۔

یوں مجھے ان لوگوں کے جذبات اور احساسات کا اندازہ بھی ہوا جو دوسروں کے ماتحت کام کرتے ہیں۔ اس میں کوئی

شک نہیں کہ جماعت کے ہر فرد میں اطاعت بلکہ کامل اطاعت کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ چنانچہ میں نے انشراح صدر سے اپنے افسروں کی کامل اطاعت کی کوشش کی اور پوری فرمانبرداری سے کام لیا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ میں نے ایک سبق بھی سیکھا جو یہ تھا کہ کام کیسے کیا اور کیسے لیا جانا چاہئے۔

مجھے اس امر کا بھی ہمیشہ احساس رہا کہ آپ صرف ان لوگوں کا ہی خیال نہ رکھیں جن سے آپ مخاطب ہوں بلکہ آپ کا یہ بھی فرض ہے کہ آپ ان لوگوں کو بھی نہ بھولیں جن سے آپ براہ راست مخاطب نہیں ہوتے۔ میں نے اسے کبھی کافی نہیں سمجھا کہ اپنے ساتھیوں سے صرف کام کی حد تک کام رکھوں اور اسی پر مطمئن ہو جاؤں۔ میں نے ہمیشہ کوشش کی ہے کہ میرے ساتھی بھی اپنے ماتحتوں سے خوش اخلاقی سے پیش آئیں۔ مجھے یہ احساس بھی رہتا تھا کہ مجھے اس بات کا علم ہوتا رہے کہ جب یہ لوگ اوروں سے کام لیتے ہیں تو کیا ان کا سلوک ان سے ہمدردانہ ہوتا ہے یا نہیں؟ اس احساس اور علم کے بغیر صحیح صورتحال کبھی سامنے نہیں آسکتی۔"

خلیفہ منتخب ہونے کے بعد آپ نے اس امر کی کوشش کی اور اس کی حوصلہ افزائی کی کہ ہر احمدی انہیں براہ راست خط لکھتا رہے۔ قطع نظر اس کے کہ خط میں کسی پسندیدگی یا ناپسندیدگی کا اظہار ہو یا نہ ہو۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

"ناپسندیدگی کی صورت میں تو یہ اور بھی ضروری تھا کہ
خط کے ذریعے ان کے جذبات مجھ تک پہنچے۔ البتہ ایک شرط
تھی کہ جس شخص کے خلاف کسی بھی قسم کی شکایت ہو اسے
خط کی نقل ضرور بھیجی جائے۔

یہ طریق کار بہت کامیاب رہا۔ شکایات کے علاوہ
مشوروں اور تبصروں کا ایک تانتا بندھ گیا۔ صورتحال کو بہتر
سے بہتر بنانے کے لئے ایک سے ایک نئی سوچ جو کبھی منتظمین
کے وہم و گمان میں بھی نہ آسکتی تھی ابھر کر اور نکھر کر سامنے
آنے لگی۔ جہاں تک شکایات کا تعلق تھا یہ فیصلہ کرتے وقت
مجھے کوئی دقت پیش نہیں آتی تھی کہ کون سی شکایت صحیح ہے
اور کون سی غلط۔ میرا طریق کار یہ تھا کہ میں بلا استثناء ہر
شکایت پر متعلقہ فریق سے جواب طلبی کرتا اور اگر شکایت کو
درست پاتا تو بلا جھجک متعلقہ افسر کو بتا دیتا کہ اس نے کیا غلطی
کی ہے"۔

آپ قیادت کی غیر معمولی صلاحیت کے مالک تھے۔ اپنے ماتحتوں سے آپ کا
سلوک نرمی اور سختی کا ایک حسین اور متوازن مرقع تھا۔ اکثر لوگ تو نرمی سے ہی
اپنی اصلاح کر لیتے اگرچہ بعض لوگ ایسے بھی تھے جنہیں بادلِ ناخواستہ سرزنش
بھی کرنی پڑتی تھی۔

"بہرحال ایک حد تک تو سختی ناگزیر تھی۔ اگر آپ کوئی کام
کسی کے سپرد کرتے ہیں۔ تو اسے علم ہونا چاہئے کہ آپ اس
کی فوراً تکمیل چاہتے ہیں۔ یہ نہیں کہ جب جی چاہے وہ اپنی

مرضی سے مفوضہ کام مکمل کرے۔ قیادت کے راہنما
اصولوں کا لب لباب صرف یہی نہیں کہ آپ کے ہم کاروں
اور ساتھیوں تک آپ کی پوری شخصیت کا ابلاغ ہوتا رہے۔
جہاں تک میں جانتا ہوں صحیح طریق کار یہ ہے اور اس کا کوئی
متبادل طریق کار ہے بھی نہیں کہ محض لفظی جمع خرچ پر
اکتفا نہ کیا جائے۔ ضروری ہے کہ آپ اپنے ساتھیوں سے
بالکل اسی طرح پیش آئیں جس طرح آپ توقع رکھتے ہیں کہ
وہ دوسروں سے پیش آئیں"۔

اگرچہ صاحبزادہ طاہر احمد نے امتحانات میں تو کوئی خاص معرکے سر نہیں کیے لیکن ان کے کام کرنے کی اہلیت کے سبھی قائل تھے۔ قصہ یہ تھا کہ انہوں نے اپنی ذہانت پر بے شمار غیر نصابی سرگرمیوں اور مضامین کا بوجھ لاد رکھا تھا اور وہ رسمی امتحانات کی دوڑ میں کبھی سنجیدگی سے شامل نہیں ہو پائے تھے لیکن اب صورت حال اور تھی اب ان کی ذہانت اور قوت کار دونوں بیک وقت کام میں جُت گئے تھے۔

آپ عین آٹھ بجے صبح دفتر کے عملے سے ایک گھنٹہ تیس منٹ پہلے دفتر میں تشریف لے آتے اور سب کے بعد آخر میں واپس جاتے۔ عموماً دس بجے شب تک دفتر میں تنہا بیٹھے کام کرتے رہتے۔ جمعہ چھٹی کا دن ہوتا تھا لیکن ان کے لئے کوئی چھٹی نہیں تھی۔ جمعہ کے دن بھی دوپہر تک دفتر میں مصروف رہتے۔ دوپہر کے بعد نماز جمعہ کی ادائیگی کے لئے آپ مسجد اقصیٰ جاتے اور وہاں جمعہ کا خطبہ دیتے۔ پندرہ ہزار سے زائد نمازی ان کے خطبہ کو بڑے ادب اور انہماک سے سنتے آپ نماز جمعہ کے بعد پھر اپنے دفتر میں واپس آجاتے۔ فرماتے ہیں۔

"تھکن کا تو احساس تک نہیں ہوتا تھا بلکہ کام سے تو
طبیعت میں ایک گونہ نشاط اور سرور کی کیفیت پیدا ہو جاتی
تھی"۔

وہ دفتر میں موصول ہونے والے ایک ایک خط کو پڑھتے۔ یہ خطوط عام طور
مخصوص مضامین پر مشتمل ہوا کرتے تھے اور دفتر کا عملہ انہیں آپ کے نوٹس میں
لائے بغیر بھی ان کا بآسانی جواب دے سکتا تھا۔ لیکن چونکہ ان خطوط کے مکتوب الیہ
آپ خود تھے اس لئے آپ ان خطوط کو خود پڑھنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ خطوط ہی
نہیں وہ تو فائلیں بھی اسی طرح روزانہ تفصیل سے ملاحظہ کرنے کے عادی تھے
چنانچہ فرماتے ہیں:

"ساری فائلیں پڑھنا تو ممکن نہ تھا لیکن میں مشتے نمونہ
از خروارے کے مصداق کچھ فائلیں ضرور تفصیل سے
ملاحظہ کرتا۔ اس سے مجھے تازہ ترین صورت حال کا علم بھی ہو
جاتا کہ کس کس جگہ کیا ہو رہا ہے۔ خصوصاً ایسے مقامات جن
کے متعلق باخبر رہنا میری ذمہ داری میں شامل تھا۔ کبھی کبھی یہ
اندازہ بھی ہو جاتا کہ کام کی رفتار تسلی بخش نہیں لیکن
بسا اوقات یہ دیکھ کر اطمینان اور بڑی خوشی ہوتی کہ لوگ کتنی
محنت اور لگن سے کام کر رہے ہیں اور کتنے اخلاص اور
انہماک سے دن رات اپنے فرائض کی ادائیگی میں جتے ہوئے
ہیں"۔

یہ ایک ایسا سسٹم تھا جس کی زیر زبر انہوں نے خلیفہ منتخب ہونے سے پہلے ہی
درست کر لی تھی۔ اگر کبھی روزانہ کا کام ختم ہو جاتا تو خالی ہاتھ بیٹھنا دوبھر ہو جاتا

چنانچہ کہتے ہیں:

"ایسے موقعوں پر شدید تھکن کا احساس ہوتا۔ بے کار بیٹھنا تو سوہان روح بن جاتا۔ ایک خلا سا محسوس ہوتا جسے پُر کرنے کی دھن سوار رہتی اور ایک خطرناک قسم کی بوریت کا احساس ہوتا۔

بیکار بیٹھنا میرے بس کا روگ نہ تھا۔ میں دوسرے مشاغل کی طرف متوجہ ہوتا۔ سائیکل چلاتا۔ بیڈمنٹن کھیلتا۔ گھڑسواری اور تیراکی کرتا اور نہیں تو لمبی سیر کے لئے پیدل نکل جاتا"۔

سکواش ان کا مرغوب کھیل تھا۔ ان کی سکواش کی ابتدائی کوچنگ اس وقت کے عالمی چیمپین ہاشم خان نے کی اور قیام لندن کے دوران توانہیں اپنے کالج

The School of Oriental and African Studies

کی طرف سے کھیلنے کا موقع بھی ملا۔

انہی دنوں انہوں نے ریاست ہائے متحدہ امریکہ کا بھی نجی دورہ کیا۔ آپ اپنے چچازاد بھائی جناب ایم۔ ایم۔ احمد صاحب کے ہاں ٹھہرے جو ان دنوں ورلڈ بینک میں کام کررہے تھے۔ یادوں کو تازہ کرتے ہوئے جناب ایم۔ ایم۔ احمد صاحب کہتے ہیں:

"ان کی بعض صفات حسنہ جن کا مظاہرہ میرے سامنے روزانہ ہی ہوتا رہتا تھا خصوصاً ان کی حصول علم کے لئے پیاس اور تڑپ اور لوگوں سے شوق سے ملنا اور انہیں سمجھنے کی کوشش کرنا۔ ملک کے طول وعرض میں پھیلے ہوئے ہر سطح

کے احمدیوں سے محبت کے گہرے رشتے استوار کرنے کا تو انہیں خداداد ملکہ حاصل تھا۔

تھکن تو انہیں چھو کر بھی نہیں گئی تھی۔ کام کرنے کی بے پناہ صلاحیت اور قوت تھی جو انہیں حاصل تھی۔ لمبے عرصے تک استقلال سے کام کر سکتے تھے۔ آپ زبردست قوت ارادی کے مالک تھے۔ اس سفر کے لئے انہوں نے ایک کار کرائے پر لے رکھی تھی جسے وہ آپ ہی چلاتے تھے۔ انہوں نے امریکہ کے مشرقی ساحل سے لے کر مغربی ساحل تک۔ ایک سرے سے دوسرے سرے تک ایک طوفانی دورہ کیا۔ اور کم سے کم جگہوں پر ستانے کے لئے رکے۔ لیکن اس مختصر عرصے میں اتنی معلومات حاصل کیں جن کا عشر عشیر بھی اوروں کو نصیب نہیں ہوتا خواہ وہ کتنا ہی کیوں نہ گھومیں پھریں۔"

آپ کو شکار سے بھی دلچسپی تھی۔ اسلام اس امر کی اجازت تو دیتا ہے کہ آپ کسی جانور کا شکار کریں بشرطیکہ آپ اس کا گوشت بھی کھائیں لیکن محض مزے اور شغل کے طور پر جانوروں کا شکار ممنوع ہے۔ وہ خود کہتے ہیں۔

"میں ہرگز پسند نہیں کرتا کہ پرندوں اور دوسرے جانوروں کو پہلے پالا جائے اور پھر لوگ آئیں اور ان کا شکار کریں۔ میں تو اسے قتل عمد کے مترادف سمجھتا ہوں۔ میں نے کبھی اس قسم کے ظلم میں حصہ نہیں لیا۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ ایک جانور کھلی فضا میں آزادانہ طور پر گھوم پھر رہا ہو اور

آپ اسے پورا موقع دے کر اسے پکڑنے یا شکار کرنے کے
لئے اپنی مہارت کے جوہر دکھانا چاہتے ہوں"۔

کھانا پکانا بھی ان کے محبوب مشاغل میں شامل رہا ہے کبوتر یا کسی اور پرندے اور کبھی کبھار ایک آدھ ہرن یا چکارے کا شکار بھی کرتے اور جنگل ہی میں اسے آگ پر بھون کر اپنے نوجوان غیر ملکی مہمانوں کو کھلا کر خوش ہوتے۔
کچھ مہمانوں کو گھر پر بھی بلاتے کسی ایسے ہی موقع پر آپ نے کچھ ایسے ہندوستانی مہمانوں کو اپنے ہاں مدعو کیا ہوا تھا جو آپ کے خاص واقف نہیں تھے۔ انور احمد کاہلوں بھی اس موقع پر موجود تھے جو اپنے قیام لندن کے دوران آپ کی کھانا پکانے کی مہارت کے مزے لوٹ چکے تھے۔ کھانا شروع ہوا تو ایک کھانے کے بعد دوسرا کھانا آتا چلا گیا۔ اتنے مزیدار کھانے کھا کر مہمانوں سے رہا نہ گیا اور وہ مزعومہ خانساماں کی تعریف میں کچھ اس طرح رطب اللّسان ہوئے:

"بھئی واہ۔ کیا مزیدار کھانا ہے' کاش ہمارے ہاں بھی ایسا
باورچی ہوتا۔ آج تو اس نے کمال ہی کر دیا۔ ہم سب کی طرف
سے اس کا شکریہ ادا کریں اور مبارک باد دیں"۔

ایک اور صاحب مسکراتے ہوئے بولے۔ "ارے بھئی ہم تو اس باورچی کو ہندوستان لے جانا چاہیں گے۔ کیا وہ ہمارے ساتھ جانے کے لئے تیار ہو جائے گا؟"
صاحبزادہ صاحب مسکرا کر بولے:
"میرا خیال ہے وہ بڑی تسلی اور اطمینان سے یہاں رہ رہا ہے۔ ہاں آپ کی پیش کش میں ضرور اسے پہنچا دوں گا"۔
ان کے چہرے سے ذرا سا اظہار بھی تو نہیں ہو رہا تھا کہ وہ اس لطیفے سے کس قدر لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ البتہ ساتھ ساتھ آنکھوں ہی آنکھوں میں انور احمد

کاہلوں سے کچھ اشارے ضرور ہو رہے تھے۔ انور احمد کاہلوں جانتے تھے کہ طاہر احمد ہی وہ مشہور و معروف باورچی ہیں جس کی اتنی تعریف کی جا رہی ہے۔ ان کے نزدیک اچھے کھانے کی اولین شرط یہ ہے کہ اس میں نمک مرچ وغیرہ کا متوازن امتزاج ہو۔ وہ خود کہتے ہیں:

"کھانا نہ تو زیادہ مرغن ہو بلکہ جس قدر کم مرغن ہو اتنا ہی اچھا ہے نہ ہی حد سے زیادہ خشک ہو اور اگر خشک ہو تو فقط اتنا جتنا خوب سنکا ہوا مرغ کا تکہ۔ اُدھ سنکا نہیں۔ لیکن دراصل نمک مرچ وغیرہ کا توازن ہی سب سے زیادہ ضروری ہے اور اس کے ساتھ ساتھ آپ میں یہ مہارت بھی ہونی چاہئے کہ آپ کھانا پکاتے وقت بعض کھانوں کی مخصوص بو کو مار سکیں۔ جب میں گوشت یا مچھلی پکاتا ہوں تو کوشش کرتا ہوں کہ ان کی منفرد بو کو ختم کر دوں۔ کیونکہ اور لوگوں کی طرح بعض کھانوں کی بو مجھے پسند نہیں"۔

کچھ کھانے تو انہیں ویسے ہی مرغوب نہیں وہ کہتے ہیں:

"کسی زمانے میں مجھے سنگترے بہت پسند تھے۔ پھر ایسا بھی ہوا شاید بے تحاشا سنگترے کھانے کی وجہ سے مجھے سنگتروں سے ایک طرح کی کراہت ہو گئی اور اب تو یہ حال ہے کہ طبیعت ان کی طرف بالکل مائل نہیں ہوتی۔ کھانوں میں یہی حال پھول گوبھی کا ہے کبھی مجھے بھنڈی بھی بہت پسند تھی لیکن بدقسمتی سے اب نہیں"

اور شراب کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟

"مجھے شراب سے نفرت ہے لیکن یہ کہنا غلط ہو گا کہ شراب کی بُو سے مجھے اتنی ہی کراہت ہے جتنی شراب سے۔ یہ ایک تکلف ہو گا۔ اسلام تو سچائی کی تعلیم دیتا ہے۔ شراب کی بُو تو بعض پھلوں سے ملتی جلتی ہے۔ جن دنوں میں لیبارٹری میں تجربے کر رہا تھا اس بُو نے مجھے کبھی پریشان نہیں کیا۔ اور پھر پھولوں کی طرح خوشبو کے بھی انواع و اقسام کے رنگ ہوتے ہیں"۔

جب ۱۹۵۷ء میں طاہر احمد لندن سے واپس آئے تو ان کی شادی سیدہ آصفہ بیگم سے ہو گئی۔ لندن ہی سے آپ نے اپنے والد بزرگوار کی خدمت میں لکھا تھا کہ وہ آصفہ بیگم سے شادی کا ارادہ رکھتے ہیں۔ وہ انہیں بچپن سے جانتے تھے آپ نے لکھا کہ مجھے دلی خوشی ہو گی اگر آصفہ بیگم کے خاندان کے ذریعہ آصفہ بیگم سے بھی پوچھ لیا جائے کہ ان کا میرے متعلق کیا خیال ہے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ دونوں کے باہمی جذبات میں خاصی مماثلت تھی۔

شادی کے بعد انہیں بھی ان گیارہ مکانوں میں سے ایک مکان مل گیا جو ان کے والد بزرگوار نے اپنے بیٹوں کے لئے بنوائے تھے۔ مکان میں تین سونے کے کمرے۔ ایک ڈرائنگ روم۔ کچن اور مختصر صحن مع چار دیواری۔ ہاں ایک فارم بھی تھا جسے فارم کہنا تو شاید مبالغہ ہو۔ یہ پچیس ایکٹر پر مشتمل ایک جھاڑی دار بے آباد سا قطعہ زمین تھا یہاں وہ گھوڑے بھی پال سکتے تھے۔ جنہیں وہ خود ہی سدھاتے تھے۔ اور دودھ کے لئے بھینسیں بھی پالی جا سکتی تھیں۔

چنانچہ صبح سویرے چھ بجے سائیکل پر تین میل دور فارم پر جانا ان کا روزانہ کا معمول بن گیا اور تفریح کا سامان بھی۔

"اس سے پیشتر کہ لوگ خواب سحر سے بیدار ہوں۔ میں
منہ اندھیرے فارم کی طرف نکل جاتا۔ اور بڑا ہی اطمینان اور
فرحت محسوس کرتا۔ ہر طرف ہلکی سی خنکی اور تازگی چھائی
ہوئی ہوتی اور مجھے نہ صرف مویشیوں کو ایک نظر دیکھنے اور
ان کی دیکھ بھال کرنے کا موقع مل جاتا۔ بلکہ تنہائی میں غور
و فکر کی فرصت بھی ملتی۔ چونکہ دن کا باقی حصہ بے حد مصروف
اور منظم ہوا کرتا تھا اس لئے فرصت کے یہ چند لمحات میرے
لئے بڑی ہی تفریح کا باعث بن جاتے تھے"۔

شادی اپنے جِلَو میں خوشیاں بھی لائی اور منصب پدری اور اس کی ذمہ داریاں بھی۔ ان کی پہلی بیٹی شوکت اگست ۱۹۶۰ء میں پیدا ہوئی اس کے بعد تین بیٹیاں اور پیدا ہوئیں۔ فائزہ اکتوبر ۱۹۶۱ء میں۔ مونا ستمبر ۱۹۷۱ء میں اور طوبیٰ اپریل ۱۹۷۴ء میں۔ ان کی بچیوں نے انہیں خوشیوں سے مالا مال کر دیا۔

"ہم اکٹھے کھیلتے۔ ایک دوسرے کو بھاگ کر پکڑتے۔
درختوں پر چڑھنے کے مقابلے ہوتے آنکھ مچولی کا کھیل بھی
ہوتا۔ میں جب بچیوں سے کھیلتا تو یوں لگتا جیسے میں ان کا ہم عمر
ہوں۔ یہ کھیل میرے لئے کیا تھے تفریح کی تفریح اور آرام کا
آرام اور دلی مسرتوں کا خوان یغما۔"

فارم پر انہوں نے تیرنے کے لئے ایک تالاب بھی بنوایا جہاں بچیوں کو تیرنا سکھایا اور ان کے اچھلنے کودنے کے لئے ایک Trampoline بھی خریدی۔ جب صاحبزادی شوکت ذرا بڑی ہو گئی تو وہ بھی دودھ لانے کے لئے اپنے ابا جان کے ہمراہ جانے لگی۔

آپ بچیوں کو سوتے وقت مزے لے لے کر کہانیاں سناتے۔ یہ کہانیاں بسااوقات الہامی کتب مثلاً بائبل سے متعلق ہوتیں۔ ان کے خاندانی البم میں ایک بہت دلچسپ تصویر موجود ہے جو ایک دوست نے اس وقت لی تھی۔ جب آپ بچیوں کو ایک کہانی سنا رہے ہیں۔ کہانی اپنے نقطہ عروج پر پہنچ رہی ہے۔ شوکت فرط جذبات سے مغلوب ہو کر تالی بجا رہی ہے۔ فائزہ رضائی میں لپٹی اپنے اباجان کے کنار عاطفت میں بیٹھی ہوئی ہے۔

بچیاں بیمار پڑتیں تو طاہر احمد ساری ساری رات ان کی تیمارداری میں گذار دیتے۔

10

جماعت احمدیہ پر تشدد

یہ تاریخ عالم کا ایک بہت بڑا المیہ ہے کہ جس ملک کی تاسیس میں جماعت احمدیہ نے کلیدی کردار ادا کیا تھا اور جو اس ملک کی بانی جماعتوں میں سے ہے اس پر اسی ملک میں اتنے خوفناک مظالم ڈھائے جا رہے ہیں اور عجیب تربات یہ ہے کہ یہ مظالم ڈھانے والے وہی علماء اور مذہب کے علمبردار ہیں جنہوں نے تحریک پاکستان کی مخالفت میں ایڑی چوٹی کا زور لگایا تھا۔

جماعت احمدیہ کی مخالفت عموماً مذہبی اختلافات کی بناء پر ہی ہوتی رہی ہے لیکن کبھی کبھی اس مخالفت میں سیاسی عوامل بھی شامل ہو جاتے رہے ہیں۔ مقصد اس مخالفت کا یہ ہوتا ہے کہ عوام الناس کی توجہ بعض حقیقی مسائل سے ہٹ جائے یا اس قسم کی مذہبی اشتعال انگیزی اور منافرت کے ذریعہ کرسئ اقتدار پر قبضہ کر لیا جائے' چنانچہ انہی عوامل کی بنا پر جماعت احمدیہ سیاسی طالع آزماؤں کے ظلم و ستم کا تختۂ مشق بنی۔ اگرچہ عام مسلمانوں اور احمدیوں کے عقائد میں بعض

بنیادی اختلافات موجود ہیں لیکن سیاسی وجوہات کی بناء پر ان کو نمک مرچ لگا کر خوب خوب اچھالا جاتا ہے۔ یہ وجوہات ملکی بھی ہو سکتی ہیں اور بین الاقوامی بھی۔ بایں ہمہ شاذ و نادر ہی ایسے لوگ ہوں گے جو اس امر سے انکار کر سکیں کہ احمدی نہ صرف اچھے ہمسائے اور اچھے شہری ہوتے ہیں بلکہ قطع نظر مذہبی اختلافات کے اچھے مسلمان اور اچھے انسان بھی ہوتے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ سیاست دانوں کو تو کوئی نہ کوئی قربانی کا بکرا چاہئے۔ سیاسی مفاد کی خاطر پاکستان میں جماعت احمدیہ کے خلاف منافرت اور تشدد کا جو طوفان برپا کیا گیا اس کی باقیات کے نقوش جتنے بدنما ہیں اتنے ہی شرمناک بھی۔

صاحبزادہ طاہر احمد نے اپنے فرائض منصبی کی بجا آوری کے سلسلے میں مغربی اور مشرقی پاکستان کے طول و عرض میں دورے کئے۔ اس دوران میں انہیں مختلف پارٹیوں کے سیاست دانوں سے بھی واسطہ پڑا اور وہ بتدریج سیاسی پارٹیوں سے بات چیت کے لئے ایک طرح سے رابطے کا ذریعہ بن گئے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

> "ہم نے سیاست دانوں سے ملنے کا پروگرام بنایا تاکہ ان کی حکمت عملی اور مقاصد کو سمجھا جا سکے۔ اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ ہم سیاست میں دخل دے رہے تھے ہمارا مقصد صرف یہ تھا کہ پاکستان اور جماعت احمدیہ کی بقا کا تحفظ کیا جائے۔ ویسے بھی ملک میں ہمارے گرد و پیش میں جو کچھ ہو رہا تھا ہم اس سے الگ تھلگ اور لاتعلق بھی نہیں رہ سکتے تھے۔
>
> کچھ سیاستدان تو نہایت خندہ پیشانی سے ملے اگرچہ وہ (حضرت) مسیح موعودؑ کے دعاوی کے شدید مخالف تھے۔ کچھ ویسے ہی سیکولر خیالات کے علمبردار تھے۔ اور اصولاً جملہ

مذاہب کے مخالف تھے۔ باہمی احترام کی فضا میں کچھ کو تو بہت
قریب سے ملنے اور جاننے کا موقع ملا۔ کچھ ایسے بھی تھے جو کہنے
کو تو جماعت احمدیہ کے بارے میں غیر جانبدار ہونے کے
دعویدار تھے لیکن بعد میں بہت ناقابل اعتبار اور دوغلے ثابت
ہوئے"۔

ان میں سے ایک کے ساتھ آپ کی گفتگو کچھ اس طرح ہوئی:

"جناب مجھے بہت سے سیاسی لیڈروں سے ملنے کا اتفاق
ہوا ہے۔ ان سب میں سے آپ کمزور ترین نظر آئے ہیں۔
قطعاً بے بس اور لاچار۔

وہ صاحب مارے غصے کے آپے سے باہر ہو گئے قریب
تھا کہ وہ مجھے ایک چانٹا رسید کر دیتے۔ لیکن اس کے ساتھ
ساتھ وہ کچھ متعجب اور متجسس بھی ہوئے۔ میں نے بھی یہ
الفاظ جان بوجھ کر کہے تھے۔ میں جانتا تھا کہ میں جب تک
انہیں جھنجھوڑ کر نہ رکھ دوں وہ میری باتوں میں چنداں دلچسپی
نہیں لیں گے۔ میں نے انہیں بتایا میرا لیڈر شپ کے متعلق
تصور کیا ہے۔ میں نے کہا کہ میرے نزدیک لیڈر وہ ہے جو قوم
کو تباہی اور بربادی سے دور لے جائے۔ میں اسے لیڈر نہیں
سمجھتا جو اپنے آپ کو ایک شتر بے مہار کی طرح ایک بہت
بڑے ہجوم کے رحم و کرم پر چھوڑ دے۔ اور جسے واقعات اور
حالات کا سیلاب جدھر چاہے لے جائے۔

میں نے انہیں بتایا کہ آپ آگ سے کھیل رہے ہیں۔ یہ

ہجوم اپنے مذموم مقاصد پالینے کے بعد الٹا آپ پر حملہ آور ہو گا۔ اور آپ اس کی اندھی نفرت اور حقارت کا نشانہ بن کر رہ جائیں گے۔

اس لیڈر نے مجھے ملاقات کے لئے آدھے گھنٹے کا وقت دیا تھا۔ لیکن یہ ملاقات ساڑھے تین گھنٹے تک چلتی رہی۔ بات یہ ہے کہ ہمارا یعنی جماعت احمدیہ کا مقصد ہرگز یہ نہیں ہے کہ اقتدار پر قبضہ کیا جائے۔ اس کے برعکس ہم یہ چاہتے ہیں کہ سیاستدانوں کی اس طرح رہنمائی کریں کہ وہ ملک اور قوم کی فلاح و بہبود کی خاطر حالات کا مطالعہ کرنا اور حالات کو سمجھنا سیکھ جائیں۔ سچ پوچھیں تو یہ فرض ہم پر ہی نہیں ہر شہری پر عائد ہوتا ہے۔

بدقسمتی سے جہاں تک مذکورہ بالا سیاستدان کا تعلق ہے میری پیش گوئی حرف بحرف درست ثابت ہوئی اور بالآخر اس آگ کو بھڑکانے والا خود اس آگ کے شعلوں میں بھسم ہو کر رہ گیا۔

(حضرت) مسیح موعودؑ ہمیشہ سیاست سے الگ تھلگ رہے۔ آپ نے اپنے ماننے والوں پر خوب اچھی طرح واضح کر دیا تھا کہ وہ سیاست میں براہ راست دخل انداز نہ ہوں۔ تاہم اخلاقی رہنمائی تو ہمارے فرائض میں شامل ہے۔ مذہب کو سیاست سے کلیتاً الگ نہیں کیا جا سکتا بلکہ یہ تمام مذاہب کا فرض ہے کہ وہ سیاستدانوں کو بھی ان کی اخلاقی ذمہ داریاں

یاد دلاتے رہیں۔

یعنی ہم پر لازم ہے کہ ہم مشورہ تو دیں لیکن کسی قسم کی دخل اندازی نہ کریں"۔

چنانچہ آپ نے اس وقت بھی یہ بات بار بار دوہرائی اور بعد میں بھی کہ اگرچہ جماعت احمدیہ ایک اسلامی ریاست کے تصور کی حمایت کرتی ہے اور اگرچہ اسلام ایک ہمہ گیر مذہب ہے لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اسلامی ریاست کا نظم ونسق مولویوں کے سپرد کر دیا جائے۔ آپ نے فرمایا:۔

"اسلامی تعلیم کا نچوڑ اور خلاصہ یہ ہے کہ اسلامی ریاست میں مختلف مذاہب میں تفریق روا نہ رکھی جائے۔ اور نہ ہی ایک خاص مذہب کے پیروکاروں سے دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کے مقابلے میں کسی قسم کا ترجیحی سلوک کیا جائے"۔

انیسویں صدی کے نصف اول میں سکھ اپنے زور بازو سے بہت سے ایسے علاقوں پر قابض ہو گئے تھے جو اس سے قبل مسلمانوں کے زیر تسلط تھے۔ سکھوں کے بعد برطانیہ اپنی فوجی قوت اور صنعتی انقلاب کے بل بوتے پر حکمران بنا اور انڈین ایمپائر وجود میں آئی۔

انیسویں صدی کے نصف آخر میں کیا سیاست اور کیا مذہب، ہندوستان کا مسلمان ہر لحاظ سے بری طرح افراتفری کا شکار ہو چکا تھا۔

مسلمانوں کی سیاسی تحریکات کا تجزیہ کرتے ہوئے پاکستان کے ایک سفیر نے لکھا کہ "انیسویں صدی کے نصف آخر میں ہندوستانی مسلمان روحانی تنزل اور گراوٹ کے عمیق ترین گڑھے میں جا گرے تھے اور ایسے سیاسی انتشار سے

دو چار تھے جس سے بچ نکلنے کی کوئی امید باقی نہیں رہی تھی۔"

بانی اسلام کی ایک پیش گوئی کے مطابق مسیح موعود کی آمد کا خاص مقصد یہ تھا کہ وہ دین اسلام کا احیاء کرے چنانچہ جب حضرت احمد کی پہلی کتاب شائع ہوئی تو ہندوستان کے کونے کونے میں مسلمان حلقوں میں اس کی بے حد تعریف کی گئی۔ چنانچہ ایک صاحب نے اس کتاب پر یہ تبصرہ کیا:

"میرے نزدیک یہ کتاب یعنی براہین احمدیہ ہمارے زمانے کے موجودہ حالات کے تناظر میں ایک منفرد مقام کی حامل ہے"۔ مولوی محمد حسین بٹالوی (جو ایک مشہور و معروف عالم دین تھے اور جو بعد میں (حضرت) مسیح موعودؑ کے شدید ترین مخالفین میں سے ایک ثابت ہوئے) نے لکھا کہ اسلام کی ساری تاریخ میں اس پائے کی کتاب آج تک نہیں لکھی گئی۔

مسلمانوں نے شروع شروع میں آل انڈیا کانگریس کی حمایت کی۔ کانگریس کا مطالبہ تھا کہ بحیثیت ایک قوم کے ہندوستانیوں کو آزاد کیا جائے۔ لیکن ۱۹۰۵ء میں مسلمانوں میں شکوک و شبہات پیدا ہونے شروع ہوئے۔ انہوں نے سوچا کہ ایسے ملک میں جہاں مسلمان ایک اور چار کی نسبت سے اقلیت میں ہوں گے وہاں ان کا مستقبل کیا ہوگا۔ برطانیہ نے ہندوستان میں ایک مضبوط مرکزی حکومت قائم کر دی تھی جس کی افواج اور انتظامیہ ایک اکائی کی طرح متحد و مشترک تھیں۔ اگرچہ کچھ برائے نام ریاستیں جن کے اپنے فرماں روا تھے برصغیر کے طول و عرض میں پھیلی ہوئی تھیں۔ ہندوستان کے متعلق برطانیہ کی حکمت عملی کا مرکزی تصور صرف اس قدر تھا کہ ہندوستان جغرافیائی اور سیاسی لحاظ سے ایک وحدت ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ اس وحدت کو قائم رکھنے کی کوشش میں حسن انتظام اور حکومتی گرفت کو قربان کر دیا جائے۔ چنانچہ ۱۹۰۵ء میں لارڈ کرزن

وائسرائے ہند نے اعلان کیا کہ بنگال کا انتظامی بوجھ ناقابل برداشت حد تک بوجھل اور بے قابو ہو چکا ہے۔ ضروری ہے کہ اسے دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے اور دوسرے صوبے کا نام مشرقی بنگال اور آسام رکھا جائے۔ مشرقی بنگال کے مسلمان کاشت کاروں نے تو اس فیصلے کا استقبال کیا۔ لیکن بنگالی ہندوؤں نے اس کی سخت مخالفت کی۔ یہ وہ اولین آثار تھے جن سے بعض کے نزدیک یہ واضح ہو گیا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے سیاسی اور اقتصادی مفادات میں بُعد المشرقین ہے۔ اس کا ایک نتیجہ تو یہ نکلا کہ ایک سال کے بعد ۱۹۰۶ء میں ڈھاکہ میں آل انڈیا مسلم لیگ کی تشکیل عمل میں آگئی۔ آہستہ آہستہ متحدہ ہندوستان کے تصور کو گھن لگنا شروع ہو گیا۔ ۱۹۱۱ء میں ہندوؤں کے دباؤ میں آ کر وائسرائے نے ہتھیار ڈال دیے اور تقسیم بنگال کا فیصلہ منسوخ کر دیا گیا۔ وائسرائے کے اس فیصلے سے بہت سے مسلمانوں کی آنکھیں کھل گئیں اور ہندوستان میں دو قومی نظریے کے نقوش واضح ہونے شروع ہو گئے۔

جماعت احمدیہ بحیثیت جماعت مسلمانوں کے اس سیاسی عمل کی صف اول میں سرگرم عمل تھی۔ ۱۹۲۸ء میں آل انڈیا کانگریس کی مقرر کردہ ایک کمیٹی نے ہندوستان کے لئے ایک آئینی خاکہ پیش کیا (حضرت) خلیفہ ثانیؓ نے اپنی کتاب "نہرو رپورٹ اور مسلمانوں کے حقوق" میں ان خطرات سے خبردار کیا جو اس خاکے کے نتیجے میں مسلمانوں کو پیش آ سکتے تھے۔

اس سے کچھ عرصہ پیشتر ایک معزز مسلمان مولانا محمد علی جوہر نے ہندوستان میں ایک مسلمان ریاست کے قیام کے سلسلے میں جماعت احمدیہ کی مساعی کی تعریف کرتے ہوئے کہا۔

"یہ انتہائی ناشکرے پن کی بات ہوگی اگر ہم خلیفہ ثانی اوران کی مساعی کا ذکر نہ کریں جوانہوں نے بلالحاظ اختلافات عقائد مسلمانوں کی فلاح وبہبود کے لئے وقف کرر کھی ہیں۔ یہ ایک طرف تو مسلمانوں کی سیاست میں عملی دلچسپی لے رہے ہیں۔ اور دوسری طرف مسلمانوں کے اتحاد۔ تنظیم۔ تجارت اور تبلیغ کے میدان میں ترقی کی راہیں ہموار کر رہے ہیں۔ وقت آتا ہے جب مسلمانوں کے اس منظم فرقے کا کردار جمہور مسلمانوں کے لئے عموماً اور ان لوگوں کے لئے خصوصاً جو بسم اللہ کے گنبدوں میں بیٹھ کر خدمت اسلام کے فخریہ اور بلند بانگ دعاوی کرنے کے عادی ہیں مشعل راہ ثابت ہوگا"۔

(حضرت) خلیفہ ثانی اور ان کی قیادت میں جماعت احمدیہ نے مسلمانان کشمیر کے بنیادی، انسانی، سماجی اور سیاسی حقوق کے حصول کے لئے ایک اہم اور تاریخی کردار ادا کیا۔ یہ کسے علم نہیں کہ کشمیر میں ایک مطلق العنان ہندو مہاراجہ کی حکومت تھی۔

پاکستان کو معرض وجود میں لانے کے سلسلے میں جماعت احمدیہ نے ایک کلیدی اور تاریخ ساز کردار ادا کیا۔ یہ جماعت احمدیہ ہی تھی جس نے قائداعظم محمد علی جناح کو ہندوستان واپس آنے پر آمادہ کیا تاکہ وہ ایک آزاد مسلم ریاست کے قیام کے لئے اپنی جدوجہد جاری رکھ سکیں۔ قائداعظم نے جو اس وقت مسٹر جناح کہلاتے تھے۔ تیسری گول میز کانفرنس منعقدہ ۱۹۳۲ء کے موقع پر مسلمانوں کی باہمی نااتفاقی سے مایوس ہو کر لندن میں مستقل قیام کا فیصلہ کر لیا تھا۔ جہاں وہ اپنی

قانون کی پریکٹس جاری رکھنا چاہتے تھے۔ (حضرت) خلیفہ ثانی کو یقین تھا کہ مسٹر جناح ہی وہ واحد شخص تھے جو اپنے تجربے، قابلیت اور سیاسی بصیرت کی وجہ سے مسلمانوں کی صحیح راہنمائی کر سکتے تھے۔ چنانچہ آپ نے جناب مولانا اے۔ آر۔ درد ایم۔ اے سے جو ان دنوں جماعت احمدیہ کے لندن مشن میں بطور مشنری کام کر رہے تھے فرمایا کہ وہ مسٹر جناح کو ہندوستان واپس آنے پر آمادہ کریں۔

بالآخر درد صاحب اس مقصد کے حصول میں کامیاب ہوئے۔ چنانچہ مسٹر جناح کی لندن سے روانگی سے پہلے عید کے موقع پر لندن مسجد میں وسیع پیمانے پر ایک دعوت کا اہتمام کیا گیا۔ اس موقع پر دو سو مہمانوں کی موجودگی میں قائداعظم مسٹر محمد علی جناح نے اعلان کیا کہ یہ درد صاحب ہی ہیں جنہوں نے مجھے ہندوستان واپس جانے پر آمادہ کیا ہے۔ اور فرمایا کہ امام یعنی درد صاحب کے فصیح و بلیغ دلائل کے سامنے میں عاجز آگیا اور ہندوستان واپسی کے سوا میرے لئے کوئی چارہ نہ رہا۔ اس داستان کا باقی حصہ اب تاریخ کا حصہ بن چکا ہے۔ مسٹر جناح ہندوستان واپس آئے اور انہوں نے ہندوستان میں بسنے والے مسلمانوں کے سیاسی حقوق کے حصول کی جدوجہد کا پھر سے آغاز کیا۔ چنانچہ ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو مسٹر جناح جو اب مسلمانوں کے مسلمہ قائداعظم بن چکے تھے، کی زیر صدارت آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاس ہوا جس میں ہندوستان کے آئندہ آئینی ڈھانچے سے متعلق وہ تاریخی قرارداد پاس کی گئی جس کا مرکزی پیراگراف درج ذیل ہے:۔

"آل انڈیا مسلم لیگ کا یہ اجلاس پورے غور و فکر کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ اس ملک کا کوئی آئینی منصوبہ قابل عمل نہیں ہو گا اور نہ ہی مسلمانوں کے نزدیک قابل قبول ہو گا جب تک اسے مندرجہ ذیل خطوط اور بنیادی اصولوں پر

استوار نہ کیا جائے یعنی یہ کہ جن وحدتوں کی جغرافیائی حدود باہم ملتی ہوں ان کو ضروری ردوبدل کے بعد اس طرح اکٹھا کردیا جائے کہ جہاں جہاں مسلمان تعداد کے لحاظ سے اکثریت میں ہوں وہاں خود مختار ریاستیں معرض وجود میں آجائیں۔ جن میں شامل وحدتیں بھی آزاد اور خود مختار ہوں"۔

بالآخر قائداعظم محمد علی جناح کی ولولہ انگیز قیادت میں ۱۹۴۷ء میں پاکستان بن گیا۔

11

جدوجہد آزادی

ایک اسلامی ریاست کے قیام کی یہ حمایت جماعت احمدیہ کو بہت مہنگی پڑی' پہلے تو یہ ہوا کہ وائسرائے ہند کی حکومت نے جماعت کی بہت کڑی نگرانی شروع کردی' ۱۹۳۴ء میں پنجاب میں خصوصاً اور ہندوستان کے دیگر علاقوں میں عموماً جماعت احمدیہ کے خلاف وسیع پیمانے پر فسادات شروع ہو گئے۔ احمدیوں کے خلاف لوٹ مار کا بازار گرم ہو گیا' ان کے مکان جلادیئے گئے۔ یہ ایک بالکل نئی صورت حال تھی۔ اس سے پہلے احمدیوں پر ظلم و ستم تو ہوتا تھا' انہیں ہراساں تو کیا جاتا تھا' لیکن یہ سب کچھ انفرادی سطح پر ہوتا تھا۔ جماعت احمدیہ کے خلاف بحیثیت مجموعی اس سے پہلے کبھی اس قسم کی جماعت مخالف تحریک نہیں چلائی گئی تھی۔ اب کی بار اس تحریک کی قیادت جماعت احمدیہ کی ایک مخالف تنظیم مجلس احرار کر رہی تھی جو جماعت احمدیہ کی ایک جانی دشمن تنظیم تھی۔

اب تاریخ کی سٹیج پر ایک صاحب نمودار ہوئے جن کا نام ایمرسن

(Mr Emerson) تھا۔ یہ صوبہ پنجاب کے گورنر تھے، مسٹر ایمرسن نے الٹا جماعت احمدیہ کو ہی اس جماعت مخالف تحریک کا ذمہ دار ٹھہرایا۔ اس نے انڈیا آفس کو اپنی رپورٹ میں لکھا کہ احمدیوں کا یہ عقیدہ کہ یسوع مسیح کی وفات صلیب پر نہیں ہوئی نہ صرف عیسائیت کی بقا کے لئے زہر ہلاہل کا حکم رکھتا ہے بلکہ برٹش ایمپائر کے لئے بھی خطرے کا الارم ہے۔ احمدیوں کا وجود ہمیشہ فرقہ وارانہ فسادات کو دعوت دیتا رہے گا۔ اس لئے ضروری ہے کہ پوری منصوبہ بندی اور انتہائی سنجیدگی سے ان کی کڑی نگرانی کی جائے اور ان کی شہرت اور ساکھ کو ختم کیا جائے۔ چنانچہ اس نے حکم دیا کہ (حضرت) خلیفۃ المسیح الثانی کے سب خطبات کو حرف بحرف شارٹ ہینڈ میں لکھ کر باقاعدگی سے اسے پہنچایا جائے اور اگر ان خطبات میں بغاوت کا شائبہ بھی پایا گیا تو (حضرت) خلیفۃ المسیح الثانی کو عدالت میں پیش کر کے جیل میں ڈال دیا جائے۔ اس کے بعد تو ایک طرح کا معمول بن گیا کہ ہر جمعہ کو پولیس کا ایک موٹر سائیکل سوار قادیان آتا اور (حضرت) خلیفۃ المسیح الثانی کے خطبہ جمعہ کو شارٹ ہینڈ میں لکھ کر لے جاتا۔ مسٹر ایمرسن نے بعد میں باتوں باتوں میں چوہدری محمد ظفر اللہ خان کو جو ایک ممتاز اور معروف احمدی تھے بتایا: کہ امام جماعت احمدیہ تو (E.E.L) ایل مچھلی کی طرح ہیں، پکڑنے کی کوشش کرو تو نہ جانے کس طرح پھسل کر ہاتھ سے نکل جاتے ہیں۔ میں جب ان کے خطبات کی نقول پڑھتا ہوں تو یوں لگتا ہے جیسے وہ میری گرفت میں آ گئے ہوں لیکن اگلے ہی ایک دو فقرے ایسے ہوتے ہیں جو میری امیدوں کو خاک میں ملا دیتے ہیں اور مرزا صاحب میری گرفت سے بچ کر نکل جاتے ہیں"۔

جماعت احمدیہ کا سیاسی فلسفہ کیا تھا، وہی جسکی تعیین بحیثیت جماعت (حضرت) بانی جماعت احمدیہ (علیہ السلام) فرما گئے تھے۔ اور وہ یہ تھا کہ اگر حکومت

مذہبی اور سیاسی آزادی کی ضمانت دے اور شہریوں پر پُرامن ترقی کے راستے بند نہ کرے تو ایسی حکومت اچھی حکومت سمجھی جائے گی اور جماعت کو بحیثیت جماعت ایسی حکومت کی تائید کرنی چاہئے اور اس سے تعاون کرنا چاہئے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ افراد اپنی انفرادی حیثیت میں سیاسی حقوق کا مطالبہ نہ کریں، چنانچہ اسی ضمن میں (حضرت) خلیفہ رابع فرماتے ہیں:

> "جماعت احمدیہ کا من حیث الجماعت سیاست سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ ایک سو فیصد غیر سیاسی جماعت ہے۔ بایں ہمہ ہر احمدی کے کسی بھی ملک کے شہری ہونے کے ناطے کچھ سیاسی حقوق بھی ہیں۔ جماعت افراد کے ان انفرادی حقوق کی نفی نہیں کرتی، ذاتی اور انفرادی حقوق کا جتنا بھی شعور بڑھے گا اور اس کا جائز استعمال ہوگا اتنی ہی بہتر سے بہتر ملک کی خدمت بھی کی جاسکے گی"۔

جماعت احمدیہ نے ایک اسلامی ریاست کے قیام کے لئے جس جوش و جذبہ کا مظاہرہ کیا اور گورنر پنجاب نے جو وائسرائے ہند کی انگریز حکومت کا سرکاری نمائندہ تھا جس طرح نیم سرکاری طور پر کھلے بندوں جماعت احمدیہ کی مخالفت کی اس سے جماعت کے مخالفین کے اس پراپیگنڈے اور ان کے آئے دن کے بیانات کا پول کھل جاتا ہے، جن کا مفہوم یہ ہے کہ جماعت احمدیہ انگریز کا خود کاشتہ پودا ہے۔ اصل بات یہ تھی کہ مسلمانوں کو آپس میں لڑا کر آسانی سے ان پر حکومت کی جاسکتی تھی۔ اگرچہ برطانیہ سے ہندوستان واپسی کے موقع پر قائداعظم محمد علی جناح نے لندن مسجد میں دی گئی چائے کی دعوت کے موقع پر جو بیان دیا تھا اس کا برطانیہ کے قومی اخبارات نے کھل کر چرچا کیا تھا وہ ریکارڈ پر

موجود ہے اور چھپائے سے چھپ نہیں سکتا۔ اس کے مزید تحریری ثبوت بھی موجود ہیں۔ پھر نہ جانے کیوں مسلسل غلط بیانی سے کام لیا جارہا ہے اور یہ بے بنیاد الزام تراشی اور پراپیگنڈہ ختم ہونے میں نہیں آتا۔ بدقسمتی سے یہ ایک افسوس ناک حقیقت ہے کہ اگر کسی دروغ بے فروغ اور جھوٹے الزام کو پوری ڈھٹائی سے بار بار دہرایا جائے تو لوگ عموماً اس جھوٹ کو سچ سمجھ کر قبول کرلیا کرتے ہیں'

۱۹۴۷ء میں تقسیم ہند کے موقع پر مذہبی جنون کا جو المناک اور لرزہ خیز مظاہرہ ہوا وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ جماعت نے ان دنوں انسانی جان اور اموال کے رضاکارانہ تحفظ کی خاطر ایک رضاکار تنظیم قائم تو کی' لیکن جب تقسیم ملک عمل میں آگئی تو جماعت احمدیہ کو بھی دوسرے مسلمانوں کی طرح اپنے گھربار چھوڑ کر پاکستان میں پناہ لینی پڑی۔

۱۹۵۳ء میں ایک بار پھر خالصتاً سیاسی وجوہ کی بنا پر جماعت کے خلاف پنجاب کے طول و عرض میں وسیع پیمانے پر فسادات ہوئے یا کروائے گئے۔ اس کے بعد بھی تقریباً بیس سال تک کہیں نہ کہیں احمدیوں پر عرصہ حیات تنگ کرنے کے اکادکا واقعات بدستور ہوتے رہے۔ پاکستان متعدد اندرونی مسائل سے دوچار تھا' سرفہرست کشمیر کا مسئلہ تھا جہاں کی غالب اکثریت مسلمان تھی اور جسے بھارت نے طاقت کے بل بوتے پر اپنے اندر شامل کرلیا تھا۔

قیام پاکستان کے ابتدائی سالوں میں احمدیوں نے پاکستان کے تشخص کو اجاگر کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ بہت سے احمدی افواج پاکستان میں جرنیل کے عہدے تک جا پہنچے۔ ملک کے اولین وزیر خارجہ چوہدری محمد ظفراللہ خاں ایک معروف احمدی تھے۔ اسی طرح جناب ایم ایم احمد وزیر خزانہ☆ تھے۔ کئی احمدی

☆ آپ مرکزی مشیر خزانہ تھے۔ مترجم

سفیر بنے۔ جہاں جہاں احمدی حضرات کو خدمت کا موقع ملا انہوں نے اس کا پورا حق ادا کیا اور یہ اپنے مفوضہ فرائض کی ادائیگی میں توقعات سے کہیں بڑھ کر کامیاب رہے۔ ان کا سب سے بڑا یہی قصور ثابت ہوا۔ بقول شخصے "اے روشنی طبع تو بر من بلا شدی۔"

ہر احمدی برضاو رغبت اپنی آمد کا سولہواں حصہ جماعت کو بطور طوعی چندہ کے پیش کرتا ہے اور یہ مالی قربانی جزو ایمان سمجھ کر پیش کرتا ہے۔ کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو زندگی بھر نہ صرف اپنی آمد کا دسواں حصہ جماعت کی خدمت میں پیش کرتے رہتے ہیں۔ بلکہ وفات کے بعد بھی اپنی جائداد کے دسویں حصے کی جماعت کے حق میں وصیت کر دیتے ہیں۔ یہ لوگ موصی یعنی وصیت کرنے والے کہلاتے ہیں۔ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو جماعت کو اپنی آمد اور جائداد کا تیسرا حصہ ادا کرنے کا عہد کرتے ہیں۔

یہ آمد علاوہ دوسرے رفاہی کاموں کے سکولوں کے اجرا اور ذہین طلباء وطالبات کے لئے وظائف پر خرچ کی جاتی ہے۔ اس طرح پاکستان جیسے ملک میں جہاں وسائل محدود ہیں احمدی بچوں اور بچیوں کو زندگی کے آغاز ہی میں تعلیمی امداد اور سہولت میسر آجاتی ہے۔

مسٹر ذوالفقار علی بھٹو سے صاحبزادہ مرزا طاہر احمد کا تعارف بھی کچھ اسی قسم کے تناظر میں ہوا۔ ۱۹۶۵ء میں ہندوستان سے سرحدی جنگ کے دوران جنرل اختر ملک نے جو ایک معروف احمدی تھے کشمیر کے وسیع علاقے کو حیرت انگیز اور ڈرامائی انداز میں فتح کر لیا تھا۔ جنرل اختر ملک کی یہ کامیابی ہی ذوالفقار علی بھٹو سے تعارف کا سبب بنی (اور اسی کے بعد صاحبزادہ طاہر احمد اور مسٹر بھٹو دونوں میں ایک قسم کا لازم وملزوم اور دو طرفہ تعلق قائم ہو گیا تھا۔)

یہاں تک کہ جنرل ضیاء کی آمریت کے دور میں ذوالفقار علی بھٹو کو تختہ دار پر لٹکا دیا گیا۔

☆ ☆ ☆

12

بھٹو اور پاکستان کے کمیونسٹ

ذوالفقار علی بھٹو اقوام متحدہ کے ایوان میں پاکستان کے پُرجوش دفاع کے بعد ایک عظیم قومی ہیرو بن کر ابھرے۔ اپنی تاریخی تقریر کے دوران بھٹو صاحب نے بڑے پُرجوش الفاظ میں اعلان کیا کہ پاکستان مسلمانان کشمیر کو کبھی بے یارومددگار نہیں چھوڑے گا۔ انہوں نے بغیر لگی لپٹی رکھے اس عزم کو دھرایا کہ یہ جدوجہد خواہ کتنی ہی لمبی کیوں نہ ہو جائے بہرحال جاری رہے گی اور کشمیر کے مسلمان ایک نہ ایک دن ضرور اپنی مادر وطن سے آن ملیں گے۔ اس تقریر کا ذکر کرتے ہوئے حضرت امام جماعت احمدیہ نے فرمایا: ”یہ تقریر کیا تھی، فصاحت و بلاغت کا ایک جیتا جاگتا شاہکار تھی۔ اس تقریر نے ذوالفقار علی بھٹو کو راتوں رات ایک قومی ہیرو بنا دیا، میرے بڑے بھائی (حضرت) حافظ مرزا ناصر احمد ابھی خلیفہ منتخب نہیں ہوئے تھے، میرے والد بزرگوار پر قاتلانہ حملہ ہو چکا تھا اور وہ اس کے نتیجے میں علیل تھے، ان کی اس علالت کے باعث میرے بڑے بھائی بعض امور میں ان کی

نمائندگی کے فرائض سرانجام دیا کرتے تھے۔ انہوں نے مجھے یاد فرمایا اور اسلام آباد جاکر ذوالفقار علی بھٹو سے ملاقات کرنے کے لئے حکم دیا اور فرمایا کہ آپ جاکر انہیں بتائیں کہ ان کی ولولہ انگیز اور پُر جوش تقاریر نے جو اقوام متحدہ کے سامنے انہوں نے کی ہیں ہمیں بہت متاثر کیا ہے اور انہیں یقین دلائیں کہ ہم ان کی قدر کرتے ہیں اور ان کے موقف کی پوری تائید کرتے ہیں اور پاکستان کے محب وطن شہری ہونے کی حیثیت سے ان کی حمایت کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔

"ذوالفقار علی بھٹو میری بات سنتے ہی کہنے لگے کہ اس گفتگو کے لئے ڈرائنگ روم محفوظ جگہ نہیں ہے۔ وہ مجھے ایک اور کمرے میں لے گئے جہاں صرف ایک میز اور چند کرسیاں پڑی تھیں بہت باتیں ہوئیں اور ہمارے باہمی تعلقات میں ایک دوستانہ رنگ پیدا ہو گیا"۔

یہ ان دونوں کی پہلی ملاقات تھی۔ پھر ایک لمبا وقفہ پڑ گیا اور کئی سال تک ان کی کوئی ملاقات نہ ہوئی یہاں تک کہ مسٹر بھٹو نے انہیں پیغام بھجوایا کہ آکر مل جائیں۔ مارشل لاء کے دن تھے، عام انتخابات کی آمد آمد تھی۔ انتخابات میں حصہ لینے کے لئے مسٹر بھٹو جیل سے رہا ہو چکے تھے۔ صاحبزادہ طاہر احمد کے بڑے بھائی (حضرت حافظ مرزا) ناصر احمد اس اثنا میں خلیفہ منتخب ہو چکے تھے، ان کی اجازت سے صاحبزادہ طاہر احمد کی مسٹر بھٹو سے ملاقات ان کی رہائش گاہ پر ہوئی، پرانی یادیں تازہ کرتے ہوئے (حضرت) خلیفہ رابع کہتے ہیں۔

"مسٹر بھٹو بہت ہی دوستانہ ماحول میں ملے۔ پہلے اپنی انتخابی مہم کا تذکرہ چھیڑا پھر اس مہم کو بخیر و خوبی انجام تک پہنچانے کے لئے مالی تنگی کا ذکر بھی کیا، اپنی اس تقریر کی بات

بھی کی جو وہ اگلے دن ٹیلیویژن پر کرنے والے تھے ۔

میں نے پوچھا "کیا میں تقریر کے مسودے کو ایک نظر دیکھ سکتا ہوں" اس پر انہوں نے ڈاکٹر مبشر حسن کو بلوایا جن کی زیر نگرانی انتخابی مہم کی منصوبہ بندی کی گئی تھی بھٹو صاحب مجھے اور ڈاکٹر مبشر حسن کو باہم گفتگو کے لئے تنہا چھوڑ کر خود ایک کانفرنس میں شرکت کے لئے چلے گئے۔ اس پہلی ہی ملاقات میں ڈاکٹر مبشر حسن نے مجھے بے حد متاثر کیا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ ایک صاف دل، صاف گو اور شریف النفس انسان ہیں اور منافقت اور دوغلہ پن ان کی طبیعت سے کوسوں دور ہے۔

لیکن بایں ہمہ ڈاکٹر صاحب کی انتخابی منصوبہ بندی اور حکمت عملی مجھے پسند نہیں آئی میرا خیال تھا کہ سائنسی سوشل ازم کے بلند بانگ دعاوی اور موشگافیاں عوام کی سمجھ میں نہیں آئیں گی، اس سے کئی گنا زیادہ اہمیت انصاف اور انسانی مساوات کے اس فلسفے کی ہے جو (حضرت) محمد مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے پیش کیا ہے میں نے مشورہ دیا کہ بہتر ہو گا کہ ان نامانوس اصطلاحات کی بجائے اسلامی اصطلاحات استعمال کی جائیں۔ میرا خیال تھا کہ پارٹی کے بائیں بازو سے تعلق رکھنے والے انتہا پسند اراکین مسٹر بھٹو کو ایک گونہ اغواء کرنے کی کوشش میں ہمہ تن مصروف تھے اور بھٹو کی ذاتی مقبولیت سے فائدہ اٹھا کر اپنا الو سیدھا کرنے کے

منصوبے بنا رہے تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ کسی نہ کسی طرح مسٹر بھٹو کی مقبولیت کو اشتراکیت کا لبادہ پہنا دیا جائے۔"

(حضرت) خلیفہ رابع کہتے ہیں:

"جب بھٹو صاحب واپس آئے تو انہوں نے میری باتوں کو توجہ سے سنا۔ گفتگو کی تان اس مالی امداد پر آن کر ٹوٹی جس کی انہیں توقع تھی کہ ہم انہیں دے سکیں گے، میں نے انہیں صاف صاف بتا دیا کہ ایسی مدد کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ ہم تو ایک خالصتاً مذہبی جماعت ہیں بہرحال میرے مشورے کو انہوں نے سنجیدگی اور دلچسپی سے سنا"۔

اس کے بعد بھی صاحبزادہ طاہر احمد نے انہیں موقعہ کی مناسبت سے نہایت مفید اور فیصلہ کن اور نتائج کے لحاظ سے دور رس اہمیت کے حامل مشورے دیئے۔ ان کے نزدیک پاکستان پیپلز پارٹی میں طالع آزما لوگوں کی بھرمار تھی، لیکن انتہائی بائیں بازو سے تعلق رکھنے والے اس صورت حال سے دوچار نہیں تھے، وہ منظم بھی تھے اور بظاہر اپنے مقاصد کے حصول میں مخلص بھی۔

انہوں نے اس امر کو یقینی بنا لیا تھا کہ قومی اسمبلی کا الیکشن لڑنے والے امیدواروں کی آخری اور حتمی فہرست میں کم از کم ۷۰ فیصد امیدوار یا تو کمیونسٹ ہوں یا ان کے ہم خیال۔ تاکہ کامیابی کی صورت میں پاکستان میں اقتدار کی باگ ڈور ان کے اپنے ہاتھ میں آجائے۔

"میں نے اپنے تاثرات اور خدشات سے بھٹو صاحب کو آگاہ کرتے ہوئے انہیں خبردار کیا کہ اگر آپ چاہتے ہیں کہ اقتدار کمیونسٹوں کو مل جائے تو آپ کی مرضی، ورنہ بہتر

ہو گا کہ انتخابی امیدواروں کی فہرست کا آپ دوبارہ جائزہ
لیں' اور احتیاط سے قدم اٹھائیں۔"

بعد میں ہونے والے واقعات سے یہ بات کھل کر سامنے آگئی کہ بھٹو صاحب کی یہ نیت تھی ہی نہیں کہ وہ دائیں یا بائیں بازو کے قبضہ قدرت میں آجائیں، وہ چاہتے تھے کہ دونوں دھڑوں میں نازک سا توازن برقرار رہے تاکہ اقتدار پر ان کی اپنی گرفت مضبوط رہے۔

چنانچہ بھٹو صاحب نے فوراً پارٹی کے سینئر اراکین کا ہنگامی اجلاس طلب کیا اور بلاتوقف اخبارات میں اعلان کروا دیا کہ امیدواروں کی انتخابی فہرست حتمی نہیں ہے۔ چنانچہ پارٹی کے سینئر اراکین پر مشتمل ایک کمیٹی کا قیام عمل میں لایا گیا جسے یہ ذمہ داری سونپی گئی کہ وہ انتخابی فہرست کی نظر ثانی کے بعد اپنی سفارشات پیش کرے۔

نتیجتاً امیدواروں کی خاصی تعداد فہرست سے خارج کر دی گئی۔ نئی فہرست میں شامل امیدوار انتخابات میں بھاری اکثریت سے کامیاب ہو گئے اور بھٹو صاحب وزیر اعظم بن گئے۔

ان دنوں کا ذکر کرتے ہوئے جماعت احمدیہ سے تعلق رکھنے والے ایک امیر جماعت نے یہ تبصرہ کیا:

"(حضرت) مرزا طاہر احمد ہیں تو ابھی نوخیز نوجوان لیکن انہوں نے پہلے ملک کو درپیش مسائل اور حالات کا بنظر غائر اور غیر معمولی بصیرت کے ساتھ تجزیہ کیا پھر اس کی روشنی میں اپنی عظیم صلاحیتوں' قوت کار اور آہنی عزم سے کام لیتے ہوئے اس مقصد کو بآسانی حاصل کر لیا جس کے حصول کا وہ

پہلے سے ارادہ کر چکے تھے۔ اس دوران ان کی عظیم قائدانہ صلاحیتوں اور مسلسل اور انتھک محنت کی قوت اور بے لوث لگن اور جذبے سے کام کرنے کی حیرت انگیز صلاحیت کا بھرپور مظاہرہ دیکھنے میں آیا۔"

انتخابات کے بعد صاحبزادہ مرزا طاہر احمد بھٹو صاحب سے ملاقات کے لئے گئے تو گفتگو کچھ اس طرح شروع ہوئی:

صاحبزادہ مرزا طاہر احمد: جناب میں آپ سے رخصت لینے اور آپ کو الوداع کہنے کے لئے آیا ہوں۔

مسٹر بھٹو: (حیرت کے ساتھ) کیسی رخصت اور الوداع اور کیوں؟

صاحبزادہ صاحب: اب ماشاء اللہ آپ اقتدار کی کرسی پر متمکن ہو چکے ہیں عنقریب آپ کے اردگرد خوشامدیوں اور حاشیہ برداروں کا جمگھٹا ہونے والا ہے جو آپ کی تعریف کرتے ہوئے نہیں تھکیں گے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے مجھے تو حاشیہ نشینی کی خواہش ہے نہ عادت۔ میں تو آپ کی خدمت میں صرف تلخ حقائق پر مبنی مشوروں کی کڑوی گولیاں ہی پیش کر سکتا ہوں' جو شاید آپ کو پسند نہ آئیں۔

مسٹر بھٹو: میں جانتا ہوں کہ آپ ایک سچے اور صاف گو انسان ہیں۔ میں یقین دلاتا ہوں کہ میں آپ کے مشوروں کا بُرا نہیں مناؤں گا۔

جب تک بھٹو صاحب صدر اور بعد میں وزیر اعظم کے منصب پر فائز رہے ان دونوں کی باہم ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ عموماً گفتگو یا تو پاکستان کے حالات حاضرہ پر

ہوا کرتی تھی یا پھر آجا کر اس بات پر تان ٹوٹتی تھی کہ پیپلز پارٹی نے رائے دہندگان سے جو وعدے کئے تھے وہ پورے نہیں کئے گئے۔ ایک ملاقات اور بھی ہوئی جس میں صاحبزادہ طاہر احمد نے احتجاج کیا کہ پاکستان گورنمنٹ جماعت احمدیہ کے ساتھ بلا جواز سخت بدسلوکی کر رہی ہے 'جو سراسر انصاف کے تقاضوں کے منافی ہے یہاں تک کہ جماعت کی املاک اور تعلیمی اداروں پر بھی حکومت نے قبضہ کر لیا ہے۔ آہستہ آہستہ صاحبزادہ صاحب کو اس بات کا بخوبی اندازہ ہو گیا کہ بھٹو صاحب جماعت احمدیہ کے مخالفین میں گھر کر رہ گئے ہیں۔ قطع نظر اس کے کہ ان مخالفین کا تعلق پی پی پی سے تھا یا نہیں' آپ جانتے تھے کہ اس سے بڑھ کر اور سادہ لوحی کیا ہو سکتی ہے کہ بھٹو صاحب سے یہ توقع کی جائے کہ وہ احمدیوں کے جائز حقوق کی حفاظت کی خاطر اپنی سیاسی ساکھ کو داؤ پر لگا دیں۔

ظاہر ہے کہ ان کے باہمی تعلقات میں اب وہ پہلی سی گرمجوشی نہیں رہی تھی بایں ہمہ بھٹو صاحب نے اپنی ملنساری اور وضع داری میں فرق نہیں آنے دیا۔ وہ ان کی تنقید کو بھی بدستور خندہ پیشانی سے قبول کرتے رہے اور اپنے وعدے کے مطابق صاحبزادہ صاحب کی کھری کھری سن کر بھی کبھی پیشانی پر بل نہیں لائے۔

☆ ☆ ☆

13

اسلامی کانفرنس اور مسئلہ خلافت

مسٹر بھٹو نے خواہش ظاہر کی تھی کہ صاجزادہ مرزا طاہر احمد سے ان کی ملاقات مہینے میں ایک بار ضرور ہوا کرے لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ان ملاقاتوں کا تواتر قائم نہ رہا۔

جب بھٹو صاحب نے واشنگٹن سے مسٹر ایم احمد کو بجٹ کے سلسلے میں مشورے کے لئے بلایا تو ان سے شکایتاً کہا کہ صاجزادہ مرزا طاہر احمد اب مجھ سے ملنے کے لئے نہیں آتے آپ جب ربوہ جائیں تو انہیں آمادہ کریں کہ وہ ملاقاتوں کا سلسلہ پھر سے شروع کر دیں۔ اس سلسلے میں مسٹر بھٹو نے (حضرت) خلیفۃ المسیح الثالث سے براہ راست رابطہ بھی کیا۔ آپ نے صاجزادہ سے فرمایا کہ بھٹو صاحب سے کبھی کبھی مل لیا کریں۔

اب کی بار جب بھٹو صاحب سے ان کی ملاقات ہوئی تو جناب مسٹر ایم احمد بھی ان کے ہمراہ تھے۔ ملاقات وزیر اعظم کی سرکاری رہائش گاہ پر ہوئی۔ رہائش

گاہ کے وسیع وعریض سبزہ زار میں شام کی چائے کا سامان سجا ہوا تھا۔ مسٹر ایم احمد کہتے ہیں۔

"وزیر اعظم اپنی آرام دہ کرسی پر سے اٹھے پہلے بڑی گرم جوشی کے ساتھ (حضرت صاحبزادہ) طاہر احمد سے معانقہ کیا پھر کہنے لگے۔ "یہ وہ حضرت ہیں جو اب مجھ سے ملنا تک گوارا نہیں کرتے"۔

ان دنوں کی یادیں آپ کے ذہن میں اچھی طرح سے محفوظ ہیں چنانچہ آپ فرماتے ہیں۔

"۱۹۷۳ء میں بھٹو صاحب نے پاکستان میں بڑے ٹھاٹھ سے اسلامی ممالک کی ایک کانفرنس منعقد کی۔ بھٹو صاحب کی شدید خواہش تھی اور ان میں اس کی صلاحیت بھی تھی کہ بین الاقوامی سطح پر ان کا تشخص ایک قد آور لیڈر کی حیثیت سے تسلیم کیا جائے۔ ظاہر ہے اس مقصد کے لئے پاکستان کی سٹیج تو بے حد محدود اور ناکافی تھی اس لئے کچھ عرصہ تک تو وہ تیسری دنیا کا لیڈر بننے کی کوشش میں لگے رہے، جس میں برطانیہ اور فرانس کی نو آبادیات اور دیگر ممالک شامل تھے۔ لیکن سوء اتفاق سے یہ گدی پہلے ہی پنڈت نہرو اور اس کی بیٹی مسز اندرا گاندھی کے قبضے میں آچکی تھی۔ چنانچہ مایوس ہو کر وہ دنیائے اسلام کا لیڈر بننے کے خواب دیکھنے لگے۔ اس سلسلے میں انہیں سعودی عرب کی پوری حمایت حاصل تھی، اس کے صلے میں کامیابی کی صورت میں جہاں بھٹو صاحب عالم

اسلام کے سرکردہ سیاسی لیڈر کی حیثیت سے ابھر کر سامنے آجاتے وہاں سعودی عرب کے فرمانروا کو بھی مسلمانوں کے روحانی سربراہ اور خلیفہ کے طور پر تسلیم کرالیا جاتا۔

انہی دنوں پاپائے روم نے تمام مسلمانوں سے اپیل کی تھی کہ وہ دنیا کے ساتھ مل کر کمیونزم کے خلاف متحدہ محاذ قائم کریں۔ ان کا روئے سخن بالخصوص سعودی عرب کی طرف تھا۔ اس وقت تو سعودی عرب کے حکمران اپنے سیاسی اثر و رسوخ کے لحاظ سے کسی شمار قطار میں نہیں تھے۔ اگرچہ ان کے ہاں دولت کی ریل پیل تھی اور وہ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں واقع خانہ کعبہ، مزارات و مقابر اور دیگر تاریخی اہمیت کے حامل ایسے مقامات مقدسہ کے متولی تھے جن سے مسلمانوں کا محبت اور احترام سے لبریز جذباتی رشتہ ہے۔ اور جن سے مسلمانوں کے محبوب ترین آقا محمد (مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم) کی محبوب اور مقدس یادیں وابستہ ہیں اور جن کی تولیت کی وجہ سے سعودیوں کو دنیائے اسلام میں ایک منفرد مقام حاصل رہا ہے۔

لیکن ان کی اس حیثیت کے سیاسی امکانات کا نہ تو کسی نے اب تک جائزہ لیا تھا اور نہ ہی اس حیثیت سے کماحقہ، فائدہ اٹھایا جاسکا تھا۔ یہ تو اسلامی دنیا کی بات تھی۔ لیکن اہل مغرب کے اپنے مفاد کا بھی تقاضا تھا کہ کسی نہ کسی طرح شاہ فیصل کو دنیائے اسلام کا روحانی پیشوا بنادیا جائے تاکہ مشرق

اوسط میں مغرب کے مفادات محفوظ ہو جائیں اور یہ سب کچھ اس طرح دبے پاؤں کیا جائے کہ سادہ لوح مسلمانوں کو اس کی خبر تک نہ ہونے پائے۔ بالفاظ دیگر لاؤڈ اسپیکرز پر اعلان تو ببانگ بلند مکہ معظمہ سے نشر کئے جا رہے ہوں لیکن ان کے مائیکروفون اور ان پر اعلان کرنے والے مغرب کے کسی گوشے میں چھپے بیٹھے ہوں۔

ظاہر ہے کہ اس منصوبہ کی راہ میں ایک ہی روک تھی جو ایک ناقابل عبور اور بلند و بالا پہاڑ کی طرح حائل تھی اور وہ تھی جماعت احمدیہ کی خلافت اور اس عظیم منصب اور ادارے کا پورے تمکن۔ تحریک اور استحکام کے ساتھ اس کا فعال قیام اور اس کی موجودگی۔ یہ تو ہو نہیں سکتا تھا کہ بیک وقت مسلمانوں کے دو خلفاء ہوں اس لئے انہیں اس کا ایک ہی حل نظر آیا اور وہ یہ تھا کہ خلافت احمدیہ کو سرے سے راستے سے ہٹا دیا جائے یا بالفاظ دیگر احمدیوں کے اسلامی تشخص کو ختم کر کے انہیں غیر مسلم قرار دے دیا جائے۔ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔

حل طلب مسئلہ ایک اور بھی تھا یعنی مسلمانوں کے فقہی مسالک کا باہمی اختلاف۔ مثلاً انڈونیشیا میں مسلمانوں کی غالب اکثریت شافعی ہے جبکہ سعودی وہابی ہیں۔ دونوں کی آپس میں نہیں بنتی' افریقی مسلمان مالکی ہیں اور ترک حنفی' دونوں وہابیوں کے سخت مخالف ہیں اگر ان ممالک کے علماء

سے براہ راست کہا جاتا کہ جتنے دام چاہو لے لو۔ اپنے فتاوئی
کی منہ مانگی قیمت وصول کرلو۔ لیکن فتوے ہماری مرضی کے
مطابق صادر کرو تو علماء رشوت کی اس پیشکش کو قبول کرتے
ہوئے شاید ہچکچاتے لیکن اگر یہی رقوم مساجد اور دینی
مدارس کی امداد کے نام پر پیش کی جاتیں تو علماء کو انہیں خندہ
پیشانی سے قبول کرلینے میں کوئی تامل نہ ہوتا اور اگر اس امداد
کو جماعت احمدیہ کی مخالفت کے ساتھ جس کی تباہی کے لئے
علماء اتنے عرصے سے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے تھے مشروط
کردیا جاتا تو انہیں اس شرط کے قبول کرنے میں کیا عذر
ہوسکتا تھا۔ وہ تو پہلے ہی جماعت کی مخالفت پر ادھار کھائے
بیٹھے تھے نتیجہ یہ نکلتا کہ دنیا بھر کے مسلمان سعودیوں کے زیر
اثر آجاتے اور کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوتی کہ پس پردہ کیا
کھیل کھیلا جاچکا ہے"۔

یہ تھی وہ سازش جسے صاحبزادہ مرزا طاہر احمد کی دوربین نگاہوں نے فوراً ہی
تاڑ لیا۔ سازش کیا تھی، بس یہی کہ شاہ فیصل کو ساری دنیائے اسلام اپنا روحانی
خلیفہ تسلیم کرلے اور مسٹر بھٹو ان کے زرخیز سیاسی دماغ کے طور پر کام کریں۔
چنانچہ صاحبزادہ صاحب نے وزیر خارجہ پاکستان مسٹر عزیز احمد کو اپنے ان خدشات
سے آگاہ کردیا اور انہیں بتایا کہ ان کے یعنی صاحبزادہ مرزا طاہر احمد کے علم کے
مطابق اسلامی کانفرنس کے موقع پر جماعت احمدیہ کے خلاف ایک باقاعدہ مہم کا
آغاز ہونے والا ہے تاہم وزیر خارجہ نے اس خیال سے اتفاق نہیں کیا اور کہا کہ
نہیں ہرگز نہیں۔ جماعت احمدیہ کے خلاف اس قسم کی کسی مہم کا کوئی امکان نہیں

نہ ہی کوئی منصوبہ بندی اس سلسلے میں کی گئی ہے بلکہ اس کے برعکس اسلامی کانفرنس کے موقع پر تو مذہبی پراپیگنڈے پر خواہ وہ کسی بھی نوعیت کا ہو، کڑی پابندی عائد کی جا رہی ہے۔ کسی مذہبی تنظیم کو ہرگز اجازت نہیں دی جائے گی کہ وہ کانفرنس میں شامل ہونے والے مندوبین میں کوئی پمفلٹ یا لٹریچر وغیرہ تقسیم کرے۔ آپ کو شاید علم نہ ہو کہ پہلے ہی ہمیں اردن اور شام جیسے ایک دوسرے کے سیاسی مخالفین کو ایک میز پر لا کر بٹھانے میں کیسے کیسے پاپڑ بیلنے پڑ رہے ہیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اس نازک صورت حال میں مذہبی اختلافات کا ایک اور شوشہ چھوڑ دیا جائے۔ جب صاحبزادہ مرزا طاہر احمد کی مسٹر بھٹو سے ملاقات ہوئی تو آپ نے ان کے سامنے بھی اپنے خدشات کا بغیر لگی لپٹی رکھے کھل کر اظہار کر دیا اس پر بھٹو صاحب نے یقین دلایا کہ جماعت احمدیہ کے خلاف کسی قسم کا پراپیگنڈہ نہیں کیا جائے گا۔ لیکن صاحبزادہ صاحب کو یقین تھا کہ یہ سب لفظی جمع خرچ ہے۔ ان کے پاس ناقابل تردید ثبوت موجود تھا۔ انہیں وہ پمفلٹ بھی مل چکے تھے۔ جنہیں جماعت اسلامی نے اور جماعت احمدیہ کی دیگر دشمن تنظیموں نے قبل از وقت چھپوا رکھا تھا اور جنہیں کانفرنس میں شرکت کرنے والے مندوبین میں وسیع پیمانے پر تقسیم کیا جانا مقصود تھا۔

کانفرنس شروع ہوئی تو فوراً ہی صاحبزادہ صاحب کے خدشات کی حرف بحرف تصدیق ہو گئی۔ بھٹو نے حکم دیا کہ جب کانفرنس میں شامل سربراہان مملکت اور مندوبین کے ساتھ بطور محافظ خاص اور بطور اے ڈی سی فوجی افسران کی ڈیوٹی لگائی جائے تو اس سلسلے میں بطور خاص یہ احتیاط کی جائے کہ کسی احمدی فوجی افسر کی ڈیوٹی نہ لگنے پائے۔

لیکن یہ راز انتہائی کوشش کے باوجود زیادہ دیر تک راز نہ رہ سکا۔ جب

افریقہ سے آنے والے ایک ملک کے وزیر اعظم کو کچھ جماعت مخالف دستاویزات دی گئیں تو انھوں نے یہ سارا پلندہ اپنے ایک احمدی دوست کو تھما دیا۔ اس طرح یہ دستاویزات بالآخر صاحبزادہ مرزا طاہر احمد تک پہنچ گئیں۔ دستاویزات کیا تھیں جماعت احمدیہ کے خلاف زہر افشانیوں اور غلط بیانیوں اور بے بنیاد پراپیگنڈے کا ایک طومار تھا جسے اس موقعے کے لئے بطور خاص تیار کیا گیا تھا۔ ان دستاویزات میں سے بعض تو پہلے ہی صاحبزادہ صاحب کی نظر سے گزر چکی تھیں، بعض اگر ان دیکھی تھیں تو ان کے متعلق سنا ضرور تھا۔ ان میں زیادہ تر ایسی تھیں جو بطور خاص اس غرض سے تیار کی گئی تھیں کہ جس طرح بھی ہو جماعت احمدیہ کی ساکھ کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا جائے اور خلیفہ وقت کے خلاف جی بھر کر کیچڑ اچھالا جائے۔

ہے تو ناقابل یقین لیکن یہ ایک سچا واقعہ ہے کہ یوگنڈا کے نیم پاگل ڈکٹیٹر عدی امین نے اس کانفرنس میں یہ تجویز پیش کی تھی کہ سعودی عرب کے شاہ فیصل کو عالم اسلام کا خلیفہ تسلیم کر لیا جائے لیکن ہوا تو یہ ہوا کہ یہ تجویز جسے اس کے سعودی حمایتیوں نے بڑے غور و خوض کے بعد تیار کیا تھا' صدا بصحرا ثابت ہوئی اور اپنی موت آپ مر گئی۔ دراصل مختلف ممالک میں باہمی اختلافات کی خلیج اتنی وسیع تھی کہ ایسی دور رس تجویز پر اتفاق رائے ایک ناممکن اور محال امر تھا اور اس کی دیوانے کے خواب سے زیادہ حیثیت نہ تھی۔ علاوہ ازیں کانفرنس میں شامل مندوبین گھاگ سیاست دان تھے اور کچی گولیاں کھیلے ہوئے نہیں تھے۔ وہ اتنے زیرک ضرور تھے کہ وہ اس دام سے آسانی کے ساتھ بچ کر نکل جاتے۔ وہ خوب سمجھتے تھے کہ مذہبی اختلافات کو اپنے سیاسی مفادات کے لئے استعمال کرنا اور بات ہے اور ان کی آڑ میں کسی اور کا آلہ کار بن جانا بالکل اور چیز۔ وہ اس

سیاسی خودکشی کے مرتکب کیسے ہو سکتے تھے۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ بعض ممالک کے سیاسی مفادات کی خاطر کسی شخص کو ایسے عظیم روحانی اور مذہبی منصب پر فائز کر دیا جاتا جس پر تقرری صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ ہی ہے جو نبیوں کو مبعوث فرماتا ہے اور وہی ہے جو انبیاء کے متبعین کی رہنمائی فرماتا ہے اور وہ اس رہنمائی کی روشنی میں نبی کے جانشین یعنی خلیفہ کا انتخاب کرتے ہیں تاکہ آسمانی فیصلوں کے مطابق نیا منتخب ہونے والا اس روحانی مشن کو جاری رکھے جس کی بنیاد نبی کے ہاتھوں رکھی جاتی ہے۔

اسی طرح مسٹر بھٹو کا بین الاقوامی سطح پر داد و تحسین اور شہرت حاصل کرنے کا منصوبہ ناکام ہو گیا۔ لیکن اب بلی تھیلے سے باہر آ چکی تھی جلد ہی وہ جماعت احمدیہ کی کھلم کھلا مخالفت پر اتر آئے جس کے نتیجے میں آئینی ترمیم کے لئے وہ بدنام زمانہ قرارداد پیش کی گئی جس کا واحد مقصد یہ تھا کہ بین الاقوامی سطح پر نہیں تو کم از کم ملکی سطح پر جماعت احمدیہ کے ہر فرد کو دائرہ اسلام سے خارج تصور کیا جاسکے۔ مجوزہ آئینی ترمیم قومی اسمبلی میں پیش تھی اور اس پر بحث جاری تھی لیکن عجیب بات یہ ہے کہ یہ ساری کارروائی خفیہ تھی (حضرت) خلیفہ ثالث کی رہنمائی میں جماعت کا ایک پانچ رکنی وفد اسمبلی کے ان خفیہ اور پرائیویٹ اجلاسوں میں شریک ہوا جن میں صاحبزادہ مرزا طاہر احمد اس وفد کے سب سے کم عمر رکن تھے۔ بقول ایک امیر جماعت کے یہ امر بجائے خود ان کے علم و فضل، ذہانت اور جماعت کی تاریخ اور روایات پر ان کی گرفت اور عبور کا تصدیقی سرٹیفکیٹ تھا جسے ایک ممنون احسان جماعت نے خراج تحسین کے طور پر اس عظیم نوجوان کی خدمت میں پیش کیا۔

قومی اسمبلی کی تمام کارروائی کے دوران جماعت احمدیہ کے موقف کی

ترجمانی کے لئے (حضرت) خلیفہ ثالث کی نظر انتخاب صاحبزادہ مرزا طاہر احمد پر ہی پڑی چنانچہ آپ نے مسٹر بھٹو کو بتادیا کہ چونکہ وہ بنفس نفیس اسمبلی کے سامنے پیش ہونے پر مکلف نہیں ہیں اس لئے ان کا نمائندہ ان کی طرف سے پیش ہوگا لیکن انہوں نے قبل از وقت یہ نہیں ظاہر کیا کہ یہ نمائندے صاحبزادہ مرزا طاہر احمد ہونگے۔ اس سلسلے میں وہ خود فرماتے ہیں "غالباً (حضرت) خلیفہ ثالثؒ کا خیال تھا کہ میں جماعت کے مسلمہ علماء کی نسبت قومی اسمبلی میں ہونے والی متوقع بحث میں زیادہ موثر طریق پر حصہ لے سکوں گا۔ ظاہر ہے کہ (حضرت) خلیفہ ثالثؒ کے سب کے سب مشیر علوم اسلامیہ کے تبحر عالم تھے۔ دینی علوم پر ان کی نظر بہت وسیع اور گہری تھی اس لحاظ سے ان کو مجھ پر ایک گونہ فوقیت حاصل تھی لیکن یہ لوگ شاید اسمبلی کے نامانوس ماحول میں زیادہ موثر طور پر حصہ نہیں لے سکتے تھے، اس کے برعکس میں نہ صرف اکثر اراکین اسمبلی سے ذاتی طور پر واقف تھا بلکہ بعض کے ساتھ تو میرے دوستانہ مراسم بھی تھے۔ شاید انہیں میرا طریق استدلال بھی پسند آیا ہو۔ ان کا خیال تھا کہ میرا انداز بیان زیادہ موثر ہے۔ ممکن ہے کہ تنقیح طلب امور پر میرا سٹائل اور تنقید انہیں پسند آئی ہو بہرحال اس سلسلے میں میری نامزدگی کی وجوہ تو انہوں نے مجھے نہیں بتائیں لیکن اتنا ضرور فرمایا کہ میں اس فرض کی ادائیگی کے لئے ذہنی طور پر تیار رہوں۔ لیکن مسٹر بھٹو بضد تھے کہ (حضرت) خلیفہ ثالث بذات خود قومی اسمبلی میں پیش ہوں نیز یہ کہ انکی جگہ کوئی نمائندہ قابل قبول نہیں ہوگا۔

آپ فرماتے ہیں۔

"یہ مسٹر بھٹو کی زبردست غلطی تھی۔ غالباً ان کو شک تھا کہ جماعت احمدیہ کے ترجمان کی حیثیت سے مجھے بھیجا جائے

گا۔ وہ سمجھتے تھے کہ ملاؤں اور اٹارنی جنرل کے ساتھ قومی اسمبلی میں ہونے والے معرکے میں بحیثیت نمائندہ جماعت احمدیہ میری موجودگی (حضرت) امام جماعت احمدیہ کی نسبت زیادہ خطرناک اور مہلک ثابت ہوگی۔ انہیں اندیشہ تھا کہ رازہائے درون پردہ سے واقف ہونے کی وجہ سے میں انہیں خوب خوب آڑے ہاتھوں لوں گا۔ اور انہیں لاجواب کردوں گا۔

یہی بھٹو صاحب کی فاش غلطی تھی۔ جاننے والے جانتے ہیں اور میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ خلیفہ ثالث نے اس تاریخی موقع پر جس خوبصورت، پُروقار، پُرسکون، دل نشین، اضطراب سے پاک اور یقین وایمان سے لبریز اور حسین وجمیل انداز میں جماعت احمدیہ کا مؤقف پیش فرمایا وہ انہی کا حصہ تھا "ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند" میں تو ہرگز ہرگز ایسا نہ کرسکتا۔ اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے روح القدس سے ان کی خاص تائید فرمائی۔ ان کو اس آسمانی روشنی اور نور سے نوازا اور آپ نے جماعت کا کیس اس خوبصورتی سے پیش فرمایا کہ حاضرین کی نگاہیں خیرہ ہوکر رہ گئیں۔ قومی اسمبلی کی کارروائی ایک نظر دیکھنے سے ہی بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے کہ اس تاریخی موقعے پر (حضرت) خلیفہ ثالث نے کس حسن وخوبی سے جماعت احمدیہ کے موقف کی ترجمانی کے فرائض سرانجام دیئے"۔

اس موقع پر جماعت کی طرف سے جو تحریری بیان قومی اسمبلی میں پیش کیا گیا اس کے تین اہم ترین باب صاحبزادہ مرزا طاہر احمد ہی کے تحریر کردہ ہیں۔ پہلے باب میں کچھ بنیادی سوال اٹھائے گئے تھے مثلاً یہ کہ کیا احمدی مسلمان ہیں یا نہیں، بانی اسلام (حضرت) محمد (مصطفیٰ ﷺ) کی احادیث و اقوال کی روشنی میں مسلمان کہلانے کا مستحق کون ہے۔ اسی طرح مختلف مسلمان فرقوں کے باہمی اختلافات جن میں سے بعض اتنے شدید اور بنیادی نوعیت کے ہیں جن کے مقابلے پر قومی اسمبلی اور جماعت احمدیہ کے باہمی اختلافات کوئی حیثیت ہی نہیں رکھتے۔ دوسرا باب مجوزہ آئینی ترمیم کے معقولی اور منطقی جائزے پر مشتمل ہے، اس میں مذکورہ ترمیم کے خوفناک اور تباہ کن مضمرات کی نشان دہی کی گئی ہے نیز یہ بنیادی سوال بھی اٹھایا گیا ہے کہ کیا کوئی دنیاوی ادارہ یا کسی بھی قسم کی کوئی تنظیم مثلاً قومی اسمبلی یا مقننہ یا عدلیہ مجوزہ طریقے پر کسی بھی مذہب میں مداخلت کی مجاز ہے؟ اور کیا اسے یہ فیصلہ کرنے کا حق حاصل ہے کہ زید یا بکر کا مذہب وہ نہیں جس پر وہ یقین رکھتا ہے اور اقرار کرتا ہے کہ میرا مذہب یہ ہے۔ یہ باب حضرت صاحبزادہ مرزا طاہر احمد نے خود لکھا، اگرچہ حسب معمول دوسرے سکالروں اور علماء نے بھی حصہ رسدی اس میں حصہ لیا۔ تیسرا باب بھی اسی نہج پر تیار کیا گیا اس باب میں ختم نبوت کے مسئلے پر سیر حاصل بحث کی گئی۔ باقی ماندہ ابواب کی تیاری میں بھی آپ نے نمایاں اور موثر کردار ادا کیا۔ دراصل یہ ایک اجتماعی کوشش تھی جو مختلف علماء کے علم و فہم اور تجربے کی چھلنی میں سے چھن کر ایک آخری نچوڑ اور لب لباب کی شکل میں سامنے آئی تھی۔

قابل ذکر بات یہ ہے کہ قومی اسمبلی کے سارے اجلاس خفیہ اور پرائیویٹ طور پر ہوئے۔ پریس اور پبلک کا داخلہ قطعاً ممنوع تھا اور نہ ہی اس سلسلے میں کوئی

رپورٹ شائع کی گئی۔ صاحبزادہ صاحب کا روزانہ کا معمول تھا کہ ہر اجلاس کے اختتام پر وہ (حضرت) خلیفہ ثالثؒ اور جماعت کے علماء کے درمیان رابطہ افسر کے فرائض بھی سرانجام دیتے آپ فرماتے ہیں:

"(حضرت) خلیفۃ المسیح الثالث کا بھائی ہونے کی وجہ سے میں بلا تکلف گھر میں آجا سکتا تھا۔ بسا اوقات ساری ساری رات آنکھوں میں کٹتی۔ کبھی آپ مجھے تفصیلی ہدایات سے نواز رہے ہوتے اور کبھی میں ان کی خدمت میں رپورٹ پیش کر رہا ہوتا۔ میں دوسرے مشیروں کی طرح ضروری مواد کی تیاری میں بھی ہمہ تن مصروف تھا۔ یہ بحث بھی ہوتی کہ کسی متنازعہ فیہ امر کو کس طرح پیش کیا جائے تاکہ صرف کسی قسم کی غلط فہمی اور ابہام کا امکان نہ رہے بلکہ اس کا ابلاغ بھی واضح اور احسن طریق پر ہو جائے۔ قومی اسمبلی کے اراکین کی طرف سے اٹھائے گئے سوالوں اور اعتراضات کے جواب ہم اپنی اپنی صوابدید کے مطابق (حضرت) خلیفہ ثالثؒ کی خدمت میں پیش کرتے۔ حضور ہمارے مشوروں کو منظور بھی فرماتے اور نامنظور بھی، لیکن بالعموم ہماری گزارشات کو شرف قبولیت سے ہی نوازا جاتا۔

ہوتا یوں کہ ایک دوست مشورتاً کہتے کہ فلاں سوال اٹھائے جانے کا امکان ہے، اس سلسلے میں کچھ کتب میری نظر سے گزر چکی ہیں اور مجھے یہ بھی علم ہے کہ یہ کتب کہاں ہیں۔ میں مشورہ دیتا کہ کیا مناسب نہ ہو گا کہ یہ کتب منگوالی جائیں۔

دوسرے علماء بعض اور کتب کا نام لیتے اسی طرح ہم ضروری مواد اکٹھا کر کے آپس میں بانٹ لیتے، اپنے اپنے حصے کو ایک نظر دیکھنے کے بعد ضروری اقتباس نوٹ کر لیتے اور بالآخر سارا مواد حضور کی خدمت میں پیش کر دیتے۔ مجھے یاد ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے اس موقع پر مجھے ایک خاص خدمت کی توفیق ملی۔ مجھے یقین تھا کہ قومی اسمبلی میں کفر و اسلام کے مسئلے کے ضمن میں شیعہ حضرات کے ان فتاویٰ کا ذکر ضرور آئے گا جن میں غیر شیعہ مسلمانوں کو لگی لپٹی رکھے بغیر نہایت شدت اور وضاحت کے ساتھ کافر اور دائرہ اسلام سے خارج قرار دیا گیا ہے۔ اگر ہم نے ان فتووں کا قومی اسمبلی میں حوالہ دیا تو یقیناً مطالبہ کیا جائے گا کہ ہم اپنے موقف کی حمایت میں ان شیعہ کتب سے اصل حوالے پیش کریں۔

یہ کتب ہماری اپنی مرکزی لائبریری میں موجود نہیں تھیں اور کتب کی ضرورت اور اہمیت کا بھی مجھے شدت سے احساس تھا، مجھے بار بار خیال آ رہا تھا کہ بحث کے دوران کسی نہ کسی شخص کی طرف سے اچانک یہ مطالبہ ہو کر رہے گا کہ ہم تمہارے بیان کردہ حوالے نہیں مانتے ہمیں اصل کتب سے حوالے دکھاؤ۔

میں انہی خیالات میں گم بیٹھا سوچ رہا تھا کہ اچانک مجھے یاد آیا کہ صوبہ سرحد میں (حضرت) قاضی محمد یوسف ہوا کرتے تھے جو شیعہ لٹریچر کے بہت بڑے عالم تھے، اور جن کی اپنی

ذاتی لائبریری بھی تھی جس میں شیعہ مکتب فکر سے متعلق بہت قیمتی اور نایاب کتب موجود تھیں۔ان کے بچے تو اگرچہ سب کے سب مخلص احمدی تھے لیکن مجھے خدشہ تھا کہ نہ معلوم (حضرت) قاضی صاحب کا کتب خانہ محفوظ بھی رہا ہے یا نہیں اور اتنی نایاب کتب کہیں ضائع تو نہیں ہو گئیں۔اس خیال کا آنا تھا کہ میں نے فوراً ہی کچھ نوجوانوں سے کہا کہ جیپ لے کر جائیں اور حضرت قاضی صاحب کی ساری لائبریری اٹھا لائیں اور صبح ہونے سے پہلے پہلے یہاں پہنچ جائیں' چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا۔اگلے روز کیا دیکھتے ہیں کہ بحث کے دوران ایک مولوی کھڑا ہو گیا اور بڑے جوش سے چلایا' میں تمہاری بات کو ماننے کے لئے ہرگز تیار نہیں ہوں مجھے اصل حوالہ جات دکھاؤ'

ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔ہم نے فوراً اصل حوالہ جات پیش کر دیئے۔ہونا کیا تھا مولوی صاحب موصوف کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا"۔

قومی اسمبلی میں بحث چودہ دن تک جاری رہی چنانچہ آپ فرماتے ہیں :

"ان ایام میں بعض بڑے عجیب و غریب اور ایمان افروز واقعات دیکھنے میں آئے۔معمول یہ تھا کہ جب دن بھر کی بحث ختم ہو جاتی اور ہم قومی اسمبلی سے واپس لوٹتے تو (حضرت) خلیفہ ثالث ؒ اور میں دن بھر کی کارروائی پر ایک طائرانہ نظر ڈالتے۔ظاہر ہے کہ حضور ؒ نے خلافت کے فرائض منصبی کا جو

عظیم بار اٹھایا ہوا تھا اس سے میں اور میرے ساتھی آزاد اور خالی الذہن تھے۔ اجلاس سے واپسی پر میں عرض کرتا کہ آج کی بحث میں فلاں بات کا ذکر تو رہ ہی گیا، حضور فرماتے "آپ ٹھیک کہتے ہیں لیکن اس امر کو اب زیر بحث کس طرح لایا جائے؟"

عجیب بات یہ ہے کہ اگلے ہی روز جب ہم اسمبلی کے اجلاس میں شرکت کے لئے جاتے تو سب سے پہلے وہی متوقع سوال اٹھایا جاتا۔ کارروائی شروع ہوتے ہی اٹارنی جنرل اپنی نشست پر کھڑے ہو جاتے اور (حضرت) خلیفہ ثالث" سے مخاطب ہو کر کہتے۔ "میں سمجھتا ہوں فلاں مسئلے پر بحث تو کل ختم ہو گئی تھی لیکن مجھے مشورہ دیا گیا ہے کہ اس مسئلے سے متعلق میں یہ سوال آپ سے ضرور کروں" اور بلا استثنا یہ وہی سوال ہوتا جسے ہم خود زیر بحث لانا چاہتے تھے۔

میری گزارش پر ہم کسی ایسے سوال پر خوب غور و خوض کر لیتے اور جب یہی سوال اگلے روز اٹھایا جاتا تو میرا دل خوشی اور اطمینان سے بھر جاتا کہ اللہ تعالیٰ نے میری خواہش کو شرف قبولیت بخشا اور اپنے خاص تصرف سے خدمت کا موقع بہم پہنچایا"۔

جب ان سے پوچھا گیا کہ اسمبلی میں ہونے والی اس بحث کا معیار (کہ احمدی مسلمان ہیں یا نہیں؟) کیسا رہا؟ تو فرمایا :

"یہ عجیب بات ہے کہ مخالفینِ جماعت احمدیہ کی طرف

سے کی گئی بحث کھوکھلی، سپاٹ اور بالکل بے معنی، بے تعلق اور بے موقع ہوتی تھی۔ ہمارے تحریری بیان میں دیئے گئے دلائل میں سے وہ کسی ایک کا بھی رد نہیں کر سکے۔ نہ ہی انہوں نے رد کرنے کی کوشش کی۔ ان کے نزدیک سب سے اہم اور بنیادی مسئلہ ختم نبوت کا مسئلہ تھا یعنی یہ کہ (حضرت) محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) خاتم النبیین ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ آج تک کسی مسلمان نے اس امر کا انکار نہیں کیا۔ بشمول ہمارے سب مانتے ہیں کہ آپ خاتم النبیین ہیں۔ آپ آخری صاحب شریعت نبی ہیں اور آپ کی لائی ہوئی شریعت آخری شریعت ہے لیکن آپ کے وصال کے بعد اس چودہ سو سال کے عرصے میں ایک دو نہیں متعدد صلحائے امت بزرگان دین اور علمائے کرام اپنے اس عقیدہ کا اعلان کرتے چلے آرہے ہیں کہ آپ کے متبعین میں سے۔ آپ کی لائی ہوئی شریعت کو ماننے والا اس کا تابع اور اس کو دنیا میں دوبارہ قائم کرنے والا ایک وجود آئے گا جو آپ ہی کی امت کا ایک فرد ہوگا۔ وہ مہدی بھی ہوگا اور مسیح بھی۔ ہو بہو یہی عقیدہ جماعت احمدیہ کا بھی ہے۔

ہمارا ایمان ہے کہ وہ آنے والا وجود آچکا ہے اور بانی سلسلہ عالیہ احمدیہ حضرت مرزا غلام احمد ہی وہ موعود مہدی اور مسیح ہیں۔

لیکن جہاں تک ہمارے مخالفین کا تعلق ہے۔ ہونا تو یہ

چاہئے تھا کہ ان کے نزدیک مسئلہ خاتم النبیین کے مقابل
پر باقی تمام مسائل کی حیثیت ثانوی ہو کر رہ جاتی۔ لیکن ہوا یہ
کہ انہوں نے اس بنیادی مسئلے سے متعلق کوئی ایک دلیل
بھی اپنے موقف کی تائید میں پیش نہیں کی۔ کہا تو صرف اتنا کہ
چونکہ آپ کا یہ عقیدہ ہے اس لئے آپ دائرہ اسلام سے
خارج ہیں۔ لیکن حیرت کی انتہا یہ ہے کہ جو عقائد ہماری
طرف منسوب کئے جا رہے تھے اور جن کی بنا پر ہمارے خلاف
فیصلہ کیا جا رہا تھا۔ وہ ہمارے عقائد تھے ہی نہیں"۔

دراصل یہ وہ انداز فکر تھا جس کی طرف موازنہ مذاہب کے ایک امریکن
پروفیسر نے اپنے ایک لیکچر میں توجہ دلائی تھی۔ انہوں نے کہا تھا:

"احمدیت کی صداقت کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ
پہلے یہ علم ہو کہ (حضرت) احمد بانی سلسلہ احمدیہ نے کون سے
دعاوی کئے ہیں اور کون سے دعاوی نہیں کئے۔ بدقسمتی سے
ان کے مخالفین اس ضروری امر کو مد نظر نہیں رکھتے"۔

سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے آپ نے فرمایا:

"احمدیت کا جو خود ساختہ اور من گھڑت تصور ہمارے
مخالفین نے پیش کیا اس کا حقیقت سے دور کا واسطہ بھی نہیں
تھا۔ یہ ایک ہوّا تھا جو ان کے بیمار ذہن اور ان کی اپنی بدنیتی
اور نفرت کی پیداوار تھا' سیاق و سباق کی پروا کئے بغیر انہوں
نے ہمارے لٹریچر سے اپنے مفید مطلب کچھ فقرے چنے پھر
ان فقروں کے جوڑ توڑ سے اصل مفہوم مسخ کرنے کے بعد

اسے اپنے خود ساختہ بے بنیاد اور قطعاً غلط معانی پہنانے کی ناکام کوشش کی اور اس ملغوبے کو جس کا حقیقت سے دور کا واسطہ بھی نہیں تھا بزعم خود ہمارے عقائد بنا کر ہمارے سر تھوپ دیا۔

ہم نے کہا۔ ہرگز ہرگز ہمارے یہ عقائد نہیں ہیں۔ ہم ان عقائد سے بے زاری کا اعلان کرتے ہیں اور انہیں مسترد کرتے ہیں لہٰذا جن عقائد کے متعلق آپ فیصلہ کر رہے ہیں وہ ہمارے عقائد ہیں ہی نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے موقف کی تردید تو درکنار' انہوں نے اسے چھوا تک نہیں۔ اس کے برعکس وہ لوگ ہماری طرف منسوب کردہ عقائد کے اس خود ساختہ غبارے میں ہوا بھرتے چلے گئے لیکن یہ بھول گئے کہ یہ تو ان کے اپنے ہی دماغ کی اختراع ہے اور پھر اپنے بنائے ہوئے اس بت پر اپنا فتویٰ صادر کرنا شروع کر دیا۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی جادو یا کالے علم کے زور سے پہلے ایک موم کا پُتلا بنایا جا رہا ہو اور پھر اس میں اس نیت سے سوئیاں چبھوئی جا رہی ہوں کہ اب یہ زندہ بچ کر نہیں جا سکے گا۔ جھوٹ کے اس خود ساختہ پُتلے کا احمدیت کے عقائد سے دور کا واسطہ بھی نہیں تھا۔ یہ ان کی اپنی نظر کا فریب تھا جس میں اور احمدیت میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ خدا جانتا ہے کہ یہ احمدیت تو نہیں کچھ اور ہی شے تھی۔ اس کے ٹوٹنے سے ہماری سچائی پر کیسے حرف آ سکتا تھا۔

کچھ لوگ نہیں سمجھتے کہ جماعت احمدیہ کے خدوخال کی تشکیل میں (حضرت) مسیح موعود (علیہ السلام) کا کیا کردار ہے۔ دراصل ہمارے نزدیک زندگی کو سنوارنے اور اس کو صحیح خطوط پر استوار کرنے کے لئے صرف اور صرف ایک واحد معیار اور نمونہ ہے یعنی ہمارے سید و آقا محمد (مصطفیٰ احمد مجتبیٰ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم) کا مبارک وجود اور آپ کا اسوۂ حسنہ' اس کے سوا اور کوئی معیار ہے نہ کبھی ہوگا۔ چنانچہ بچپن میں جب ہم سے کوئی غلط حرکت سرزد ہو جاتی تو ہمیں آپ (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کے حوالے ہی سے ٹوکا جاتا' نہ کہ (حضرت) مسیح موعود (علیہ السلام) کے حوالے سے۔ ہم سے اگر کوئی غلطی یا کوتاہی سرزد ہوتی تو ہمیں بتایا جاتا کہ دیکھو یہ بات آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) نے ناپسند فرمائی ہے۔

ہم تو یہ سوچ بھی نہیں سکتے کہ (حضرت) مسیح موعودؑ کو نعوذباللہ آنحضرتؐ کا مدمقابل خیال کریں۔ (حضرت) مسیح موعود تو آپ کے عاشق زار اور غلام ہیں' افسوس تو یہ ہے کہ ہمارے مخالف مولویوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی۔ وہ اصرار پر اصرار کئے جا رہے ہیں کہ نعوذباللہ ہم ایسے نبی کو مانتے ہیں جو (حضرت اقدس) محمد (مصطفیٰؐ) کے بلند مقام، منصب اور عزت میں حصہ دار بن گیا ہو اور (نعوذباللہ) آپؐ کا شریک ہو۔ اس خام خیالی کا حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔

(حضرت) مسیح موعود نے ہمارے لئے جو کچھ کیا اور ہم جس رنگ میں حضور کے مقام اور منصب کو پیش کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ آپ نے اپنے آقا (حضرت) محمد (مصطفیٰ ؐ) کی سنت اور آپ کے مثالی کردار کو اپنا مشعل راہ بنایا اور نہایت سچائی اور خلوص اور صدق نیت سے آپ کے اسوۂ حسنہ کی ایک ایک حرکت و سکون کے مطابق اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ سجایا اور سنوارا اور آپ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کی کامل اطاعت اور عشق کا حق ادا کرکے دکھادیا۔

پس ہمارے نزدیک (حضرت) مسیح موعود فی ذاتہٖ خود ایسا نمونہ نہیں ہیں جن کی اطاعت واجب ہو اور لازم آتی ہو بلکہ آپ محض اس لحاظ سے نمونہ ہیں کہ آپ نے اس زمانے میں اپنی ذات کے حوالے سے عملاً ثابت کرکے دکھادیا کہ چودہ سو سال گذر جانے کے بعد بھی آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی کامل اطاعت کس طرح کی جاسکتی ہے۔

لہٰذا جب ہم (حضرت) مسیح موعود کی مثالی زندگی کا حوالہ دیتے ہیں تو مراد اس سے یہ ہوتی ہے کہ آپ نے قرآن (کریم) اور انسان کامل (حضرت) محمد مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اسوہ حسنہ کے مطابق اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ گذارا اور حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کے مثالی نمونے کے مطابق زندگی گذار کر یہ ثابت کردکھایا کہ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کا اسوہ حسنہ قیامت تک

کے لئے زندہ اور قابل عمل اسوہ ہے (حضرت) بانی سلسلہ احمدیہ (علیہ السلام) کی اس عدیم المثال کامیابی کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ آپ کو آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے حسن کامل پر مکمل اور غیر متزلزل ایمان اور یقین کی نعمت حاصل تھی۔ اور آپ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کے عشق اور محبت میں کامل طور پر گم ہو چکے تھے اور آپ کو صحیح معنوں میں فنافی الرسول کا مقام حاصل تھا لیکن افسوس کہ (حضرت) خلیفہ ثالثؒ کے دلائل کی پروا کئے بغیر پاکستان کی قومی اسمبلی نے ۱۹۷۴ء میں یہ اعلان کر دیا کہ احمدی مسلمان نہیں ہیں"۔

وہ دن اور آج کا دن احمدیوں کو اجازت نہیں ہے کہ وہ مکہ مکرمہ جا کر فریضہ حج ادا کر سکیں۔ بری اور ہوائی افواج سے سینئر احمدی افسروں کو ریٹائر کر دیا گیا۔ نوجوان احمدی افسروں کی ترقیاں روک دی گئیں۔ سرکاری اور نیم سرکاری محکموں میں کام کرنے والے احمدی افسروں اور ماتحتوں سے یہی سلوک روا رکھا گیا۔ احمدی سفارتکاروں اور سفیروں پر ترقی کے تمام دروازے بند کر دیئے گئے اس کے بعد یونیورسٹیوں میں کام کرنے والے احمدی لیکچراروں پر پروفیسر بننے کے امکانات ختم ہو گئے۔ اسی طرح ہسپتالوں میں کام کرنے والے احمدی ڈاکٹر بھی اپنے اپنے ڈیپارٹمنٹ کی صدارت کے فرائض سرانجام دینے کے نااہل قرار دے دیئے گئے۔ اور تو اور ٹیلیفون اور کمپیوٹر انجینئرنگ وغیرہ قسم کے محکموں میں بھی احمدی نوجوانوں کے ساتھ اسی قسم کا امتیازی سلوک روا رکھا جانے لگا۔ نئے فارغ التحصیل احمدی نوجوان طلباء اعلیٰ تیکنیکی اور سائنسی امتحانات نمایاں کامیابی کے ساتھ پاس کرنے کے بعد جب سرکاری ملازمت حاصل کرنے کی کوشش

کرتے تو کھڑے کے کھڑے رہ جاتے اور ان کے نااہل ہم جماعت کامیاب قرار دے دیئے جاتے۔

اس صورتحال سے جماعت احمدیہ کے معاندین کا جی خوش ہوگیا۔ یہ الگ بات ہے کہ اس ظالمانہ طریق کار نے انصاف کا گلا گھونٹ کر رکھ دیا۔

جب احمدی نوجوانوں پر اپنے وطن میں انصاف کے دروازے بند کردیئے گئے تو چارونا چار انہیں بیرونی ممالک کی طرف رخ کرنا پڑا۔ اپنے وطن میں اپنے خلاف اس منفی سلوک سے زچ ہو کر وہ بادلِ ناخواستہ برطانیہ' جرمنی' کینیڈا' امریکہ اور دوسرے ممالک میں پناہ حاصل کرنے کے لئے نکل کھڑے ہوئے۔ یہ نوجوان صحت مند بھی تھے اور اعلیٰ تعلیم یافتہ بھی۔ دراصل ایسے نوجوان ہی کسی ملک کا حقیقی سرمایہ ہوا کرتے ہیں لیکن اب یہی نوجوان اپنی دینی اور مذہبی قدروں کو سینوں سے لگائے ترک وطن کے خطرات مول لینے پر مجبور ہو گئے۔ ان کے جانے سے جہاں پاکستان اس افرادی دولت سے محروم ہوگیا۔ وہاں دوسرے ممالک کو اس سے فائدہ بھی پہنچا۔ جماعت احمدیہ کو شکایت تھی اور یہ ایک جائز اور وزنی شکایت تھی کہ قومی اسمبلی کی ساری کارروائی جس کی بناپر احمدیوں کو غیر مسلم قرار دے دیا گیا بالکل خفیہ اور بصیغہ راز ہوئی اور پریس اور پبلک کو اس کی تفصیلات سے سراسر بے خبر رکھا گیا۔ آخر وہ کون سے شواہد تھے جن کی بنا پر اس آئینی ترمیم کا نفاذ ضروری سمجھا گیا۔ جماعت احمدیہ نے بار بار مطالبہ کیا کہ قومی اسمبلی کی پوری کارروائی اور بحث اور دلائل کی تفصیل شائع کی جائے لیکن بھٹو حکومت نے یہ مطالبہ ماننے سے صاف انکار کردیا اور جوں جوں یہ مطالبہ زور پکڑتا گیا بھٹو حکومت اسی شدت سے انکار پر انکار کرتی چلی گئی۔

"اسمبلی میں ہونے والی اس بحث کو آپ شائع کیوں نہیں کرتے؟" یہ تھا وہ

سوال جو ایک فاضل وکیل نے پاکستان کے ایک سینئر وزیر سے کیا۔ وزیر موصوف وکلاء کے ایک اجتماع سے خطاب کر رہے تھے۔ وزیر باتدبیر بڑی حقارت اور تلخی سے مسکرائے اور جواباً بولے۔ کیا تم چاہتے ہو کہ سارا پاکستان احمدی ہو جائے؟" چنانچہ جلد ہی حکومت نے ان سکولوں اور کالجوں پر بھی قبضہ کر لیا جو جماعت احمدیہ کی ملکیت تھے۔ جماعت کی تقریباً بیس ہزار ایکڑ زرعی اراضی سرکاری تحویل میں لے لی گئی۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ جہاں جماعت احمدیہ کے ساتھ یہ سلوک روا رکھا گیا وہاں دیگر مذہبی تنظیموں پر آنچ تک نہ آنے پائی۔ جب حکومت سے اپیل کی گئی کہ جماعت احمدیہ ایک خالصتاً مذہبی اور رفاہی جماعت ہے اور انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ قانون کی نظر میں سب برابر ہوں اور سب کے ساتھ یکساں اور مساویانہ سلوک کیا جائے تو اس کا جواب بھٹو صاحب نے یہ دیا کہ وہ اس غلطی کا ازالہ کرنے کی کوشش کریں گے لیکن ہوا وہی جس کا اندیشہ تھا۔ پرنالہ جہاں تھا وہیں رہا۔ بعد میں جب بھٹو صاحب جماعت احمدیہ کی حمایت حاصل کرنے کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہے تھے تو انہوں نے (حضرت) خلیفہ ثالثؒ کو اپنی سرکاری رہائش گاہ پر ملاقات کی دعوت دی۔ جماعت کے خلاف اس ظالمانہ اور تعزیری آئینی ترمیم کے باوجود وہ جماعت احمدیہ کی تائید اور امداد کے خواہشمند تھے۔ بھٹو صاحب کا عذر یہ تھا کہ

> "وہ دلی طور پر ایسی ترمیم نہیں چاہتے تھے ان کے نزدیک ان کی کی ہوئی ترمیم کا دائرہ کار نہایت محدود اور خالصتاً آئینی تھا اور مقصد اس کا صرف اتنا تھا کہ یہ واضح کر دیا جائے کہ آئین کی روشنی میں احمدی مسلمان ہیں یا نہیں نیز یہ کہ یہ ترمیم کسی صورت میں بھی احمدیوں کے اس حق پر اثر انداز

نہیں ہوگی کہ وہ اپنے مذہب پر جس طرح چاہیں عمل کریں۔
ہم بنیاد پرستوں کا منہ بند کرنا چاہتے تھے اس لئے یہ ترمیم پیش
کرنے پر ہم مجبور تھے۔ اس موقف کو انہوں نے بار بار
دہرایا۔ کہنے لگے ہم برے تو ہیں لیکن دوسری سیاسی پارٹیوں
سے بہتر ہیں۔ بولے مجھ پر دباؤ ڈالا جارہا ہے کہ جماعت کے
خلاف اس سے بھی سخت قدم اٹھاؤں لیکن میں ایسا ہرگز نہیں
کروں گا۔"

آخر میں چائے آگئی اور بھٹو صاحب نے ایک پیالی بنا کر (حضرت) خلیفہ ثالث ؒ کی خدمت میں پیش کی آپ نے چائے پینے سے معذرت کرتے ہوئے فرمایا :

"آپ ملکی حکومت کے سربراہ ہیں اور میں اس ملک کا
شہری ہوں آپ نے مجھے بلوایا اور میں آپ کے بلاوے
پر آگیا۔ ایک شہری کی حیثیت سے مجھ پر یہ فرض عائد ہوتا تھا
جو میں نے ادا کردیا۔ لیکن یہ امر کہ میں آپ کی میزبانی بھی
قبول کروں بالکل الگ معاملہ ہے۔ خصوصاً جبکہ آپ نے
جماعت احمدیہ کے خلاف ایسی معاندانہ اور یک طرفہ
کارروائی کی ہے اس لئے معذرت چاہتا ہوں۔ میں چائے کی
یہ پیالی نہیں پی سکتا۔"

بھٹو ایک بڑے خود پسند اور متکبر انسان تھے یہ الفاظ سن کر منجمد ہو کر رہ گئے پیالی ان کے ہاتھ میں تھی جسے آہستہ سے انہوں نے میز پر رکھ دیا۔ وقت کے ساتھ ساتھ جماعت پر ڈھائے جانے والے مظالم میں اضافہ ہوتا چلا گیا اور نوبت یہاں

تک پہنچ گئی کہ جب یہ مظالم برداشت کی حدیں پھلانگ گئے تو حضرت مرزا طاہر احمد کے اس کردار پر جو انہوں نے مسٹر بھٹو کو اقتدار کی کرسی پر بٹھانے کے سلسلے میں ادا کیا تھا۔ چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ آپ فرماتے ہیں:۔

"اگرچہ تنقید کرنے والے تعداد میں تو کوئی زیادہ نہ تھے پھر بھی ان کا کہنا یہ تھا کہ اگر میں بھٹو کی مدد نہ کرتا اور ہمیں اس کو ووٹ دینے اور دلانے پر آمادہ نہ کرتا تو صورتحال مختلف ہوتی۔

امر واقعہ یہ ہے کہ میں نے ملک و قوم کی خدمت میں جو کردار بھی ادا کیا اس پر مجھے کبھی افسوس نہیں ہوا۔ نہ ہی مجھے اب افسوس ہے کیونکہ میں جانتا ہوں کہ متبادل راستے اس سے کہیں زیادہ پُر خطر اور ہولناک تھے بایں ہمہ احمدیوں پر جو مظالم ڈھائے جا رہے تھے، ان پر میرا دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔ میں نے اپنے رب کے حضور التجا کی کہ اے میرے رب میری بریت فرما۔ میں نے یہ دعا بھی کی کہ وہ ظالموں کو ان کے ظلم کی سزا دے۔ کتنی ہی راتیں میں نے شدید کرب کی حالت میں جاگ جاگ کر کاٹی ہیں۔

ایک رات اچانک میری آنکھ کھل گئی اور میں بلا ارادہ اچھل کر بستر سے باہر آ رہا۔ میں کسی طاقت کی ایسی گرفت میں تھا جسے الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ یہ تجربہ اس روحانی تجربے سے ملتا جلتا تھا جس میں سے میں ایام طفولیت میں گزر چکا تھا یعنی جب اللہ تعالیٰ نے مجھے پہلے پہل اپنے الہام سے

نوازاتھا۔اب بھی ایسی ہی کیفیت مجھ پر طاری تھی۔میں شدت جذبات سے مغلوب ہو کر باآواز بلند یہ الفاظ بار بار دوہرا رہا تھا۔ اَدْھٰی وَاَمَرُّ۔ اَدْھٰی وَاَمَرُّ (اور زیادہ تباہ کن اور زیادہ دردناک) یوں لگتا تھا جیسے میرا وجود کسی اور طاقت کے قبضہ قدرت میں ہو اور مجھے اپنے آپ پر کنٹرول نہ رہا ہو۔

میں نے اس قسم کے الہامات کے بارے میں پڑھا ہے۔ جب آپ کچھ کہہ رہے ہوتے ہیں اور وہ الفاظ آپ کے اختیار میں نہیں ہوتے، جن کا مفہوم بھی آپ پر پورے طور پر واضح نہیں ہوتا۔ یوں لگتا ہے جیسے آپ ایک غیر مرئی طاقت کے ہاتھوں بے بس ہوں اور آپ ان الفاظ کے دوہرانے پر مجبور ہوں۔

میں نے محسوس کیا کہ میں یہ الفاظ دوہرانے کے ساتھ ساتھ کانپ بھی رہا ہوں۔ پھر میں شعوری حالت کی طرف منتقل کیا گیا اور وہ الفاظ جنہیں میں دوہرا رہا تھا، سمجھ میں آنے لگے۔ اور یہ بات بھی کہ میں یہ الفاظ دوہرا کیوں رہا ہوں۔ مجھے بحیثیت مجموعی ان الفاظ کے معانی کا تو علم تھا لیکن ان کا سیاق وسباق مستحضر نہ تھا جونہی ربودگی کی یہ کیفیت ختم ہوئی۔ میں اٹھا ان الفاظ کا مقام تلاش کرنا شروع کر دیا۔ کہ دیکھوں تو سہی کہ کس موقع اور محل پر قرآن (کریم) میں یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں۔ وہ دن اور آج کا دن میں نے مکمل طور پر اللہ تعالٰی کے فیصلے کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا کہ وہ جس طرح

چاہے اپنی تقدیر کے رخ پر سے پردہ اٹھائے"۔

مسٹر بھٹو کی حکومت بتدریج تیزی کے ساتھ غیر مستحکم ہوتی چلی گئی۔ ان کی مقبولیت کا گراف تیزی سے گر رہا تھا۔ انہوں نے بڑی مایوسی اور پریشانی کے عالم میں ہاتھ پاؤں مارنے شروع کئے کہ اقتدار کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہ پائے۔ اور سیاسی مصلحت کے ہاتھوں مجبور ہو کر جب بھی موقع ملا اپنے پرانے ساتھی چھوڑ کر نئے ساتھی تلاش کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ جولائی ۱۹۷۷ء میں جنرل ضیاء الحق نے جسے مسٹر بھٹو نے سینئر افسروں کو نظرانداز کر کے پاکستان کی بری افواج کا کمانڈر انچیف مقرر کیا تھا ایک فوجی انقلاب کے ذریعے مسٹر بھٹو کی حکومت کا تختہ الٹ دیا اور پھر دو سال بعد دنیا بھر کے احتجاج کے باوجود اسی جنرل ضیاء الحق نے مسٹر بھٹو کو ایک سیاسی مخالف کے والد کے قتل کے الزام میں ماخوذ کر کے مقدمہ عدالت کے سپرد کر دیا۔ عدالت نے پھانسی کی سزا سنائی۔ اس فیصلے کے خلاف عالم گیر صدائے احتجاج بلند ہوئی اور اکناف عالم میں احتجاج کا ایک شور برپا ہو گیا۔ عام تاثر یہی تھا کہ سزائے موت کا عدالتی فیصلہ مبنی بر انصاف نہیں بلکہ یہ ایک سیاسی فیصلہ ہے اور سیاسی مصلحتوں اور ضرورتوں کا مرہون منت ہے۔ تاہم جنرل ضیاء الحق اس کانٹے کو اپنے راستے سے ہٹانے کا کتنا ہی خواہش مند کیوں نہ ہو وہ مسٹر بھٹو کو تختہ دار پر لٹکانے کی جرأت کبھی نہیں کر سکے گا۔ یہ کسی کے وہم گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس سزا پر عمل درآمد بھی ہو گا۔ دو سال بیت چکے تھے صبح ہونے کو تھی۔ باہر ابھی تاریکی چھائی ہوئی تھی کہ (حضرت) خلیفہ رابع کی اچانک آنکھ کھل گئی۔ فرماتے ہیں:

"مجھے شدت سے احساس ہوا اور میخ کی طرح یہ احساس میرے سینے میں گڑ گیا جیسے کوئی حادثہ ہو گیا ہو۔ میں بیداری

کے عالم میں بستر پر لیٹا ہوا تھا یہاں تک کہ میرے بستر سے اٹھنے اور تہجد اور فجر کی نماز کا وقت ہو گیا۔ میں عموماً صبح کے وقت ریڈیو پر خبریں سننے کا عادی نہیں ہوں لیکن خلاف معمول آج کے دن میں نے ریڈیو کا بٹن دبایا پہلی ہی خبر جو میں نے سنی وہ یہ تھی کہ مسٹر بھٹو کو پھانسی دے دی گئی"۔

☆ ☆ ☆

14

خدا تعالیٰ سے ہدایت یافتہ

(حضرت) چوہدری محمد ظفر اللہ خاں مجلس انتخاب کے آخری رکن تھے جو مجلس کے اس تاریخی اجلاس میں شرکت کے لئے مسجد مبارک میں پہنچے۔ یہ مسجد ربوہ کے وسط میں قصر خلافت کے پہلو میں واقع ہے۔ مسجد کے چاروں طرف دس ایکڑ کے لگ بھگ ایک وسیع میدان ہے۔ آج کے دن دس جون ۱۹۸۲ء کو یوں لگتا تھا جیسے ربوہ کی ساری آبادی جو پینتالیس ہزار نفوس پر مشتمل تھی اپنے گھر بار کھلے چھوڑ کر مسجد کی طرف امڈ کر خلافت رابعہ کے انتخاب کی کارروائی کو نزدیک سے مشاہدہ کرنے کے لئے بے قرار ہو کر آئی ہو۔

علاوہ ازیں پندرہ ہزار سے زیادہ احمدی حضرات بیرون ربوہ سے آکر اس اجتماع میں شامل ہو گئے تھے۔ جو نہ صرف پاکستان بلکہ ہندوستان، برطانیہ، امریکہ، کینیڈا، جرمنی، فرانس، ہالینڈ، نائیجیریا، سیرالیون، گیمبیا، ملائشیا اور ان تمام دیگر ممالک سے جہاں جہاں احمدی آباد ہیں (حضرت) خلیفہ ثالث کے وصال کی خبر سنتے

ہی بعجلت تمام بے تابانہ کھچے چلے آئے تھے۔ مشرقی اور مغربی افریقہ سے آنے والے یہ مہمان مندوبین اپنا اپنا قومی لباس زیب تن کئے ہوئے تھے۔ جرمنی، برطانیہ اور دیگر ممالک کے مندوبین اپنے اپنے روایتی لباس میں ملبوس تھے۔ ہندوستان اور پاکستان کے لوگوں نے اپنے مخصوص سفید کرتے اور ڈھیلی ڈھالی شلواریں اور پاجامے پہن رکھے تھے۔ سبھی باہم یوں گھل مل گئے تھے جیسے ایک ہی خاندان کے افراد ہوں۔

ادھر گرمی بھی اپنے عروج پر تھی۔ کوئی مشرق سے آیا ہو یا مغرب سے۔ کسی نے تنگ لباس پہنا ہوا ہو یا ڈھیلا ڈھالا۔ ہر شخص گرمی کی شدت کے سامنے بے بس نظر آتا تھا۔ درجہ حرارت ۱۱۵ ڈگری فارن ہائٹ کو چھو رہا تھا۔ ادھر انسانوں کا ایک جم غفیر تھا جو اس گرمی میں مسجد مبارک میں جمع تھا۔ کھوے سے کھوا چھل رہا تھا۔ لوگ گرمی اور حبس سے نڈھال ہو کر گر رہے تھے۔ انہیں سائے میں لٹایا جا رہا تھا۔ پڑوس کے مکانوں میں رہنے والے پیاسوں کو پانی پلانے کے لئے دوڑے چلے آ رہے تھے۔

اس ہجوم میں شامل بچے بوڑھے مرد و زن ہمہ تن محو انتظار تھے۔ گذشتہ شب آدھی رات کے قریب ربوہ میں بذریعہ ٹیلیفون اسلام آباد سے یہ اندوہناک خبر موصول ہو چکی تھی کہ (حضرت) خلیفہ ثالث وفات پا چکے ہیں۔ (حضرت) چوہدری محمد ظفر اللہ خاں کی عمر اس وقت ۹۰ سال تھی۔ اس پیرانہ سالی میں ان کے لئے گرمی کی یہ شدت ناقابل برداشت حد تک تکلیف دہ تھی۔ وہ ان دنوں لندن میں مقیم تھے اور مسجد فضل میں بے چینی سے تفصیلی اطلاع کا انتظار کر رہے تھے۔ مفصل اطلاع ملتے ہی وہ فوراً ربوہ کے لئے روانہ ہو گئے تھے اور اس وقت سے مسلسل سفر میں تھے۔ آپ بذریعہ ہوائی جہاز پہلے اسلام آباد پہنچے اور پھر لاہور۔

جہاں ان کو ربوہ لے جانے کے لئے ایک کار ائرپورٹ پر ان کا انتظار کر رہی تھی۔ دوران سفر انہوں نے کچھ بھی تو نہیں کھایا تھا۔ گیسٹ ہاؤس میں جہاں وہ آن کر رکے تھے سادہ روٹی اور شوربہ ان کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ اس اثناء میں صاحبزادہ مرزا طاہر احمد بھی پہنچ گئے۔ انہوں نے بھی کچھ کھایا پیا نہیں تھا۔ وہ بھی اس مختصر سے ماحضر میں شامل ہو گئے اور چند ایک لقمے لینے کے بعد آپ مسجد میں تشریف لے گئے۔ بعد میں چوہدری محمد ظفراللہ خاں بھی رضاکاروں کی نگرانی میں آہستہ آہستہ اس بھیڑ میں راستہ تلاش کرتے ہوئے مسجد کی طرف روانہ ہوئے۔ ان کے انتظار میں مسجد کا صدر دروازہ اب تک کھلا رکھا گیا تھا۔ ان کی تشریف آوری کے بعد دروازہ بند کر دیا گیا اور تین پہرے دار ڈیوٹی پر کھڑے ہو گئے تاکہ کوئی غیر متعلق شخص اندر داخل نہ ہو سکے۔ یہ تاریخ ساز لمحہ تھا۔ جماعت احمدیہ کی خلافت رابعہ کا انتخاب شروع ہونے والا تھا۔ (حضرت) چوہدری محمد ظفراللہ خاں جو سب سے آخر میں داخل ہوئے تھے مسجد کی آخری صف میں پڑے ہوئے جوتوں کے درمیان ایک کرسی پر بیٹھ گئے۔ کرسی ان کی پیرانہ سالی کے احترام میں رکھی گئی تھی۔ ساری مسجد میں اس کرسی کے علاوہ صرف ایک اور کرسی تھی جس پر صاحبزادہ مرزا مبارک احمد تشریف فرما تھے۔ وہ جماعت احمدیہ کے بیرونی مشنوں کے انچارج تھے۔ اور جماعت احمدیہ کے عہدیداروں میں سب سے سینئر ہونے کی وجہ سے مجلس انتخاب کے اس اجلاس کی صدارت کے فرائض سرانجام دے رہے تھے۔

صاحبزادہ مرزا مبارک احمد فرینکفرٹ (جرمن) گئے ہوئے تھے (حضرت) خلیفہ ثالث کو دل کا دورہ پڑنے اور ان کی وفات کی خبر ملنے پر وہ بھی ابھی ربوہ پہنچے تھے۔ اس وقت مجلس انتخاب کے ۱۴۸ اراکین ربوہ پہنچ چکے تھے اور مسجد

مبارک میں موجود تھے۔ انہیں نئے خلیفہ کا انتخاب کرنا تھا۔

منصب خلافت موروثی منصب نہیں ہے جماعت احمدیہ کے کسی ایک فرد کو خلیفہ منتخب کیا جا سکتا ہے۔ غالب امکان تو یہی تھا کہ منتخب کیا جانے والا خلیفہ رابع انہی ۱۴۸ حاضر اراکین میں سے ایک ہو گا۔ یہی وہ لوگ تھے جنہیں ان کی مخلصانہ خدمات، بے داغ زندگی اور پاکیزہ کردار کی وجہ سے مجلس انتخاب کی رکنیت کی سعادت حاصل ہوئی تھی۔ ان میں دنیا کے کونے کونے سے ملکوں۔ ضلعوں اور شہروں کے امراء، سابق امراء، جماعتی تنظیموں میں بعض مراتب پر فائز عہدیدار، ایسے مبلغین جو پاکستان سے باہر کسی بھی ملک میں کم از کم ایک سال کے لئے تبلیغ کے فرائض سرانجام دے چکے تھے اور پھر حضرت مسیح موعودؑ کے وہ صحابہ جو اب تک زندہ سلامت تھے سبھی اس اجلاس میں شامل تھے۔ صرف انہی کو حق رائے دہی حاصل تھا۔ ان سب نے یہ حلف اٹھایا تھا کہ "ہم مکمل اور غیر مشروط طور پر (حضرت) احمد کو صدق دل سے مسیح موعودؑ اور امام مہدی مانتے ہیں۔ انہیں امتی نبی تسلیم کرتے ہیں اور ان کی جانشین خلافت احمدیہ پر غیر متزلزل یقین رکھتے ہیں۔" حلف کے الفاظ یہ تھے۔

> "میں اللہ تعالیٰ کو حاضر ناظر جان کر اعلان کرتا ہوں کہ میں خلافت احمدیہ کا قائل ہوں اور کسی ایسے شخص کو ووٹ نہیں دوں گا جو جماعت مبایعین میں سے خارج کیا گیا ہو یا اس کا تعلق احمدیت یا خلافت احمدیہ کے مخالفین سے ثابت ہو۔"

مجلس انتخاب کے ہر رکن کو ایک تحریری سرٹیفکیٹ دیا جاتا ہے جس کی باقاعدہ تجدید ہوتی رہتی ہے۔ مسجد کے گیٹ پر موجود محافظ اسی سرٹیفکیٹ کی

چیکنگ کر رہے تھے۔ سرٹیفکیٹ کی تصدیق کے بعد ہی اراکین کو مسجد کے اندر داخل ہونے کی اجازت تھی۔

(حضرت) خلیفہ ثانی پر ہونے والے قاتلانہ حملے کے بعد دسمبر ۱۹۵۶ء میں انتخاب خلافت کے قواعد وضوابط وضع کئے گئے تھے۔ مقصد ان قواعد کا یہ تھا کہ خلیفہ وقت کی وفات کے بعد چھتیس گھنٹے کے اندر اندر نئے خلیفہ کا انتخاب عمل میں آجائے۔ قطع نظر اس کے کہ مجلس انتخاب کے کل اراکین موقع پر موجود ہوں یا نہ ہوں۔ نئے خلیفہ کا انتخاب بہر صورت کرلیا جائے کیونکہ امام کے بغیر جماعت کے وجود کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر کوئی غیر معمولی صورت حال پیدا نہ ہو اور کوئی مجبوری نہ ہو جیسا کہ اب کی بار ہوا تو انتخاب کو حسب قواعد تین دن تک کے لئے موخر بھی کیا جاسکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ مجلس انتخاب کے کسی بھی رکن کے لئے ربوہ پہنچنے کے لئے تین دن کی مہلت ایک معقول وقفہ ہے۔

(حضرت) مسیح موعودؑ نے اعلان فرمایا تھا کہ انہیں اِلہاماً بتایا گیا ہے کہ ان کی وفات کی گھڑی قریب آچکی ہے اور وہ کسی بھی لمحے اس دار فانی سے کوچ کر سکتے ہیں۔ انہوں نے تفصیل سے اس امر پر زور دیا کہ ان کے آسمانی مشن کی تکمیل کے لئے ان کے قائم مقام خلفاء کا وجود کتنا ضروری اور لابدی ہے۔

انہوںؑ نے فرمایا کہ خدا تعالیٰ نے مجھے تسلی دی ہے کہ میری وفات نہیں ہوگی جب تک میری بہت سی پیش گوئیاں پوری نہ ہو جائیں۔ اور خدمت اسلام کے لئے میرے لگائے ہوئے پودوں کو پھل لگنا شروع نہ ہو جائیں۔

اگرچہ وہ وقت موعود ابھی نہیں آیا تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے انہیں بتادیا تھا کہ وہ اس کے لئے تیار رہیں۔ چنانچہ ان کے مفوضہ فرائض میں ایک یہ فرض بھی شامل تھا کہ وہ ایسی راہیں ہموار کر جائیں جن پر چل کر ان کے جانشین ان کے مشن کو

پایہ تکمیل تک پہنچا سکیں۔ انہوں نے فرمایا :

"اللہ تعالیٰ اس سلسلے کو برکت دے گا۔ اور اسے عظیم کامیابیوں سے نوازے گا۔"

"یہ سلسلہ بڑھے گا اور پھلے گا اور پھولے گا۔"

"کئی حوادث ظاہر ہوں گے اور کئی آفتیں زمین پر اتریں گی۔ کچھ تو ان میں سے میری زندگی میں ظہور میں آجائیں گی اور کچھ میرے بعد ظہور میں آئیں گی اور وہ اس سلسلہ کو پوری ترقی دے گا۔ کچھ میرے ہاتھ سے اور کچھ میرے بعد۔"

انہوں نے ایک دستاویز میں جو "الوصیت" کے نام سے مشہور ہوئی لکھا کہ یہ ترقیات فوراً ظاہر نہیں ہوں گی۔ یوں محسوس ہو گا جیسے میری بے وقت وفات ہوئی ہو۔ الٰہی کاموں کا یہ ایک منفرد انداز ہے۔

ارض مقدس کی طرف جاتے ہوئے (حضرت) موسیٰ (علیہ السلام) راستے ہی میں وفات پاگئے اور اپنے پیروکاروں کو بلکتا چھوڑ گئے جو اپنے آپ کو بے یار و مددگار پا کر صحرا میں چالیس دن تک خون کے آنسو روتے رہے۔ یہی کچھ یسوع مسیح کے ساتھ ہوا۔ ان کی مفروضہ وفات کے بعد ان کے پیروکار منتشر ہو گئے۔ اور ان کے سب سے وفادار حواری پطرس نے ان پر لعنت بھیجی۔

جب بانی اسلام (حضرت) محمد (مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم) کی وفات ہوئی تو آپ کے کئی متبعین نے اسلام سے روگردانی کا راستہ اختیار کر لیا۔ مگر اس وقت خدا (تعالیٰ) نے ایک دوسرا نشان ظاہر کیا جس سے اس کی قدرت بڑی شان سے ظاہر ہوئی۔ اس نے (حضرت) ابوبکرؓ کو مضبوطی کے ساتھ کھڑا کر دیا۔ تا کہ وہ ثابت کر دیں کہ خدا

نے قرآن میں جو وعدہ کیا تھا وہ سچا تھا- اور وہ اس مذہب کو جسے اس نے ان کے لئے پسند کیا تھا تمکنت بخشے گا اور خوف کی حالت کو امن اور سکینت سے بدل دے گا- چنانچہ یہی کچھ (حضرت) مسیح موعود (علیہ السلام) کے ساتھ ہوا- آپ نے اعلان کیا:

"میں خدا کی طرف سے ایک قدرت کے رنگ میں ظاہر ہوا اور میں خدا کی ایک مجسم قدرت ہوں اور میرے بعد بعض اور وجود ہوں گے جو دوسری قدرت کا مظہر ہوں گے سو تم خدا کی قدرت ثانی کے انتظار میں اکٹھے ہو کر دعا کرتے رہو اور چاہئے کہ ہر ایک صالحین کی جماعت ہر ایک ملک میں اکٹھے ہو کر دعا میں لگیں رہیں تا دوسری قدرت آسمان سے نازل ہو اور تمہیں دکھادے کہ تمہارا خدا ایسا قادر خدا ہے-"

"اور چاہئے کہ جماعت کے بزرگ جو نفس پاک رکھتے ہیں میرے نام پر میرے بعد لوگوں سے بیعت لیں- خدا تعالیٰ چاہتا ہے کہ اُن تمام روحوں کو جو زمین کی متفرق آبادیوں میں آباد ہیں- کیا یورپ اور کیا ایشیا ان سب کو جو نیک فطرت رکھتے ہیں توحید کی طرف کھینچے اور اپنے بندوں کو دین واحد پر جمع کرے- یہی خدا تعالیٰ کا مقصد ہے جس کے لئے میں دنیا میں بھیجا گیا- سو تم اس مقصد کی پیروی کرو مگر نرمی اور اخلاق اور دعاؤں پر زور دینے سے"-

(حضرت) مسیح موعود (علیہ السلام) نے یہ بھی بتایا کہ ان کے جانشین کو منتخب کرنے کا طریق کار کیا ہو گا- فرمایا:

"ایسے لوگوں کا انتخاب مومنوں کے اتفاق رائے پر ہو گا
پس جس شخص کی نسبت چالیس مومن اتفاق کریں گے کہ وہ
اس بات کے لائق ہے کہ میرے نام پر لوگوں سے بیعت لے
وہ بیعت لینے کا مجاز ہو گا۔ اور چاہئے کہ وہ اپنے تئیں دوسروں
کے لئے نمونہ بناوے۔ خدا نے مجھے خبر دی ہے کہ میں تیری
جماعت کے لئے تیری ہی ذریت سے ایک شخص کو قائم کروں
گا۔ اور اس کو اپنے قرب اور وحی سے مخصوص کروں گا اور
اس کے ذریعہ سے حق ترقی کرے گا اور بہت سے لوگ سچائی
کو قبول کریں گے۔ سو اُن دنوں کے منتظر رہو اور تمہیں یاد
رہے کہ ہر ایک کی شناخت اس کے وقت میں ہوتی ہے اور
قبل از وقت ممکن ہے کہ وہ معمولی انسان دکھائی دے یا بعض
دھوکا دینے والے خیالات کی وجہ سے قابل اعتراض ٹھہرے
جیسا کہ قبل از وقت ایک کامل انسان بننے والا بھی پیٹ میں
صرف ایک نطفہ یا علقہ ہوتا ہے"۔

صلح کا وہ پیغام ایک بار پھر دہرایا گیا جس سے ان کی تصانیف اور ساری زندگی
عبارت ہے فرمایا :

"کینہ وری سے پرہیز کرو اور بنی نوع سے سچی ہمدردی
کے ساتھ پیش آؤ۔ ہر ایک راہ نیکی کی اختیار کرو۔ نہ معلوم
کس راہ سے تم قبول کئے جاؤ"۔

۱۹۸۲ء میں منعقد ہونے والی مجلس انتخاب کے ایک سو اڑتالیس اراکین
ربوہ پہنچ چکے تھے اور اب مسجد مبارک میں باقاعدگی کے ساتھ گروپ وار درج

بدرجہ منقسم ہو کر ترتیب سے بیٹھے ہوئے تھے۔ سب سے پہلے تو (حضرت) مسیح موعود(علیہ السلام) کے صحابہ تھے۔ پھر صدر انجمن احمدیہ کے اراکین تھے جو کہ جماعت کا سب سے بڑا تنظیمی ادارہ ہے۔ ان کے ساتھ پاکستان سے باہر کے مشنوں کے اراکین تھے۔ سبھی محبت اور یگانگت کی فضا میں ایک دوسرے کے ساتھ گھل مل کر بیٹھے ہوئے تھے۔ کچھ بزرگوں کے نام زیر زبان لئے جا رہے تھے جن میں سے کسی ایک کو منصب خلافت کے لئے منتخب کیا جا سکتا تھا۔ کارروائی شروع ہوئی تو صدر اجلاس صاحبزادہ مرزا مبارک احمد حاضرین مجلس سے یوں مخاطب ہوئے:

"احباب کرام! یہ بحث و تمحیص کا موقع نہیں ہے۔ نہ ہی کسی کے حق میں یا خلاف تقاریر ہوں گی۔ ہم یہاں ایک مقدس فرض کی ادائیگی کے لئے اکٹھے ہوئے ہیں اور وہ ہے نئے خلیفہ کا انتخاب۔ ہم یقین رکھتے ہیں کہ خدا تعالیٰ اس موقع پر ہماری رہنمائی فرمائے گا۔ اس لئے ہم بے کار بحث میں وقت ضائع نہیں کریں گے۔ مقصد صرف یہ ہے کہ آپ اس شخص کا نام تجویز کریں جو آپ کے نزدیک خلیفہ بننے کا اہل ہے"۔

صدر مجلس کے ان کلمات کے بعد ایک اضطراب اور بے قراری کی سی کیفیت پیدا ہو گئی (حضرت) چوہدری محمد ظفر اللہ خان اس جوش و جذبہ اور ان سنسنی خیز لمحات کا بڑے واضح الفاظ میں ذکر کرتے ہیں جن سے مسجد مبارک میں موجود حاضرین مجلس دوچار تھے۔ انہوں نے اس ناقابل برداشت گرمی کا ذکر بھی کیا ہے جو مسجد کی چھت کے نیچے چلچلاتی دھوپ سے محفوظ اور نسبتاً کم گرم ماحول میں بھی ان کو بے چین کر رہی تھی۔ چوہدری ظفر اللہ خان شروع ہی سے دبلے

پتلے اور چھریرے بدن کے مالک تھے اور گرمی کے باعث توان کا جسم اور بھی کمزور اور دبلا ہو چکا تھا- انہوں نے ایک ہلکا سا کرتہ اور بنیان اور ڈھیلی ڈھالی شلوار پہنی ہوئی تھی- پسینہ جسم سے پانی کی طرح بہہ رہا تھا اور ان کے کپڑے یوں بھیگ رہے تھے جیسے کسی نے ان پر پانی کی بھری ہوئی بالٹی انڈیل دی ہو- ووٹ دینے کے لئے ہاتھ کھڑا کرنا کافی تھا- کچھ اراکین ووٹوں کی گنتی کے لئے متعین کئے جا چکے تھے- کارروائی یوں شروع ہوئی-

صدر مجلس : انتخاب کے لئے نام تجویز کریں فوراً قریباً پچاس آوازیں بیک وقت بلند ہوئیں-

صدر مجلس : کوئی اور نام تجویز کریں، پہلے کی طرح ایک اور نام تجویز کیا گیا-

صدر مجلس : کوئی اور نام تجویز کریں پھر ایک اور نام تجویز کیا گیا-

صدر مجلس : کوئی اور نام تجویز کریں، اب کی بار سب خاموش رہے اور کوئی نام تجویز نہیں کیا گیا منتخب ہونے والا خلیفہ انہی تین میں سے ایک ہوگا-

صدر مجلس : پہلے پیش کئے جانے والے نام کے لئے رائے دیں- ہاتھ بلند ہوئے- گنتی کرنے والوں نے بڑی مستعدی کے ساتھ گنتی شروع کی اور اپنے اپنے نتائج صدر مجلس تک پہنچا دیئے- اب صدر مجلس کھڑے ہو گئے اور مکمل خاموشی کے اشارے کے ساتھ ہی آوازوں کا شور تھم گیا اور مکمل خاموشی چھا گئی-

صدر مجلس : حضرات! مزید رائے شماری کی ضرورت نہیں- ۱۴۸ رائے

دہندگان میں سے ۱۳۰ نے (حضرت) صاحبزادہ مرزا طاہر احمد
کے حق میں رائے دی ہے اب جماعت احمدیہ کے نئے خلیفہ
(حضرت) مرزا طاہر احمد ہیں۔

اس پر مبارک باد کا ایک شور بلند ہوا۔ جوش اور جذبے کا عجیب عالم تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے بجلی کی ایک لہر دوڑ گئی ہو' اس پر
(حضرت) مرزا طاہر احمد کھڑے ہوئے۔ مسجد میں مکمل سکوت طاری ہو گیا۔ آپ نے حلف اٹھایا۔ یہ وہ حلف تھا جس نے ان کے وجود اور مقام کو یکسر بدل کر رکھ دیا۔ اب وہ ایک کروڑ انسانوں کے لئے پہلے کی طرح کے عام انسان نہیں رہے تھے صاحبزادہ مرزا طاہر احمد اب خدا کا ایک مقبول اور محبوب بندہ بن چکے تھے۔ ایسا بندہ جس کی دعائیں خدا (تعالیٰ) بڑے ہی پیار سے سنتا ہے اور انہیں شرف قبولیت بخشتا ہے۔ وہ اب نجات کا راستہ دکھانے پر ہی مامور نہیں کئے جا چکے تھے بلکہ وہ اب راستے کی روشنی اور نور کا مینار بھی بن چکے تھے۔ وہ اب عام بیماروں اور قریب المرگ مریضوں کے لئے صرف تسلی اور تسکین کا باعث ہی نہیں ہوں گے۔ بلکہ اگر مشیت ایزدی چاہے تو ان کی شفایابی کا ذریعہ بھی ثابت ہوں گے۔ مسند خلافت پر متمکن ہونے کے بعد اب وہ پہلے سے ایک عام فرد نہیں رہے تھے۔ اب خدا (تعالیٰ) قدم قدم پر ان کی راہنمائی فرمائے گا' انہیں ہر فیصلہ کن مرحلے پر صحیح فیصلے کی توفیق دے گا اور اگر کبھی ان سے بظاہر غلط فیصلہ بھی ہو جائے تو خدا تعالیٰ اپنے تصرف سے اس فیصلے کو انجام کار صحیح فیصلے میں بدل دے گا۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ انتخاب خلافت کے موقع پر آپ کے جذبات کیا تھے' تو (حضرت) خلیفہ رابع نے جواباً بتایا:

"ہم لوگوں کو شعوری طور پر موقع کی اہمیت اور نزاکت

کا شدت سے احساس تھا۔ ہم یہ نہیں سوچ رہے تھے کہ کون
کس کا نام تجویز کر رہا ہے۔ کم از کم اپنے متعلق تو میں وثوق
سے کہہ سکتا ہوں کہ میرے دل میں تو قطعاً ایسا کوئی خیال
نہیں تھا، میں کیسے بتاؤں کہ جب ابتداء ہی میں میرا نام تجویز
ہوا تو مجھے کتنی شدید گھبراہٹ ہوئی اور میں کتنا فکر مند ہوا۔
میں اتنا پریشان ہوا کہ میں نے سوچنا چھوڑ دیا۔

جہاں تک میری اپنی رائے کا تعلق ہے تو میرے ذہن
میں تو صرف ایک نام تھا اور وہ نام (صاحبزدہ) مرزا مبارک
احمد کا تھا۔ وہ میرے بڑے بھائی تھے، وہ مجھ سے عمر میں بھی
خاصے بڑے تھے۔ ان کا تجربہ تھا اور میری نسبت زیادہ اہم
عہدوں پر کام کر چکے تھے جماعت بھر میں ان کا نام ادب اور
احترام سے لیا جاتا تھا۔ میرے نزدیک وہی خلیفہ بننے کے اہل
تھے اور پھر اچانک خلافت کی عظیم ذمہ داری کا بار میرے
شانوں پر آن پڑا اور مشیت خداوندی نے مجھے خلیفہ بنا دیا"۔

(حضرت) خلیفہ رابع نے اپنے نئے منصب کا حلف اردو زبان میں اٹھایا اور
حلف کے الفاظ کو بڑے وثوق اور یقین کے ساتھ ادا کیا، حلف کے الفاظ یہ تھے

"میں اللہ تعالیٰ کو حاضر وناظر جان کر کہتا ہوں کہ میں
خلافت احمدیہ پر ایمان لاتا ہوں اور میں ان لوگوں کو جو
خلافت احمدیہ کے خلاف ہیں باطل پر سمجھتا ہوں اور میں
خلافت احمدیہ کو قیامت تک جاری رکھنے کے لئے پوری

کوشش کروں گا اور اسلام کی تبلیغ کو دنیا کے کناروں تک پہنچانے کے لئے انتہائی کوشش کرتا رہوں گا۔ اور میں ہر غریب اور امیر احمدی کے حقوق کا خیال رکھوں گا اور قرآن شریف اور حدیث کے علوم کی ترویج کے لئے جماعت کے مردوں اور عورتوں میں ذاتی طور پر بھی اور اجتماعی طور پر بھی کوشاں رہوں گا۔"

حلف کے بعد (حضرت) خلیفہ رابع نے اعلان کیا کہ اب بیعت لی جائے گی اور فرمایا: "اس مقصد کے لئے میری خواہش ہے کہ (حضرت) مسیح موعود (علیہ السلام) کے کسی ممتاز صحابی کا ہاتھ میرے ہاتھ پر ہو"۔

یہ کہہ کر (حضرت) خلیفہ رابع نے (حضرت) چوہدری محمد ظفراللہ خاں کی طرف اشارہ کیا جو دور مسجد کی آخری صف میں جوتوں کے درمیان کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے (حضرت) چوہدری صاحب اتنے فاصلے سے (حضرت) خلیفہ رابع کی آواز تو نہ سن سکے لیکن لوگ فوراً پیچھے سمٹ گئے اور محترم چوہدری صاحب کے لئے راستہ بنا دیا گیا اور انہیں بعجلت تمام ہاتھوں ہاتھ اگلی صف تک پہنچا دیا گیا راستے میں حاضرین نے انہیں سہارا بھی دیا تا کہ گرنے نہ پائیں۔ بعد میں (حضرت) چوہدری محمد ظفراللہ خان نے مسکراتے ہوئے بتایا کہ اس ہجوم اور جوش میں میرا پاؤں کسی کے پاؤں تلے آکر کچلا گیا اور سن ہو کر رہ گیا۔

(حضرت) خلیفہ رابع نے اس عمر رسیدہ اور بزرگ صحابی کے ہاتھ کو نہایت محبت سے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ لوگوں نے سلسلہ وار اپنے ہاتھ ایک دوسرے کے ہاتھوں پر رکھ دیئے اس طرح خلیفہ وقت کے ہاتھ سے منسلک ہاتھوں کا پاک

مربوط سلسلہ قائم ہوگیا۔ مجلس انتخاب کے ۱۴۸ اراکین نے بیک وقت (حضرت) خلیفہ رابع سے بیعت کا عہد باندھا' شدت جذبات سے (حضرت) چوہدری محمد ظفراللہ خاں کی آواز کانپ رہی تھی۔ الفاظ بمشکل منہ سے نکل رہے تھے۔ بات ہی کچھ ایسی تھی۔ بیعت کے الفاظ جنہیں وہ دہرا رہے تھے یہ وہی الفاظ ہیں جو انہوں نے (حضرت) مسیح موعود (علیہ السلام) کی بیعت کا اقرار کرتے وقت دہرائے تھے۔ اور (حضرت) مولوی نورالدین (رضی اللہ عنہ) خلیفہ اول۔ (حضرت) مرزا بشیرالدین محمود احمد خلیفہ ثانیؓ اور (حضرت حافظ) مرزا ناصر احمدؒ خلیفہ ثالث کی بیعت کرتے وقت کہے تھے۔ (حضرت) چوہدری ظفراللہ خان نے بعد میں کہا:

"خدا کا مجھ پر کتنا بڑا احسان ہے کہ میں نے (حضرت) مسیح موعود (علیہ السلام) کا زمانہ پایا اور پھر اس نے مجھے اتنی زندگی دی کہ (حضرت) مسیح موعودؑ کے چار خلفاء کا زمانہ دیکھوں اور ان چاروں ہستیوں کا ان آنکھوں سے مشاہدہ کروں۔ یقیناً یہ خدا تعالیٰ کی طرف سے ایک بہت بڑا انعام ہے"۔

بیعت کے لفظی معنی ہیں "بک جانا" چنانچہ بیعت کرنے کا مطلب یہ ہوا کہ بیعت کرنے والوں نے برضا و رغبت اپنی جان' ایمان اور مستقبل کو خلیفہ وقت کے ذریعے اللہ (تعالیٰ) کے حضور پیش کردیا' آج سے خلیفہ وقت کی ہلکی سی خواہش بھی ان کے لئے حکم کا درجہ رکھے گی' بیعت کے وہ الفاظ جو چوہدری محمد ظفراللہ خان اور مجلس انتخاب کے جملہ اراکین نے بیک آواز دہرائے' یہ تھے

اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ

وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ۔

اَشْهَدُ اَنْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ
وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ.

اَشْهَدُ اَنْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ
وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ.

میں آج طاہر کے ہاتھ پر بیعت کر کے سلسلہ احمدیہ میں داخل ہوتا ہوں اور اپنے تمام پچھلے گناہوں سے توبہ کرتا ہوں اور آئندہ بھی ہر قسم کے گناہوں سے بچنے کی کوشش کرتا رہوں گا' شرک نہیں کروں گا۔ بدظنی نہیں کروں گا۔ غیبت نہیں کروں گا۔ کسی کو بھی دکھ نہیں پہنچاؤں گا۔ دین کو دنیا پر مقدم رکھوں گا۔ اسلام کے سب حکموں پر عمل کرنے کی کوشش کرتا رہوں گا۔ قرآن کریم' احادیث نبویہ اور کتب مسیح موعودؑ کے پڑھنے پڑھانے' سننے سنانے میں کوشاں رہوں گا۔ جو نیک کام آپ بتائیں گے ان میں ہر طرح آپ کا فرمانبردار رہوں گا۔ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کو خاتم النبیین یقین کروں گا اور (حضرت) مسیح موعودؑ کے سب دعاوی پر ایمان رکھوں گا۔

اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ رَبِّىْ مِنْ كُلِّ ذَنْبٍ وَّاَتُوْبُ اِلَيْهِ.
اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ رَبِّىْ مِنْ كُلِّ ذَنْبٍ وَّاَتُوْبُ اِلَيْهِ. اَسْتَغْفِرُ
اللّٰهَ رَبِّىْ مِنْ كُلِّ ذَنْبٍ وَّاَتُوْبُ اِلَيْهِ. رَبِّ اِنِّىْ ظَلَمْتُ

نَفْسِیْ وَاعْتَرَفْتُ بِذَنْبِیْ فَاغْفِرْلِیْ ذُنُوْبِیْ فَاِنَّہٗ لَایَغْفِرُالذُّنُوْبَ اِلَّااَنْتَ۔

اے میرے رب! میں نے اپنی جان پر ظلم کیا اور اپنے گناہوں کا اقرار کرتا ہوں۔ تو میرے گناہ بخش کہ تیرے سوا کوئی بخشنے والا نہیں! آمین!"

مسجد کے باہر ہجوم بے تابی سے فیصلے کا منتظر تھا۔ مسجد کے اندر بیعت شروع ہوئی تو باہر بھی فوراً ہی اندازہ ہو گیا کہ خلافت کا انتخاب ہو چکا۔ اس پر ایک شور بلند ہوا جس کی گونج مسجد کے باہر تک سنی جا سکتی تھی۔

اب مسجد کے تین دروازے کھول دیئے گئے تھے' انسانوں کا ایک بے قرار سیلاب پہرہ داروں کو پیچھے دھکیلتا ہوا مسجد کے اندر داخل ہو گیا۔ تمام زبانوں پر ایک ہی نام تھا اور وہ (حضرت) خلیفہ رابع کا نام تھا جسے بآواز بلند چلا چلا کر دہرایا جا رہا تھا۔ نعروں کے شور میں کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ ہر شخص نئے منتخب شدہ خلیفہ کی بیعت کرنے کے لئے بے تاب تھا۔ لوگوں نے اپنی پگڑیاں کھول کر پھیلا دی تھیں تاکہ ان کے ذریعہ زیادہ لوگوں کا رابطہ اپنے امام اور روحانی پیشوا سے قائم ہو جائے۔ وہ امام اور پیشوا جسے آج کے دن خدا تعالیٰ نے ان کے لئے چن لیا تھا۔

(حضرت) خلیفہ رابع لوگوں سے مسلسل بیعت لے رہے تھے۔ انہوں نے کھال کی معمولی سی ٹوپی پہنی ہوئی تھی جسے عرف عام میں جناح کیپ کہا جاتا ہے۔ بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح بھی اسی قسم کی ٹوپی پہنا کرتے تھے۔ اتنے میں ایک اور نعرہ بلند ہوا۔

ایک صاحب سنہری کلاہ پر بندھی ہوئی ایک پگڑی لے آئے اب یہ پگڑی

خلفائے احمدیت کا روایتی لباس بن چکی ہے۔ (حضرت) خلیفہ رابع نے عجیب ربودگی اور وارفتگی کے عالم میں پگڑی کو سر پر رکھ لیا اور بدستور بیعت کا عہد لیتے رہے۔

دو گھنٹے مسلسل بیعت لینے کے بعد (حضرت) خلیفہ رابع نے حاضرین کو جانے کی اجازت دے دی اور اعلان کیا کہ پانچ بجے شام (حضرت) خلیفہ ثالث کی نماز جنازہ ادا کی جائے گی اس لئے سب لوگ بہشتی مقبرے میں پہنچ جائیں اور نماز جنازہ میں ادائیگی کے لئے صفیں درست کرلیں۔ اس اعلان کے بعد (حضرت) خلیفہ رابع خود اپنی رہائش گاہ پر واپس آگئے۔ جہاں انہیں اپنی بیگم اور دیگر رشتہ داروں کی بیعت لینی تھی۔ لیکن آپ نے سب سے پہلے اپنی حقیقی پھوپھی (حضرت سیدہ) امتہ الحفیظ بیگم کی بیعت لی۔

(حضرت) مسیح موعودؑ کی اولاد میں سے وہی تھیں جو اب تک زندہ موجود تھیں۔ بیعت کرنے سے پہلے ان کی بزرگ پھوپھی نے (حضرت) خلیفہ رابع کے دائیں ہاتھ کی تیسری انگلی میں وہ انگوٹھی پہنائی جو اب خلافت احمدیہ کی علامت بن چکی تھی۔ انگوٹھی کے نگینے پر (حضرت) مسیح موعودؑ نے کچھ الفاظ کندہ کروائے تھے جو انہیں الہاماً بتائے گئے تھے اور وہ الفاظ یہ تھے۔

اَلَیْسَ اللّٰہُ بِکَافٍ عَبْدَہٗ

کیا اللہ اپنے بندے کے لئے کافی نہیں ہے۔

(حضرت) خلیفہ ثالث (حافظ) مرزا ناصر احمد ۸ جون ۱۹۸۲ء کو نصف شب سے کچھ پہلے اپنی رہائش گاہ واقع اسلام آباد میں حرکت قلب بند ہونے سے وفات پاگئے تھے۔ ان کی عمر ۷۳ سال تھی۔ ان کی علالت کے دوران ماہرین مسلسل ان کے علاج میں مصروف تھے اور ان ماہرین کی تجویز اور سفارش پر لندن سے دو اور

ماہرین قلب بھی مشورے کے لئے بلوائے گئے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ (حضرت) خلیفہ ثالث صحت یاب ہو جائیں گے۔ لیکن وفات کی صبح ان کی حالت اچانک بہت تشویش ناک ہو گئی

ان کے اہل خانہ یعنی ان کی بیگم۔ تین بیٹے اور دو بیٹیاں جو آپ کو دل کا دورہ پڑنے کے وقت سے اسلام آباد میں ٹھہرے ہوئے تھے اب ان کے بستر علالت کے گرد جمع تھے۔ صاحبزادہ مرزا طاہر احمد بطور نمائندہ جماعت احمدیہ اسلام آباد میں موجود تھے۔ گیارہ بج کر پینتالیس منٹ پر حضرت خلیفہ ثالث پر دل کا دوسرا حملہ ہوا جس سے وہ جانبر نہ ہو سکے اور وفات پا گئے۔ (انا للہ و انا الیہ راجعون)

وفات کی خبر بذریعہ ٹیلیفون ربوہ پہنچائی گئی' جہاں سے یہ خبر دنیا کے تمام ممالک کو روانہ کر دی گئی تاکہ مجلس انتخاب کے اراکین ربوہ پہنچ کر نئے خلیفہ کا انتخاب کریں' جو (حضرت) خلیفہ ثالث کی نماز جنازہ پڑھائے۔ (حضرت) خلیفہ ثالث کی میت کو صبح چار بجے اسلام آباد سے اٹھایا گیا اور ۲۲۵ میل دور ربوہ میں دس بجے دن سے ذرا پہلے پہنچایا گیا۔ سوگواروں کی ایک طویل قطار تھی جو تخمیناً پانچ میل لمبی تھی۔ (حضرت) خلیفہ ثالث کی رہائش گاہ سے لے کر ایک بل کھاتا ہوا طویل اور لامتناہی سلسلہ تھا جو اتنا دور دور تک پھیلا ہوا تھا کہ اس کا سرا ڈھونڈنا مشکل تھا'

ابھی جنازہ ربوہ پہنچے آدھا گھنٹہ بھی نہیں ہوا تھا کہ (حضرت) خلیفہ ثالث کے آخری دیدار سے مشرف ہونے کے لئے سوگواروں نے ایک ایک کر کے آپ کے جسد خاکی کے پاس سے گزرنا شروع کیا۔ سب کے دل شدت غم سے پارہ پارہ ہو رہے تھے اور سچی بات تو یہ ہے کہ آج ہر وہ شخص غمگین تھا جسے ایک بار (حضرت) خلیفہ ثالث سے ملنے کا اتفاق ہوا تھا۔ آپ ایک نہایت زیرک' محنتی'

غریب پرور اور ناداروں اور محرومیوں کے شکار طبقے کے لئے بڑا ہی درد رکھنے والے انسان تھے لیکن ان کا سب سے بڑا سرمایہ ان کا اخلاص تھا۔ بنی نوع انسان کی بھلائی اور بے غرض خدمات کی تڑپ ان کی زندگی کا ماحصل تھی۔ ان کے شدید ترین مخالف بھی یہ تسلیم کرنے پر مجبور تھے کہ خدا نے انہیں غیر معمولی صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ مجلس انتخاب کا اجلاس شروع ہوا تو اس وقت تک (حضرت) خلیفہ ثالثؒ کا چہرہ دیکھنے والے سوگواروں کی قطار قریب الاختتام تھی۔ اب اس کی بجائے ان راستوں پر جہاں سے خلیفہ ثالث کا جنازہ گزرنا تھا لوگوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ دورویہ صف بستہ ہو رہے تھے۔ اسی طرح ہزاروں ہزار کی تعداد میں لوگ بہشتی مقبرے کی ملحقہ پہاڑی پر بھی جمع تھے، نظریں ان کی بہشتی مقبرے کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ مسجد کے اندر جہاں پہلے ایک ہنگامہ برپا تھا اور جوش اور جذبے کا دور دورہ تھا وہاں اب مکمل خاموشی چھائی ہوئی تھی، لوگ مہربلب چپ چاپ کھڑے تھے۔ ادھر لوگوں کا ایک سیلاب تھا جو جنازہ گاہ کی طرف رواں تھا۔ لوگ نماز جنازہ ادا کرنے کے لئے جمع ہو رہے تھے صفیں درست کی جارہی تھیں۔ اتنے میں لاؤڈ اسپیکر پر اعلان ہوا کہ پہاڑی کی شمالی جانب کھڑا ہونے کی گنجائش ہے۔ ادھر (حضرت) خلیفہ ثالث کی رہائش گاہ کے باہر جہاں جنازہ اٹھایا جانا تھا، جنازے کو کندھا دینے کی سعادت حاصل کرنے کے لئے لوگ دیوانہ وار آگے بڑھ رہے تھے، تابوت کے دونوں پہلوؤں کے ساتھ لمبے لمبے بانس مضبوطی سے باندھے گئے تھے تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ جنازے کو کندھا دے سکیں۔ جنازہ روانہ ہوا تو راستے میں دورویہ کھڑے ہوئے لوگ بھی باری باری جنازے کو کندھا دیتے چلے گئے۔ اور یہ اعزاز ایک ایک کرکے ان سوگواروں کے حصے میں آتا چلا گیا۔ جنازہ گزر رہا تھا اور ساتھ ساتھ قرآن کریم کے یہ الفاظ بھی دہرائے جارہے تھے۔

إِنَّا لِلّٰهِ وَ إِنَّآ إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ

جنازہ بہشتی مقبرے پہنچا' سناٹا چھایا ہوا تھا۔ سبھی دم بخود تھے۔ ایک ہو کا سا عالم طاری تھا۔ اچانک لاؤڈ اسپیکر پر اعلان ہوا کہ چونکہ چار دیواری کے اندر جگہ محدود ہے اس لئے نماز جنازہ کے بعد تدفین کے وقت صرف وہی لوگ آئیں جن کے نام لئے جا رہے ہیں۔ باقی لوگ جب تک آخری اجتماعی دعا نہ ہو جائے اپنی اپنی جگہوں پر تشریف رکھیں'

ایک اندازے کے مطابق پچاس ہزار لوگوں نے تجہیز و تکفین میں حصہ لیا۔ (حضرت) خلیفہ ثالث کی سادہ اور سفید سنگ مرمر کی لوح مزار پر ان کا نام اور ان کی تاریخ پیدائش اور تاریخ وفات کندہ کر دی گئی تھی۔

جب (حضرت) خلیفہ رابع نے خاموش اجتماعی دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے تو ہر طرف خاموشی طاری ہو گئی اور پھر سوگوار اسی طرح خاموش چپ چاپ آہستہ آہستہ اپنے اپنے گھروں کی طرف لوٹ گئے۔

☆ ☆ ☆

15

ایک پیشگوئی جو پوری ہوئی

(حضرت)خلیفہ رابع کا انتخاب ہو چکا تھا۔ ان کی مسند نشینی کے بعد کی اولین صبح طلوع ہونے والی تھی۔ ان کے حفاظتی عملے نے قصر خلافت کا قدم بقدم چکر لگایا۔ یہ لوگ کل اس وقت سے پہرہ دے رہے تھے جب (حضرت) خلیفہ رابع کے انتخاب کے بعد مسجد مبارک کے دروازے کھول دیئے گئے تھے اور یہ اعلان کر دیا گیا تھا کہ خلافت رابعہ کا انتخاب ہو چکا ہے۔ اکثر پہریدار نوخیز نوجوان، طلباء یا پیشہ ور کارکن تھے جو اس نیت سے یہاں حاضر ہوئے تھے کہ (حضرت) خلیفۃ المسیح اور قصر خلافت کی حفاظت کے لئے پہلی رات کے پہرہ دینے کی سعادت حاصل کر سکیں، مستقل حفاظتی عملے نے ان کو ان کے فرائض سے اچھی طرح آگاہ کر دیا تھا۔

کسی قسم کی گڑبڑ کا اندیشہ نہیں تھا اور نہ ہی کوئی ناخوشگوار صورت حال پیدا ہوئی تھی، ہوا میں ہلکی سی خنکی تھی۔ لوگ بڑے سکون اور اطمینان سے چل پھر

رہے تھے۔ قصر خلافت میں مکمل خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ پہریدار بھی آہستہ آہستہ زیر لب گفتگو کر رہے تھے۔ صبح کے چھ بج چکے تھے۔ ظاہر ہے کل کے غم اور پھر مسرت اور شدید جذبات کے دباؤ کے بعد لوگ اب آرام اور سکون کی نیند سو رہے تھے۔

اچانک قصر خلافت کا صدر دروازہ کھلا۔ (حضرت) خلیفہ رابع باہر تشریف لائے اور سیدھے اس جگہ گئے جہاں ان کی سائیکل پڑی ہوئی تھی۔ انہوں نے پہریداروں کو بتایا کہ وہ تحریک جدید کے دفاتر کی طرف جا رہے ہیں۔ یہ سن کر پہریدار پریشان ہو گئے۔ (حضرت) خلیفہ رابع نے انہیں بتایا کہ کار کی ضرورت نہیں ہے۔ میں ورزش کرنی چاہتا ہوں۔ آپ بھی ایک سائیکل اٹھالیں اور میرے پیچھے پیچھے چلے آئیں۔

پہرہ داروں نے حکم کی تعمیل کی لیکن اسی شام افسر حفاظت نے (حضرت) خلیفہ رابع کی خدمت میں ادب سے احتجاج کرتے ہوئے عرض کیا کہ حضور ا سوال ورزش کا نہیں ہے' سوال حفاظت کا ہے۔ اگر پہریدار سائیکل چلانے میں مصروف ہو تو وہ حفاظت کی طرف توجہ نہیں دے سکتا۔ اگر اجازت ہو تو عرض کروں کہ اب حضور کی صحت و سلامتی اور تحفظ کے لئے ہر احمدی فکر مند ہے اور اسے اپنی ذمہ داری سمجھتا ہے۔

بادلِ ناخواستہ افسر حفاظت کی تجویز قبول کر لی گئی۔ ظاہر ہے کہ خلافت کے فرائض منصبی اور ذمہ داریاں اب آہستہ آہستہ پابندیاں بن کر سامنے آرہی تھیں۔ فوری تبدیلی تو یہ ہوئی کہ لوگوں کا (حضرت) خلیفہ رابع سے بات کرنے کا انداز یکسر بدل گیا۔ ان کے بچے تو پہلے بھی معمول کے مطابق ان کو "آپ" کہہ کر ہی پکارتے تھے۔ اگرچہ انگریزی میں واحد حاضر کے صیغے کا استعمال متروک ہو چکا

ہے لیکن اردو، فرانسیسی اور دیگر بہت سی زبانوں میں رشتے داروں اور دوستوں کے درمیان واحد حاضر کے صیغے کا استعمال اب بھی ہوتا ہے۔

لیکن اب ہر شخص حتیٰ کہ ان کے بھائی بہنیں بھی انہیں جمع حاضر کے صیغے میں یعنی "آپ" کہہ کر پکارنے لگے۔ ان کی محبت کی حرارت اور گرمجوشی تو اب بھی بدستور قائم تھی۔ لیکن اب وہ ایک اور رشتے کے نیچے چھپ گئی تھی یہ ایک بالکل ہی نیا اور مختلف رشتہ تھا۔ انہیں اپنے آپ کو نئی صورت حال کے مطابق ڈھالنے میں کچھ وقت لگا۔ وہ خود کہتے ہیں۔

"میں ہمیشہ شش و پنج میں پڑ جاتا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ مجھ سے نہیں بلکہ میرے منصب سے مخاطب ہوں۔ جب وہ مجھ سے بات کرتے وقت ادب و احترام کے اظہار کے لئے مخصوص الفاظ استعمال کرتے تھے تو مجھے سخت گھبراہٹ ہوتی تھی اور یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ مجھ سے نہیں، کسی اور سے بات کر رہے ہوں۔ کبھی کبھی تو جی چاہتا تھا کہ مڑ کر تو دیکھوں کہ وہ ہے کون جس سے میرا مخاطب گفتگو کر رہا ہے۔

دوہری شخصیت کا یہ احساس ایک عرصے تک قائم رہا، لیکن بتدریج یہ دونوں شخصیتیں ایک دوسری میں جذب ہو کر ایک شخصیت بن گئیں جو بیک وقت (حضرت) خلیفۃ المسیح بھی تھی اور مرزا طاہر احمد بھی۔

اگر مجلس انتخاب کے اراکین سے کوئی پوچھے کہ آپ نے (حضرت) خلیفۃ المسیح الرابع کے حق میں رائے کیوں دی تھی تو وہ یقیناً سوال کی سادگی اور سوال کرنے والے کی سادہ لوحی پر حیرت سے سر ہلائیں گے اور کہیں گے کہ ان کی صفات گننے کی تو کوئی ضرورت ہی نہیں تھی، رائے ہم نے نہیں دی، انتخاب ہم

نے نہیں، خدا نے کیا، خدا کے علم میں تھا کہ خلیفہ رابع کو کون کون سی مہمات پیش آئیں گی اس لئے اس نے خود انتخاب کے وقت رائے دہندگان کی رہنمائی فرمائی۔ ہمارے لئے مزید تردد کا نہ موقع تھا اور نہ ہی اس کی ضرورت۔

لیکن ایک رائے دہندہ نے اپنی وجوہ کا خلاصہ کچھ اس طرح بیان کیا:

"قرآن کریم اور تعلیمات اسلامی پر ان کا عبور اور تبحر علمی، ان کی شفقت، محبت، دردمندی، جماعت کے افراد کے ساتھ ان کا قریبی رابطہ اور تعلق، جماعت کی مشکل اور نازک گھڑیوں میں ان کی منفرد اور ممتاز خدمات اور کارہائے نمایاں اور ان کی حیران کن اور عظیم قائدانہ صلاحیتیں"۔

آپ کو اپنے انتخاب پر کسی قسم کا افسوس یا حیرت تو نہیں ہوئی؟ فرمایا:

"افسوس تو اس وقت ہوتا ہے جب آپ کو اپنی مرضی پر اختیار حاصل ہو۔ جب آپ کی اپنی کوئی مرضی ہی نہ ہو تو افسوس یا حسرت کیسی؟ خواہش آپ کر سکتے ہیں لیکن یہ بھی ایک غیر متعلق سی بات ہے، خصوصاً میرے بارے میں اور اس کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ یہ منصب حاصل کرنے کے لئے کوئی منصوبہ بنایا گیا ہو یا کوئی کوشش کی گئی ہو"۔

جب ان سے اصرار سے پوچھا گیا کہ کیا کبھی ان کے دل میں حسرت پیدا ہوئی کہ کاش انہیں منتخب نہ کیا جاتا؟ تو جواب دیا:

"نہیں، یہ بھی نہیں۔ میں ایسی ذمہ داری اور غم کو جو ایک نیک مقصد کے لئے اٹھانا پڑے ایک انعام سمجھتا ہوں اور اس میں ایک گونہ لذت محسوس کرتا ہوں اس لئے اس

قسم کی حسرت تو کبھی قریب بھی نہیں پھٹکی ' ہاں اس بات کا مجھے
شعوری طور پر یقیناً احساس ہے کہ یہ سب کچھ میرے لئے
بہت بڑا چیلنج ہے۔ صرف ایک دفعہ ایک احمدی نے یہ حرکت
ضرور کی کہ اس شخص کو جو کبھی مرزا طاہر احمد تھا آمادہ کرے
کہ اس شخص پر جو اب خلیفۃ المسیح بن چکا ہے اپنا اثر رسوخ
استعمال کرے۔

آپ نے فرمایا "یہ سب کچھ ایک مکتوب کے ذریعے
وقوع پذیر ہوا ' خط لکھنے والے نے مجھے یاد دلایا کہ اس نے
رائے میرے حق میں دی تھی ' اس سے میں بہت رنجیدہ
خاطر ہوا اور مجھے غصہ بھی آیا۔ میں نے اسے جواباً بتایا کہ مجھے
اس اطلاع سے کوئی دلچسپی نہیں کہ آپ نے اس وقت اپنی
رائے کو کس طرح استعمال کیا۔ نہ ہی اس کا ان واقعات سے
کوئی تعلق ہے جو اس وقت ہو رہے ہیں مگر ایک بات کا تعلق
ضرور ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ سچ نہیں بول رہے ہیں۔
محض لکھ دینے سے آپ سچے نہیں ہو سکتے آپ کسی بات کو
توڑ مروڑ کر اور مسخ کر کے پیش کرنے کی کوشش کر رہے
ہیں ' آپ کی اس حرکت نے آپ کے متعلق میری حسن ظنی
کو سخت دھچکا لگایا ہے"۔ اسی تسلسل میں مزید فرمایا۔

"ایسے انتخاب میں ذاتی جذبات کا کوئی عمل دخل نہیں
ہوتا۔ اگر لوگ آپ کے حق میں رائے دیتے ہیں تو آپ کی
ذات پر کوئی احسان نہیں کرتے۔ انہوں نے آپ کے حق میں

رائے دی تو صرف اس لئے کہ جماعت سے ان کا تعلق وفا اور اخلاص پر مبنی تھا۔ ان کے لئے اور کوئی متبادل راستہ تھا ہی نہیں۔ وہ اس بات پر مکلف تھے کہ اپنی رائے اس شخص کے حق میں استعمال کریں جو ان کی دانست میں سب سے زیادہ تقویٰ شعار ہو اور خدا سے ڈرنے والا ہو' اس کے علاوہ کوئی اور چارہ کار تھا ہی نہیں' بس یہ ہے ہمارا انداز فکر اور عقیدہ' یہی وجہ ہے کہ یہ بات بالکل غیر متعلق ہو کر رہ جاتی ہے کہ کس نے آپ کے حق میں رائے دی اور کس نے نہیں دی"۔

البتہ دو احمدی ایسے تھے جنہیں ان کے خلیفہ منتخب ہونے پر کوئی حیرت نہیں ہوئی۔ انہیں گزشتہ پچاس سال سے اس بات کا علم تھا کہ بالآخر وہ خلیفہ منتخب ہو کر رہیں گے۔

ان میں سے ایک تو انور کاہلوں تھے۔ انہیں حضرت خلیفہ رابع کی پیدائش کا دن خوب یاد تھا' اسی دن تو قادیان میں پہلی بار ریل گاڑی آئی تھی۔ اگرچہ انور کاہلوں عمر میں دس سال بڑے تھے' جن دنوں (حضرت) خلیفہ رابع لندن میں زیر تعلیم تھے دونوں میں بہت گہرے دوستانہ روابط قائم ہو گئے تھے' انور کاہلوں ایک کامیاب تاجر تھے اور کاروبار سے ریٹائر ہونے سے پہلے امیر جماعت ہائے احمدیہ برطانیہ کے منصب تک پہنچ چکے تھے' انہوں نے ادب واحترام کے تقاضوں کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے (حضرت) خلیفہ رابع کو بچپن کے دنوں میں بھی ہمیشہ آپ کہہ کر ہی مخاطب کیا (حضرت) مسیح موعودؑ کے پوتے کی حیثیت سے یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں۔ کچھ لوگ انہیں "آپ" کہہ کر ہی پکارتے تھے اگرچہ کچھ لوگ ایسا نہیں

بھی کرتے تھے، بچپن میں انور کاہلوں کی والدہ نے انہیں تاکید کی تھی کہ وہ (حضرت) مسیح موعودؑ کے جملہ افراد خاندان سے بالعموم اور صاحبزادہ مرزا طاہر احمد سے بالخصوص ہمیشہ ادب اور احترام سے پیش آیا کریں۔

جب انور نے اس کی وجہ پوچھی تو انکی والدہ صاحبہ نے کہا کہ وجہ تو میں نہیں بتاؤں گی لیکن میری نصیحت پر عمل ضرور کرنا۔ انور نے وعدہ کیا کہ ایسا ہی کروں گا۔ اس وعدے کی خاطر جو انہوں نے پچاس سال پہلے اپنی والدہ سے کیا تھا۔ اور باوجود اسکے کہ صاحبزادہ صاحب ان سے دس سال چھوٹے تھے، انور کاہلوں انہیں ہمیشہ ادب اور احترام کے ساتھ "آپ" کہہ کر مخاطب کرتے رہے۔ جیسا کہ اوپر ذکر آچکا ہے لندن میں قیام کے دوران انور کاہلوں اور انکی اہلیہ امینہ بیگم کے صاحبزادہ مرزا طاہر احمد سے گہرے دوستانہ مراسم قائم ہوگئے یہاں تک کہ امینہ بیگم صاحبزادہ مرزا طاہر احمد کو مخاطب کرتے وقت بے تکلفی سے واحد حاضر کا صیغہ استعمال کرنے لگیں وہ انہیں "طاہری" کہہ کر پکارتیں لیکن انور کاہلوں بدستور ادب سے آپ کہہ کر ہی ان سے مخاطب ہوتے۔ جب صاحبزادہ صاحب سے پوچھا گیا کہ کیا آپ نے انور کاہلوں کا انداز تخاطب محسوس کیا ہے؟ تو آپ نے جواب دیا کہ "ہاں محسوس تو کیا ہے لیکن مجھے اسکا سبب معلوم نہیں"

سبب تو اس کا انور کاہلوں کو بھی معلوم نہیں تھا انہیں تو بس اتنا پتہ تھا کہ یہ ان کی والدہ کی خواہش تھی لیکن جب خلافت رابعہ کا انتخاب ہو چکا تو انور کاہلوں کے والد صاحب نے انہیں مخاطب کرتے ہوئے بتایا:

"آؤ میں تمہیں بتاؤں کہ تمہاری والدہ تم کو ہمیشہ صاحبزادہ طاہر احمد کا ادب واحترام ملحوظ خاطر رکھنے کے لئے کیوں تاکید کرتی تھیں۔

حضرت ام طاہر اور تمہاری والدہ دونوں بہت گہری سہیلیاں تھیں ایک

سہ پہر کا ذکر ہے جب تمہاری والدہ اپنی سہیلی کو ملنے گئیں، صاجزادہ طاہر احمد اس وقت تقریباً تین سال کے تھے۔ اچانک (حضرت) ام طاہر کمرے سے اٹھ کر چلی گئیں اور جلد ہی اپنے شوہر نامدار حضرت خلیفہ ثانی کی دستار لے کر واپس لوٹیں اور اسے ننھے طاہر کے سر پر باندھ دیا اور بولیں۔ طاہر ایک دن خلیفہ بنے گا۔ پھر اس عدم احتیاط پر خود ہی محجوب ہو کر رہ گئیں اور انور کاہلوں کی والدہ سے عہد لیا کہ وہ اس راز کو افشاء نہیں کریں گی انہوں نے یہ نہیں بتایا کہ ان کے اس یقین کی بناء کیا تھی۔ اس کے بعد اس موضوع پر کبھی کوئی بات نہیں ہوئی۔

دونوں سہیلیوں کی ملاقات جس سہ پہر کو ہوئی اسی صبح حضرت ام طاہر کو ایک الہام کا علم ہوا تھا۔ (حضرت) خلیفہ ثانی کچھ دیر تو کسی گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے خاموش بیٹھے رہے تھے۔ پھر بالآخر حضرت ام طاہر سے مخاطب ہو کر کہنے لگے کہ مجھے خدا تعالیٰ نے الہاماً بتایا ہے کہ طاہر ایک دن خلیفہ بنے گا۔ دوسری ماؤں کی طرح (حضرت) ام طاہر بھی اپنے اکلوتے بیٹے کے لئے بڑی اونچی توقعات رکھتی تھیں۔ نسباً نجیب الطرفین سیدہ ہونے کے علاوہ انہیں یہ امتیاز بھی حاصل تھا کہ وہ (حضرت) مسیح موعودؑ کے خاص فرزند مبارک احمد کی منگیتر بھی تھیں اس لئے خاندان (حضرت) مسیح موعود (علیہ السلام) میں وہ ایک خاص مقام کی مالک تھیں۔ بے شک (حضرت) مصلح موعودؓ کے گیارہ فرزند اور بھی تھے لیکن اب یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے (حضرت) ام طاہر کی دلی تمنا بالآخر پوری ہونے والی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ہمہ وقت اسی کوشش میں لگی رہتی تھیں کہ طاہر احمد سکول میں اسلامی علوم کے حصول اور ان پر عمل میں سب پر سبقت لے جائے۔

(حضرت) خلیفہ ثانی کی موجودگی میں تو خوش خبری سن کر (حضرت) ام طاہر اپنے جذبات پر کسی نہ کسی طرح قابو پانے میں کامیاب ہو گئیں لیکن ان کے جاتے

ہی ضبط کے سارے بند ٹوٹ گئے اور انہوں نے فرط مسرت سے پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا۔ خدا کا کرنا کیا ہوا کہ عین اس وقت ایک نوجوان لڑکی جس کا نام کلثوم بیگم تھا۔ ان سے ملاقات کے لئے آن پہنچی۔ کلثوم بیگم حضرت ام طاہر کا اپنی والدہ کی طرح احترام کرتی تھیں اور ان سے ملنے کے لئے اکثر آتی جاتی رہتی تھیں۔ کلثوم بیگم کو یہ تو فوراً ہی اندازہ ہو گیا کہ (حضرت) ام طاہر کسی رنج یا غم کی وجہ سے نہیں رو رہی تھیں بلکہ یہ آنسو خوشی اور شدت جذبات کے آنسو تھے' پہلے تو حضرت ام طاہر اپنے آنسوؤں کا سبب چھپانے کی کوشش کرتی رہیں پھر فرط مسرت سے بے بس ہو گئیں۔ کلثوم بیگم سے پہلے رازداری کا حلف لیا پھر انہیں (حضرت) خلیفہ ثانی کے الہام کی تفصیل بتائی اور وعدہ لیا کہ جب تک یہ الہام پورا نہ ہو جائے کسی سے اس کا ذکر نہیں کریں گی۔

کلثوم بیگم نے اپنے وعدے کو پورا کیا۔ ان کی ایک احمدی مشنری سے شادی ہو گئی اور آنے والے پچاس سالوں میں انہیں بارہا صاحبزادہ مرزا طاہر احمد سے ملاقات کا موقع ملتا رہا لیکن کلثوم بیگم کے ہونٹوں پر مسلسل مہر سکوت لگی رہی۔ اگرچہ کلثوم بیگم دوسرے بھائیوں کے مقابلے پر صاحبزادہ مرزا طاہر احمد سے انتہائی امتیازی ادب و احترام سے پیش آتی تھیں لیکن صاحبزادہ صاحب کو کبھی شک تک نہیں گزرا کہ اس امتیازی سلوک کا اصل سبب کیا تھا۔

خلافت رابعہ کے انتخاب کے بعد (حضرت) خلیفہ رابع سے ملاقات کے لئے جب کلثوم بیگم حاضر ہوئیں تو انہوں نے اس راز سے پردہ اٹھایا اور اس الہام کی تفصیل بتائی جو (حضرت) خلیفہ ثانیؓ نے (حضرت) ام طاہر کو بتایا تھا۔

☆ ☆ ☆

16

عائلی زندگی

آپ خلیفہ منتخب ہوئے تو اس وقت آپ کی بڑی صاحبزادی شوکت جہاں کی عمر یہی کوئی بائیس برس کے لگ بھگ ہوگی۔ میں نے عرض کی کہ اپنے ابا جان کی گھریلو زندگی پر کچھ روشنی ڈالئے۔ تو انہوں نے بڑی حسرت سے بار بار کہا کہ اب تو ابا جان سے ملاقات ہی نہیں ہوتی۔ ہم تو اُن کی صورت کو ترس گئے ہیں۔ اکثر گھر سے باہر رہتے ہیں۔ کھانے کا وقفہ بھی بہت مختصر ہو کر رہ گیا ہے اور پہلے کی طرح ان کے ساتھ باہر جانے کا موقع بھی کم ہی ملتا ہے۔ یہ تو ہے لیکن ان کے علاوہ گھر کے ماحول میں کوئی خاص تبدیلی نہیں ہوئی۔

کیا بحیثیت باپ آپ سخت گیر تو نہیں تھے؟

"ہرگز نہیں۔ آپ تو نہایت پیارے اور مزیدار قسم کے ابا جان ہیں۔ بیکار بیٹھنا تو آپ کو آتا ہی نہیں۔ کچھ نہ کچھ کرتے ضرور رہتے تھے۔ وہ دن بھی کتنے اچھے دن تھے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے۔ میں ان دنوں پندرہ سال کی تھی۔ ابا جان اور

میں ایک کھلی لینڈ روور میں سفر پر روانہ ہوئے۔ راستہ سخت ناہموار اور گردو غبار سے اٹا ہوا تھا۔ سڑک کیا تھی گڑھوں کا ایک لمبا سلسلہ تھا۔ قدم قدم پر ہماری گاڑی اچھلتی اور جب زمین پر واپس آتی تو ہم خوشی سے واہ واہ کا شور مچاتے۔ منزل مقصود پر پہنچے تو گردو غبار کی وجہ سے ہماری پہچان مشکل ہو رہی تھی۔ آنکھوں اور منہ پر گرد کی وجہ سے حلقے پڑے ہوئے تھے اور ایک دوسرے کو دیکھ کر مارے ہنسی کے ہمارا برا حال ہو رہا تھا۔ تالاب میں بھی ہم مزے لے لے کر نہاتے اور جب اباجان سائیکل پر زرعی فارم سے دودھ لینے جاتے تو میں بھی آپ کے ہمراہ جاتی۔ ہم ٹینس بھی اکٹھے کھیلتے۔ تیر اندازی اور ٹریمپولین (TRAMPOLINE) پر اچھل کود بھی ہمیں آپ ہی نے سکھائی اور جب رات کے سائے گہرے ہونے لگتے تو سارا گھر باغ میں جمع ہو جاتا۔ کیلے کے پودوں سے کیلے اتارے جاتے اور مزے لے لے کر کھائے جاتے۔

بچپن کی بڑی ہی پُر لطف یادیں ہیں۔ کس کس کا ذکر کروں ایک دوسرے سے چھیڑ چھاڑ بھی چلتی۔ ہم بہنیں ابھی بہت ہی کم عمر تھیں کہ ایک دن اباجان دفتر سے واپس آئے اور کہنے لگے آؤ تمہیں جادو کا کرتب دکھائیں۔ بتاؤ کون سی مٹھائی کھانے کو تمہارا جی چاہتا ہے اور یہ مٹھائی تمہیں کس جگہ پر رکھی ملے۔ میں نے فوراً جواب دیا۔ کہ میرا دل تو پیلے رنگ کی ایک مٹھائی کھانے کو چاہ رہا ہے اور اگر وہ مجھے ایک خاص الماری میں پڑی ہوئی مل جائے تو کتنا مزہ آئے۔ میری چھوٹی بہن فائزہ بولی مجھے تو مٹھائی چاہئے جس میں شکر ہی شکر اور کریم ہی کریم ہو۔ اور یہ مٹھائی مجھے ڈائننگ روم کی الماری کے تیسرے خانے میں رکھی ہوئی ملنی چاہئے۔ اباجان نے ہوا میں بازو لہرا کر کہا۔ ٹھیک بالکل ٹھیک۔ تمہاری من کی مرادیں پوری ہو گئیں۔ جاؤ اور اپنی اپنی مقررہ جگہ پر سے مٹھائی اٹھالو۔ یہ سنتے ہی ہم

دونوں بہنیں تیر کی طرح سیدھی اپنی اپنی مقررہ جگہ کی طرف لپکیں۔ کیا دیکھتی ہیں کہ ہماری دل پسند مٹھائیاں ہماری بتائی ہوئی جگھوں پر پڑی ہیں۔ بس پھر کیا تھا ہم نے شور مچادیا اور اپنی سہیلیوں کو بڑے فخر سے بتایا کہ ہمارے ابا جان کو جادو آتا ہے۔ بڑی ہوئیں تو ہم نے ابا جان سے پوچھا کہ آپ نے یہ کارنامہ کیسے سرانجام دیا تھا؟

وہ مسکرائے اور فرمانے لگے یہ تو سیدھی سی بات تھی مجھے یہ تو پتہ تھا کہ تمہیں کون کون سی مٹھائی پسند ہے اور میں یہ بھی جانتا تھا کہ تم اپنی قیمتی اشیاء کہاں کہاں رکھتی ہو۔ بس میں نے تمھاری پسندیدہ مٹھائیاں وہیں رکھ دیں اور اشاروں کنایوں سے تمہیں آمادہ کرلیا کہ تم ان ہی جگھوں کا نام لو جہاں میں نے مٹھائیاں رکھی تھیں۔

اگر ہم کبھی ابا جان کو ہنسی مذاق میں چھیڑتیں تو بڑے خوش ہوتے۔ ایک دفعہ یوں ہوا کہ میری بہن فائزہ نے سوائے ایک ٹافی کے ڈبے کی ساری ٹافیاں کھالیں اور ان کی جگہ بالکل انہیں کی طرح کنکر لپیٹ کر انہیں اس صحیح سلامت اکلوتی ٹافی کے ہمراہ ڈبے میں رکھ کر ڈبہ ابا جان کی میز پر سجایا۔ اور لگے ہاتھوں بڑا سا سوالیہ نشان بھی ڈبے پر لگادیا۔ پھر اس راز کو ایک ایک کر کے سب سہیلیوں تک پہنچادیا۔ اور خود بڑی بے تابی سے انتظار کرنے لگیں کہ دیکھئے اب ابا جان کیا کرتے ہیں۔

تھوڑی دیر بعد کیا دیکھتی ہیں کہ ڈبہ اپنی اصل جگہ پر واپس رکھ دیا گیا ہے۔ لیکن اب کی بار اس کے ساتھ ایک پرچہ بھی منسلک تھا جس پر یہ الفاظ لکھے ہوئے تھے۔

"میں نے اپنے حصہ کی ایک ٹافی کھالی ہے۔ باقی ٹافیاں آپ کھالیں"

غور سے دیکھا تو وہ اکلوتی ٹافی غائب تھی۔

اباجان کے ہاتھوں فائزہ کی اس شکست فاش پر اس کی سہیلیوں کی تو باچھیں کھل گئیں اور انہوں نے اسے خوب خوب آڑے ہاتھوں لیا۔

لمبے سفروں میں تو اکثر یوں ہوتا کہ اباجان گاڑی روک لیتے اور ہماری تھکن اور اکتاہٹ دور کرنے کے لئے خوش الحانی سے کوئی نظم پڑھنی شروع کر دیتے۔ ایک ایک کر کے ہم بھی شامل ہو جاتے اور ہم سب مل کر نظم پڑھتے۔ ہماری سب سے چھوٹی بہن طوبیٰ نے اباجان کی ایک نظم زبانی یاد کر لی اور اسے ترنم سے سنایا تو اباجان بے حد خوش ہوئے۔

چھٹیاں ہوتیں تو آپ مزے مزے کے پروگرام بناتے اور گھر کے ہر چھوٹے بڑے کو اس میں شامل کرتے۔ ایک بار یوں ہوا کہ ہمیں ایک اور خاندان کے ہمراہ چھٹیاں گذارنے کا اتفاق ہوا۔ بدقسمتی سے ان کا چھٹیاں گذارنے کا فلسفہ ہم لوگوں سے ذرا ہٹ کر تھا۔ بس یہی کہ رات گئے تک جاگتے رہو اور پھر سارا دن لمبی تان کر سو رہو۔

ظاہر ہے اباجان اس نکمے پن کو کیسے پسند کر سکتے تھے۔ بے کار تو آپ بیٹھ ہی نہیں سکتے تھے۔ چنانچہ آپ نے اپنے طور پر سیر و تفریح کا ایک دلچسپ پروگرام تشکیل دے لیا۔ اس میں لمبی سیر۔ قابل ذکر مقامات کی زیارت۔ پک نک۔ کھلی ہوا میں گوشت بھوننے کے مقابلے۔ ٹینس اور دیگر مختلف قسم کے کھیل۔ سبھی کچھ تھا ہماری دیکھا دیکھی ہمارے ساتھی خاندان کے لوگ بھی جلد ہی اس پروگرام میں شامل ہو گئے۔"

صاحبزادی شوکت جہاں بیگم نے مزید فرمایا:

"اگرچہ ابھی ہم بہت چھوٹی تھیں لیکن اباجان کے ساتھ ہم نے امریکہ اور

کینیڈا کا جو طوفانی دورہ کیا تھا اسے ہم کبھی نہیں بھلا سکتیں۔ یوں لگتا ہے جیسے کل کی بات ہو۔ اس سفر کے دوران ایک سے ایک بڑھ کر دلچسپ تجربات ہوئے کینیڈا کے ایک ریستوران میں کھانے کا آرڈر دینے سے پہلے میری بہن فائزہ سے پوچھا گیا کہ کیا آپ سٹیک اور چپس پسند کریں گی؟ تو وہ گھبرا گئی۔ اور بولی۔ کیا کہا سنیک (یعنی سانپ؟) نہیں میں تو ہرگز ہرگز سانپ نہیں کھاؤں گی۔ ابا جان کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ گھر میں اس لطیفے کا مدتوں چرچا رہا۔ اس سفر میں پہلی رات ہم نے کار ہی میں بسر کی جو ہم نے کرائے پر لے رکھی تھی۔ ہوا یوں کہ جس خیمے کو ہم نے اتنی امنگوں سے خریدا تھا اس نے کھڑا ہونے سے انکار کر دیا۔ ہم نے بہت کوشش کی لیکن بے سود۔ خیمہ تھا کہ کھڑا ہونے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔ دراصل خیمہ خریدتے وقت ابا جان اس غریب کے کچھ جوڑ پیچ خریدنا بھول گئے تھے۔ ادھر بارش تھی کہ تھمنے میں نہیں آتی تھی۔ ہم سب تھک کر چور ہو چکے تھے لیکن نیند بھی کیا ظالم شے ہے۔ بالآخر ہم سب پر غالب آگئی اور ہم اپلوں کے ڈھیر کی طرح ایک دوسرے کے ساتھ ٹیک لگا کر میٹھی نیند کے مزے لینے لگے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ نیند کا دورانیہ طویل ثابت نہ ہوا اور ہم نے صبح خیزی کے تمام ریکارڈ مات کر دیے۔

اس سفر میں کھانے پکانے کا فریضہ ابا جان ہی نے انجام دیا۔ اگرچہ ہم سب موقع بے موقع لیکن بالالتزام دخل در "ماکولات" کی پوری کوشش بھی کرتے رہے۔ نتیجہ صاف ظاہر ہے۔ جب ہم اگلے دن کہیں رکتے تو انکشاف ہوتا کہ کتنی ہی چیزیں ہیں جو ہم سینکڑوں میل دور اپنے سابقہ کیمپ میں ہی چھوڑ آئے ہیں۔ لیکن ابا جان تھے کہ نہ تو کبھی پریشان ہوئے نہ کبھی ہمیں سرزنش کی۔

جب ہم کبھی کھانا پکاتے تو بہت حوصلہ افزائی فرماتے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ گھر میں مَیں نے بزعم خود کھانا پکانے کا ایک عظیم کارنامہ سرانجام دیا۔ لیکن

سوائے اباجان کے سب نے کھانا چکھ کر چھوڑ دیا۔ لیکن اباجان تھے کہ کھانے کی تعریف کرتے نہیں تھکتے تھے اور بار بار فرماتے واہ کتنا لذیذ کھانا ہے۔"

اللہ تعالیٰ نے آپ کو نہایت لطیف مزاح کی حس سے نوازا ہے۔

صاحبزادی سیدہ شوکت جہاں فرماتی ہیں:

"خاندان کے بعض معمر بزرگوں سے بھی آپ کی چھیڑ چھاڑ جاری رہتی تھی۔ ٹھیک ہے یہ بزرگ سن رسیدہ لوگ تھے اور ان کا ادب اور احترام ہم پر واجب تھا اور ہم ان کا پورا ادب اور احترام کرتے تھے لیکن بزرگ اور سن رسیدہ ہونے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ زندگی پھیکی اور بے کیف ہو کر رہ جائے۔ اچھا مذاق بہرحال اچھا اور پسندیدہ ہوا کرتا ہے۔ بڑے بوڑھوں کا بھی حق ہے کہ وہ بے ضرر اور معصوم قسم کے مذاق سے لطف اندوز ہوں۔

مجھے خوب اچھی طرح یاد ہے کہ اباجان ایک مرتبہ گھنی اور لمبی قسم کی دو مصنوعی داڑھیاں اور ساتھ داڑھیاں چپکانے کا مسالہ بھی لائے ان میں سے ایک داڑھی سفید تھی اور ایک سیاہ۔ اباجان نے ایک داڑھی امی جان کو لگا دی اور دوسری ہماری بوڑھی انا کو۔ اور چہروں کو یوں رنگ دیا کہ پہچان ناممکن ہو گئی۔ دونوں کو سفید چادریں اوڑھا دیں اور ہاتھوں میں لمبے لمبے عصائے پیری تھما دئے پھر یہ دونوں ریشائیل بزرگ اپنے عجیب و غریب سفر پر روانہ ہو گئے اور اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں کے دروازوں پر باری باری

دستک دینا شروع کی۔ اباجان اور میں ہم دونوں ان کے ساتھ ساتھ لیکن چھپ کر سائے کی طرح ان کا پیچھا کرتے رہے۔ سب سے پہلے (حضرت) خلیفہ ثالث کی بڑی اور سن رسیدہ بہن کے دروازے کو جا کھٹکھٹایا۔ انہوں نے خود دروازہ کھولا۔ لیکن جب دیکھا کہ دو عجیب الخلقت پیران تسمہ پا ایک جناتی زبان میں ان سے مخاطب ہیں تو جھٹ سے کواڑ بند کر دیئے۔ مارے ہنسی کے ہمارا برا حال ہو رہا تھا۔ ایک طرح کی "قیامت صغریٰ" برپا کرنے کے بعد یہ دونوں بوڑھے اگلے مکان پر جا دھمکے۔ اباجان اور میں بدستور دبے پاؤں ان کے پیچھے پیچھے چلتے رہے۔ اگلے مکان پر دستک دی گئی۔ اب کی بار پہلے سے بھی بڑھ کر دھماکہ خیز ردعمل ہوا۔ پھر کیا تھا ایک دروازے سے دوسرا اور دوسرے سے تیسرا دروازہ۔ ہوتے ہوتے ان کا پیدا کردہ شور و غوغا بھی نئی سے نئی بلندیوں کو چھونے لگا۔ اور ان کی حرکات و سکنات بھی نئے سے نئے زاویوں سے روشناس ہوتی چلی گئیں اور ان میں نکھار آتا چلا گیا۔ عملی مذاق کا یہ سلسلہ رات گئے تک چلتا رہا یہاں تک کہ ہم سیر ہو گئے۔ اب ہم تھک چکے تھے اور ہمارے چھپنے کی چنداں ضرورت بھی نہیں تھی چنانچہ ہم سب مل کر اباجان اور میں دونوں ان نام نہاد "بوڑھوں" کے ہمراہ دوبارہ گھر گھر گئے لیکن ہمارے خاندان کے لوگوں کو یقین ہی نہیں آتا تھا کہ یہ حقیقت نہیں تھی بلکہ ایک عملی مذاق تھا۔"

(حضرت) خلیفہ رابع کی چھوٹی بیٹی (صاحبزادی سیدہ) فائزہ کہتی ہیں:

"مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب ابا جان نے مجھے تیرنا سکھایا آپ مجھے کاندھوں پر بٹھا کر تالاب میں کھڑے ہو جاتے اور آہستہ سے مجھے پانی میں اتار دیتے۔ مارے خوف کے میرا برا حال ہو جاتا اور میری چیخیں نکل جاتیں۔ رفتہ رفتہ میرا ڈر جاتا رہا اور میں پانی سے روشناس ہو گئی اور جلد ہی مجھے تیرنا بھی آگیا۔ دراصل میرا ڈر اور چیخ پکار ایک طرح کا طبعی ردعمل تھا۔ ورنہ ذہن کے نہاں خانوں میں مجھے پختہ یقین تھا کہ ابا جان مجھے ڈوبنے نہیں دیں گے۔

البتہ ایک مرتبہ میں ڈوبتے ڈوبتے بچی۔ ہوا یوں کہ میں اور میری بہنیں دریا میں تیر رہی تھیں۔ ابا جان ایک کشتی میں ہمارے ساتھ ساتھ چل رہے تھے مبادا ہم میں سے کسی کو حادثہ پیش آجائے۔ ابا جان نے ہمیں تاکید کی تھی کہ ہم کشتی کے پیچھے پیچھے تیرتی رہیں لیکن میں نہ جانے کس طرح تیرتی ہوئی کشتی کے سامنے جا نکلی۔ کشتی ذرا آگے بڑھی تو میرے سر سے جا ٹکرائی اور میں چوٹ سے نڈھال ہو کر پانی میں ڈوب گئی اور کشتی میرے اوپر سے گذر گئی ابا جان نے جھٹکے کو محسوس تو کیا لیکن انہیں یہی خیال گذرا کہ کشتی لکڑی کے کسی بہتے ہوئے ٹکڑے سے جا ٹکرائی ہے۔ پھر اچانک کیا دیکھتے ہیں کہ میں نظروں سے غائب ہو چکی ہوں لیکن آپ نے جلدی ہی مجھے پانی میں بہتے ہوئے دیکھ لیا اور فوراً کھینچ کر مجھے کشتی

میں ڈال لیا۔ ابا جان کا چہرہ اس وقت دیکھنے والا تھا۔ ایسے اضطراب اور بے چینی کے آثار میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے۔ آج بھی ابا جان کا فکر مند چہرہ میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ میں یہ نظارہ کبھی نہیں بھول سکتی۔ اگرچہ بعد میں ابا جان نے اس واقعے کا مذاق بنا لیا اور آج تک مجھے یہ کہہ کر چھیڑتے ہیں کہ میں مچھلی بن کر کشتی کے نیچے تیرنے کی کوشش کر رہی تھی۔"

انتخاب کے بعد جب آپ خلافت کے منصب پر متمکن ہوئے تو باپ اور بیٹیوں کے انتہائی قرب کے اس تعلق میں ایک لطیف قسم کی تبدیلی آگئی۔ آپ کی ایک صاحبزادی نے بتایا کہ میں اپنی سہیلیوں سے کہا کرتی تھی کہ میرے ابا جان میرے بہترین دوست ہیں۔ ٹھیک ہے میرے بہترین دوست تو وہ اب بھی ہیں۔ لیکن اب صورت حال وہ نہیں رہی۔ اب تو لاکھوں لوگ اس قرب کے تعلق میں میرے ساتھ شریک ہیں۔

آپ کی صاحبزادیوں کا کہنا ہے کہ ابا جان سے ہم اب بھی پہلی سی بے تکلفی سے بات چیت کر سکتی ہیں۔ لیکن بایں ہمہ اب درمیان میں ایک ناقابل بیان قسم کا ہلکا سا حجاب ضرور حائل ہو گیا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم ان کا پہلے سے بڑھ کر احترام کرنے لگی ہیں۔ نہیں ایسا نہیں، ادب اور احترام تو ہم ان کا پہلے بھی بے حد کرتی تھیں لیکن اب وہ ہمارے ابا جان ہی نہیں خلیفہ وقت بھی ہیں۔ امر واقعہ یہ ہے کہ اب دو محبتیں اکٹھی ہو گئی ہیں۔ ابا جان سے محبت اور خلیفہ وقت سے محبت۔

صاحبزادی سیدہ شوکت جہاں کہتی ہیں کہ ابا جان کے منصب خلافت پر فائز

ہونے سے پہلے میں امی جان کی نسبت اباجان سے زیادہ بے تکلف تھی۔ لیکن اب میں پہلی سی بے تکلفی سے اباجان سے بات چیت نہیں کر سکتی۔ غالباً اب میں امی جان سے نسبتاً زیادہ بے تکلفی سے گفتگو کر سکتی ہوں۔ لیکن ہمارے دلوں میں قرب کے سرور اور رفاقت کی لذت میں کبھی کوئی کمی نہیں آنے پائی۔ آپ تو مجسم محبت اور شفقت ہیں۔ آپ کی موجودگی میں فکر و تردد اور غم واندوہ کی بجائے مکمل تحفظ اور اعتماد کا احساس برقرار رہتا ہے۔

اگرچہ کھانے کے دوران جو وقت ہمیں پہلے میسر ہوا کرتا تھا۔ اب اس کا دورانیہ گھٹ کر کم ہو گیا ہے لیکن ہمارے گھر کی باہمی محبت بھری فضا کسی طرح بھی متاثر نہیں ہوئی۔ دسترخوان پر اب بھی پہلے کی طرح خوب گرما گرم بحث مباحثہ ہوتا ہے۔

آپ کی صاحبزادی فرماتی ہیں:

"میں جب بھی اباجان کے متعلق سوچتی ہوں تو حیران رہ جاتی ہوں اللہ (تعالیٰ) نے اباجان کو کتنی ذہانت اور کس قدر شائستہ اور لطیف حس مزاح سے نوازا ہے۔ اور کیسی شگفتہ اور باغ و بہار قسم کی طبیعت عطا کی ہے۔ آپ کی موجودگی میں آپ کو مسکراتے ہوئے چہرے ہی نظر آئیں گے۔ پاکیزہ قسم کی مزاح تو آپ کی فطرت ثانیہ ہے۔"

آپ کی دوسری صاحبزادی کہتی ہیں:۔

"آپ مذاق کرتے وقت بھی کبھی مبالغہ آرائی اور غلط بیانی سے کام نہیں لیتے اور مذاق مذاق میں بھی سچ کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ آپ کچھ بھی کہیں کوئی بات بھی

کیوں نہ ہو آپ ہمیشہ سچ بولتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم آپ
سے پورے اعتماد سے بات کرسکتے ہیں۔
آپ بہت کم کھاتے ہیں۔ شروع ہی سے آپ کو چاق
وچوبند رہنے کا شوق رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کھیلوں میں
باقاعدگی سے حصہ لیتے رہے ہیں۔ آپ کا طریق یہ ہے کہ سیر
ہونے سے پہلے ہی کھانے سے ہاتھ کھینچ لیتے ہیں۔ خواہ آپ
کا پسندیدہ کھانا ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن اب یہ حال ہے کہ جس
قسم کے تفکرات اور احساس ذمہ داری کے دباؤ کے تحت
آپ کو کام کرنا پڑتا ہے کبھی کبھار اس کا ہلکا سا اظہار کھانے کی
میز پر بھی ہو جاتا ہے۔ آپ کھانے کو ہاتھ لگا کر چھوڑ دیتے
ہیں۔ اور گفتگو میں بھی کوئی حصہ نہیں لیتے۔"

ان کی ایک صاحبزادی فرماتی ہیں:

"ہمیں بھی خوب تجربہ ہو گیا ہے۔ اب ہم لوگ بھی اندازہ
کر لیتے ہیں اور ایسے موقعوں پر ابا جان کو بے مقصد باتوں
سے دق نہیں کرتے۔ بعد میں عموماً جلد ہی پتہ چل جاتا ہے کہ
ابا جان اس قدر خاموش کیوں تھے۔ یا تو جماعت کو کوئی ابتلا
درپیش تھا یا کسی ابتلا کا اندیشہ تھا۔ کبھی کبھی تو یوں بھی ہوتا ہے
کہ آپ کھانے کی میز پر تشریف فرما تو ہوتے ہیں لیکن کھانے
کو ہاتھ تک نہیں لگاتے۔ یہ کہہ کر پلیٹ کو پرے دھکیل
دیتے ہیں کہ بھوک نہیں ہے اور اپنے پسندیدہ کھانوں سے
بھی یوں منہ موڑ لیتے ہیں جیسے ان سے کراہت ہو گئی ہو۔

لیکن جب گومگو کی کیفیت ختم ہو جائے اور بحران کھل کر سامنے آجائے تو بھوک پھر عود کر آتی ہے اور آپ کھانے سے پورا پورا انصاف کرنے لگتے ہیں۔"

جب اس سلسلے میں آپ سے سوال کیا گیا تو آپ نے جواباً فرمایا:

"ٹھیک ہے کبھی کبھی ایسا ضرور ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ جب مجھے کسی لمبے دورے پر جانا ہو تو کھانے کو جی نہیں چاہتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ میری تمام تر توجہ سفر سے متعلق ضروری امور کی طرف مبذول ہو جاتی ہے۔ لیکن جب سفر شروع ہو جائے تو بھوک واپس آجاتی ہے۔ ہوائی جہازوں میں پیش کیا جانے والا کھانا اگرچہ مجھے پسند نہیں لیکن جہاز پر سوار ہونے کے کچھ عرصے بعد میں اسی کھانے کو گھر میں پکے ہوئے کھانے کی طرح بڑی رغبت سے کھانے لگتا ہوں۔ یہ کیفیت مجھ پر جہاز میں سوار ہونے کے بعد زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ دو گھنٹے تک طاری رہتی ہے۔ پھر طبیعت سنبھل جاتی ہے"۔

کچھ بھی ہو آپ میں ایک تبدیلی تو بالکل ہی نہیں آنے پائی۔ نماز آپ بہر حال نہایت التزام سے وقت پر ادا کرنے کے عادی ہیں۔ صبح صبح پہلے آپ بچیوں کو نماز فجر کے لئے جگاتے ہیں۔ پھر اس کے بعد کسی اور کام کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ دلچسپ پہلو اس بات کا یہ ہے کہ آپ بچیوں کو جگا کر ان پر مکمل اعتماد کا اظہار کرتے ہوئے پھر واپس یہ دیکھنے نہیں آتے کہ وہ بیدار ہوئیں یا نہیں۔ ایک بار جگانے کو ہی کافی سمجھتے ہیں۔

آپ کی ایک صاحبزادی بیان کرتی ہیں:-

"مجھے یاد ہے مجھے بہت نیند آ رہی تھی۔ اباجان نے مجھے نماز کے لئے جگایا لیکن مجھے اونگھ آگئی۔ اباجان نے مجھے کہا تو کچھ بھی نہیں لیکن میں دل ہی دل میں شرمندہ ہو رہی تھی۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں نے ان کے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی ہو۔ آپ نے مجھے کچھ بھی تو نہیں کہا۔ لیکن بخوبی جانتی تھی کہ نماز میں میری سستی کی وجہ سے انہیں سخت صدمہ ہوا ہے۔ چنانچہ میں نے تہیہ کر لیا کہ آئندہ کبھی ایسی سستی نہیں کروں گی۔

ایک دفعہ بہت سی لڑکیوں نے اباجان کی خدمت میں لکھا کہ ان کی امتحان میں کامیابی کے لئے دعا کریں۔ آپ کی سب سے چھوٹی صاحبزادی نے بھی دعا کی درخواست کی۔ اس پر اگلے دن اپ نے بہت اظہار خوشنودی فرمایا۔ کہنے لگے کہ میں تمہاری اور تمہاری سہیلیوں کی کامیابی کے لئے ضرور دعا کروں گا۔ ہر قدم پر ہمیں اللہ تعالیٰ کے حضور دست بدعا ہی رہنا چاہئے۔"

منصب خلافت پر فائز ہونے کے بعد سائیکل سواری کا سلسلہ تو ختم ہو کر رہ گیا البتہ اب آپ کبھی کبھار اختتام ہفتہ پر اپنی صاحبزادیوں کے ہمراہ اپنے زرعی فارم پر تشریف لے جاتے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں :

"مجھے سائیکل سواری کا بہت شوق ہے۔ یہ بڑی ہی پُرسکون سواری ہے۔ ایک خوبی اس میں یہ بھی ہے کہ سائیکل چلاتے وقت آپ کسی انتہائی سنجیدہ قسم کے غور و فکر کا خطرہ

مول نہیں لے سکتے۔ورنہ عین ممکن ہے کہ اِدھر آپ کی توجہ ہٹی اور اُدھر آپ بمع سائیکل کسی گڑھے میں جاگریں۔"

البتہ آج کل آپ قصر خلافت کے وسیع و عریض باغ میں گھنٹہ بھر کے لئے چہل قدمی کرتے ہیں۔ واپسی پر ناشتہ کرتے ہیں جو آپ خود ہی تیار کرتے ہیں۔ آپ کا ناشتہ عموماً چائے اور پراٹھے پر مشتمل ہوتا ہے۔ چائے آپ خوب اہتمام سے بناتے ہیں صرف ایک پیالی پیتے ہیں لیکن چائے خوب تیز پسند کرتے ہیں۔ ٹی بیگ یا تھیلی میں بند چائے سے قطعاً رغبت نہیں ہے۔ فرمایا کرتے ہیں۔ ایسی چائے بہت بدمزہ ہو جاتی ہے۔ اس سے بہتر طریق تو یہ ہو گا کہ پیالی میں پتی ڈال کر اوپر سے گرم پانی انڈیل لیں۔

یورپین ممالک کے دوروں میں کافی سے کچھ رغبت پیدا ہو گئی۔ لیکن INSTANT کافی سے نہیں۔ کینیا اور جنوبی امریکہ کی کافی آپ کو پسند ہے۔ کافی کے بیجوں کو خود ہی پیستے اور ابالتے ہیں۔ لیکن چائے کی طرح کافی کی بھی صرف ایک پیالی پیتے ہیں۔ کھانے کے اوقات پہلے ہی بہت محدود اور مختصر ہوا کرتے تھے۔ سوائے اس کے کہ کوئی تقریب ہو یا کوئی مہمان تشریف لائے ہوں۔ لیکن منصب خلافت پر فائز ہونے کے بعد دوپہر کے کھانے کا وقت دس پندرہ منٹ اور رات کے کھانے کا وقت تیس منٹ تک محدود ہو کر رہ گیا۔ آپ فرماتے ہیں:۔

"بیوی بچوں کے ساتھ بیٹھ کر میں دلی راحت اور اطمینان محسوس کرتا ہوں۔ روز مرہ کی عام سی معمول کی باتیں ہوتی ہیں۔ خاندان اور رشتہ داروں کی خیریت اور ان کی تازہ ترین دلچسپیوں اور معمولات کا ذکر ہوتا ہے۔ مختلف موضوعات پر ہلکے پھلکے رنگ میں تبصرہ ہوتا ہے۔

لیکن میرے لئے سب سے پُر سکون وہ چند ایک لمحات ہوتے ہیں جو سونے سے پہلے میسر آتے ہیں۔ اس وقت کسی قسم کا دباؤ نہیں ہوتا۔ نہ ہی کوئی فیصلہ کن مرحلہ درپیش ہوتا ہے۔ ذہن میں ملے جلے سے کئی قسم کے خیالات آتے چلے جاتے ہیں اور چپ چاپ چشم تصور کے سامنے سے گذرتے چلے جاتے ہیں۔

چھوٹے چھوٹے بچوں سے مل کر بھی مجھے دلی سکون اور راحت حاصل ہوتی ہے۔ ان سے باتیں کر کے ان کی باتیں سن کر اور ان کی محبت اور معصومیت سے لبریز گفتگو سے دل پیار اور اطمینان سے بھر جاتا ہے۔ اور پھر پھولوں سے بھی مجھے بے حد محبت ہے۔ جی چاہتا ہے کہ میرے چاروں طرف پھول ہی پھول ہوں"۔

آپ کی زندگی تو پہلے بھی کھلی کتاب کی طرح تھی لیکن خلیفہ منتخب ہوئے تو لوگوں نے آپ کی زندگی، آپ کے خیالات اور آپ کی پسند ناپسند میں شدید دلچسپی لینی شروع کر دی۔

فرماتے ہیں:

"میں خوب سمجھتا ہوں کہ ایسا کیوں ہے۔ میری کوشش تو یہی ہوتی ہے کہ میں اپنے جذبات اور ذاتی معاملات کا ذکر نہ کروں۔ لیکن بعض دفعہ لوگ ایسے چبھتے ہوئے انتہائی نجی قسم کے سوال بھی کرتے ہیں جن کی وجہ سے مجھے اپنی زندگی کے ان گوشوں اور پہلوؤں سے بھی پردہ اٹھانا پڑتا ہے۔ جن

کاذکر کرنامیں عام طور پر پسند نہیں کرتا۔

اور حق تو یہ ہے کہ کبھی کبھی جوش دلانے کے لئے ایسا کرنا بھی پڑتا ہے۔ بسااوقات تو یہ موضوعات شدید قسم کی جذباتی کیفیت کے حامل ہوتے ہیں اور میں ایک قسم کے تذبذب میں پھنس جاتا ہوں یعنی گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل۔

لیکن زندگی کے کچھ رخ ایسے بھی ہیں جن سے سمجھوتا کرنا میرے بس کا روگ نہیں ہے۔ مثلاً میں کسی کی ایسی جھوٹ موٹ تعریف نہیں کرسکتا۔ جو تعریف کا مستحق نہ ہو اور پھر اسلام یہ حکم بھی تو دیتا ہے کہ کسی کے ذاتی نقائص کی تشہیر نہ کی جائے۔ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) نے ان لوگوں کے متعلق بڑی ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا ہے جو جھوٹے انکسار اور تقدس کی دوکان چمکانے کے لئے اپنی خامیوں کاذکر کرلیا کرتے تھے۔ آپ نے فرمایا ہے کہ یہ نیکی کی بجائے ایک لعنتی طرز عمل ہے۔

یہ بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت کانشان ہے کہ اس نے اپنے فضل اور ستاری سے آپ کی پردہ پوشی کی ہوئی ہے اور اس کے باوجود اگر آپ اپنی خامیوں کا سرعام چرچا کرتے پھرتے ہیں تو اسے نیکی نہیں کہہ سکتے"۔

(نوٹ یہ ان دنوں کی بات ہے جب آپ پاکستان میں مقیم تھے۔)

☆ ☆ ☆

17

سپیدہ صبح

جاننے والے جانتے ہیں کہ انتخاب سے پہلے بھی (حضرت) خلیفہ رابع میں کام کرنے کی کتنی بے پناہ صلاحیت موجود تھی اور مسند خلافت پر متمکن ہونے کے بعد تو یہ صلاحیت اور بھی کھل کر سامنے آگئی۔ آپ کا روزانہ کا معمول (قیام لندن کے دوران بھی آپ کا یہی معمول ہے۔ مترجم) یہ ہے کہ آپ علی الصبح نور کے تڑکے فجر کی باجماعت نماز کے لئے مسجد مبارک پہنچ جاتے ہیں۔ نماز کے بعد منہ اندھیرے ملحقہ باغ میں چہل قدمی کے لئے تشریف لے جاتے ہیں۔ اس کے بعد ناشتہ کرتے ہیں جس کے فوراً بعد دفتر تشریف لے آتے ہیں جہاں اس وقت صرف اور صرف آپ ہوتے ہیں یا رات کا پہرہ دار۔

جماعت کے مرکزی دفاتر کا عملہ ایک ہزار افراد پر مشتمل ہے۔ ان میں سے ایک سو افراد (حضرت) خلیفہ رابع کے اپنے دفتر سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ لوگ صبح ساڑھے نو بجے تک پہنچ جاتے ہیں۔ آتے ہی آمدہ خطوط کو کھول کر انہیں

ترتیب دیتے ہیں اور ان پر نمبر لگانا شروع کر دیتے ہیں۔ دنیا کے کونے کونے سے تقریباً ایک ہزار خطوط روزانہ موصول ہوتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ شاذ کے طور پر ایک بار ایسا بھی ہوا کہ صرف تین سو خط آئے۔ یہ کم سے کم خطوں کی ریکارڈ تعداد ہے۔

آج کی ڈاک میں سرفہرست وہ جماعتی رپورٹیں ہیں جو امراء، مبلغین، مختلف کمیٹیوں اور تنظیموں کی طرف سے آئی ہیں۔ ان میں بعض اہم امور کا تفصیل سے جائزہ لیا گیا ہے۔ مثلاً کسی علاقے میں کیا کیا واقعات ہوئے۔ ان کے عوامل کیا تھے۔ سیاسی پس منظر کیا تھا۔ اقتصادی صورت حال کیا تھی۔ مقامی سطح پر جماعت کن مسائل سے دوچار تھی وغیرہ۔

اس تجزیاتی مطالعے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ خلیفہ وقت آسانی سے اندازہ لگا سکیں کہ جماعتی سطح پر جو فیصلے کئے گئے ہیں یا جو نتائج اخذ کئے ہیں وہ کہاں تک درست ہیں۔ علاوہ ازیں روزانہ کی ڈاک میں سینکڑوں خطوط ذاتی نوعیت کے بھی ہوتے ہیں۔ مختلف لوگ (حضرت) خلیفہ رابع کی خدمت میں دعائے خاص کی درخواست کرتے ہیں۔ راہنمائی اور مشورے کے طالب ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ ہومیوپیتھک کے نسخے اور ادویات بھی مانگتے رہتے ہیں۔ دفتر ہر خط کے ساتھ اس کا خلاصہ درج کر دیتا ہے تاکہ (حضرت) خلیفہ رابع فوری حکم صادر فرما سکیں اور اگر چاہیں تو اصل خط کو بھی ملاحظہ فرمالیں اور پورے کوائف کی روشنی میں آسانی سے فیصلہ کر سکیں۔

(لندن آکر) (حضرت) خلیفہ رابع نے سارا ریکارڈ کمپیوٹر پر منتقل کرنے کے لئے ایک بڑی رقم کی منظوری بھی دی ہے تاکہ انتظامی مشینری کی رفتار کو تیز تر کیا جاسکے۔ اس کے علاوہ ایک اور رقم بھی منظور کی ہے تاکہ خطبات کے ریکارڈ اور

ان کے تراجم کو چوبیس گھنٹے کے اندر اندر دنیا بھر کے احمدی مشنوں تک پہنچا دیا جائے۔ ویسے آپ خود نہ تو ٹیپ ریکارڈ استعمال کرنے کے عادی ہیں اور نہ ہی سیکرٹریوں سے املا لکھوانے کے۔

اس کی بجائے آپ ہر خط پر اپنے ہاتھ سے مختصر نوٹ لکھ دیتے ہیں جس کی روشنی میں جواب تحریر کیا جاتا ہے۔ اگرچہ یہ ایک لمبا اور تھکا دینے والا طریقہ ہے لیکن آپ کے نزدیک یہی ایک درست اور مفید طریقہ ہے جو بارہا کا آزمودہ ہے۔ جس کو آپ نے مستقل طور پر اپنا لیا ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کو بے شمار افراد اور ان کے مسائل سے اتنی گہری واقفیت ہے جو پچھلے کئی سالوں پر محیط ہے اور جس کی وسعت کو دیکھ کر دیکھنے والا حیرت میں آ جاتا ہے۔

مثال کے طور پر ایک طبیب ملاقات کے لئے آئے۔ آپ نے دیکھتے ہی انہیں پہچان لیا اور مسکرا کر فرمایا۔ آپ سے تو پندرہ سال قبل فلاں سڑک پر ملاقات ہوئی تھی۔ آپ کے ایک بھائی بھی آپ کے ہمراہ تھے۔ فرط حیرت سے طبیب مذکورہ کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ ملاقات کے بعد دفتر کے عملے سے کہنے لگے۔ کیسے بتاؤں۔ یہ بات کم از کم میری سمجھ سے تو بالا ہے۔ کتنے اچنبھے کی بات ہے کہ (حضرت) خلیفہ رابع جن سے سینکڑوں لوگ روزانہ ملنے آتے ہیں ایک سرسری اور سرراہ ملاقات کے بعد جو پندرہ برس پہلے ہوئی تھی کس طرح انہیں نہ صرف میری شکل اور نام بلکہ وہ جگہ اور موقع محل بھی خوب یاد رہا جہاں میں اور میرا بھائی ان سے ملے تھے اور یہ ملاقات بھی کیا تھی صرف سرسری علیک سلیک اور وہ بھی چند لمحوں کے لئے!

دفتر کے عملے نے جواب دیا کہ ہمارا تو یہ روزمرہ کا تجربہ ہے۔ ہم تو خود حیران ہیں کہ حضور کی یادداشت اور حافظے کا راز کیا ہے؟ یہ درست ہے کہ اگر ممکن

ہوتو کبھی کبھی ملاقات کے وقت ہم لوگ اپنے علم کے مطابق ملاقاتیوں کا تعارف کروانے کی کوشش بھی کرتے ہیں لیکن حیرت تو اس بات پر ہے کہ نہ جانے ملنے والوں کو دیکھتے ہی حضور پہچان کس طرح کر لیتے ہیں اور سابقہ ملاقات کی تفصیل، خاندانی کوائف اور دیگر متعلقہ امور انہیں یاد کیسے آجاتے ہیں۔

جب (حضرت) خلیفہ رابع سے پوچھا گیا کہ اس حیرت انگیز یادداشت اور حافظے کا راز کیا ہے؟ تو انہوں نے قدرے توقف اور غور کے بعد فرمایا:

"یہ تو میں خود بھی نہیں جانتا اور نہ ہی میں نے شعوری طور پر کبھی کوشش کی ہے، نہ ہی کوئی خاص طریقہ استعمال کیا ہے جس سے چہرے نام اور واقعات ذہن میں محفوظ ہو جائیں۔ بس یہ ہوتا ہے کہ چہروں کو پہچان لیتا ہوں اور نام اور واقعات اچانک یاد آجاتے ہیں۔ یہ سب خدا کی دین ہے۔ اس میں کوشش کا کوئی عمل دخل نہیں۔"

مسلمانوں کے ہاں قرآن (کریم) کی تلاوت بالعموم فجر کی نماز کے بعد کی جاتی ہے لیکن (حضرت) خلیفہ رابع نے بتایا کہ میں آج کل تہجد کی نماز کے بعد یعنی صبح تین بجے کے لگ بھگ تلاوت قرآن کریم کیا کرتا ہوں۔ اس طرح پورے انہماک اور توجہ سے قرآن کریم کے مطالب پر غور و فکر کرنے کا موقع مل جاتا ہے۔ باقاعدہ تلاوت تو کبھی نصف اور کبھی ایک گھنٹے کے لئے کرتا ہوں۔ لیکن جب کوئی خاص مضمون یا مسئلہ زیر غور ہو تو لامحالہ ان آیات اور مقامات کی تلاوت بھی ناگزیر ہو جاتی ہے جو مسئلہ مذکور سے متعلق ہوں۔ ہاں اگر فراغت ملے تو دن کے اوقات میں بھی قرآن کریم کی تلاوت کر لیا کرتا ہوں۔ اس طرح قرآن کریم کی روشنی اور برکت سے میرے علم میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ دوران

تلاوت، خطبات جمعہ کے مختلف موضوع ذہن میں آجاتے ہیں جن پر غور کرتے وقت راہنمائی کے لئے بھی خاص طور پر قرآن کریم ہی کی طرف رجوع کرتا ہوں۔

بس ذہن میں ایک ہلکا سا خیال ہوتا ہے پھر کوئی آیت سوجھ جاتی ہے جو میرے دماغ میں گردش کرنے والے خیال کے عین مطابق ہوتی ہے جس سے اس خیال کے خدوخال کھل کر سامنے آجاتے ہیں۔ اچانک ہر چیز روشن ہو جاتی ہے اور میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں بلاتردد کہہ سکتا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے خطبات میں اکثر ان آیات کا حوالہ بھی دیا کرتا ہوں یہاں تک کہ لوگ مجھ سے پوچھتے بھی ہیں کہ میں نے ایسی موزوں اور برمحل آیت کس طرح منتخب کرلی۔

درحقیقت معاملہ بالکل اس کے برعکس ہے۔ میں آیت منتخب نہیں کرتا بلکہ اپنے آلہ کار کے طور پر آیت مجھے خود منتخب کرلیتی ہے تاکہ اس کی اس اندرونی سچائی کا اظہار ہوسکے جو اس کے اندر پوشیدہ ہے۔ کبھی کبھی حالات بھی شدت سے تقاضا کرتے ہیں کہ میں کسی خاص موضوع مثلاً عالمی اہمیت رکھنے والے کسی خاص واقعے، کسی اچھی یا بری خبر، غرض کہ کسی بھی موضوع پر خطبے میں اپنے خیالات کا اظہار کروں۔ تو میرے ذہن میں ایک عمومی خاکہ ضرور ہوتا ہے جس کے مطابق سبھی آئندہ کہنے والی باتیں ایک ترتیب اور پروگرام کے ساتھ میرے پیش نظر رہتی ہیں جنہیں میں جماعت پر واضح کرنا چاہتا ہوں مثلاً یہ کہ مجھے کون سے کام پسند ہیں اور کون سے کام ناپسند اور مخصوص حالات میں جماعت سے میں کس قسم کے ردعمل اور مثالی کردار کی توقع رکھتا ہوں۔ علاوہ ازیں کبھی کبھار کسی خط کے مندرجات بھی کسی خطبے کا موضوع بن جاتے ہیں"۔

خطوط کا ایک انبار بلکہ ایک پہاڑ ہوتا ہے جسے آپ کو روزانہ سر کرنا ہوتا

ہے۔ ستانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ آرام کی زیادہ سے زیادہ وہی گنتی کی گھڑیاں ہوتی ہیں جو باجماعت نماز ادا کرنے کے لئے مسجد میں جاتے وقت میسر آتی ہیں۔ اس دوران آپ زیرلب دعا میں مشغول رہتے ہیں۔ بس آرام اور ستانے کے یہی چند ایک لمحات ہوتے ہیں۔ اوقات کار کے بعد دفتر کا عملہ تو رخصت ہو جاتا ہے لیکن آپ مسلسل اسی انہماک سے کام میں لگے رہتے ہیں یہاں تک کہ شام کے کھانے کا وقت ہو جاتا ہے۔ لیکن گھر جاتے وقت بھی باقی ماندہ ڈاک آپ ایک تھیلے میں بھر کر اپنے ہمراہ لے جاتے ہیں۔

کھانا کھاتے ہی اپنے مطالعہ کے کمرے میں چلے جاتے ہیں جہاں ڈاک کا مذکورہ تھیلا پہلے سے آپ کا منتظر ہوتا ہے۔ حسب معمول ایک ایک خط کو پڑھ کر اس پر ہدایات نوٹ کرتے جاتے ہیں۔ کبھی عشاء کی نماز کے بعد سونے سے پہلے ٹیلی ویژن پر خبروں کا پروگرام بھی دیکھ لیتے ہیں۔ اگر پوچھا جائے کہ آپ سوتے کس وقت ہیں تو جواب دینے میں خاصا حجاب محسوس کرتے ہیں۔

لندن کی احمدی بچیوں نے ایک دفعہ سوال کیا کہ آپ صبح صبح کام شروع کرنے سے پہلے کس وقت بیدار ہوتے ہیں تو ایک کمسن بچہ بے اختیار چلا کر بولا میں بتاتا ہوں۔ مجھے پورا پتہ ہے حضور کب بیدار ہوتے ہیں۔ آپ صبح صبح تین بجے جاگتے ہیں کیونکہ تین بجے حضور کے مکان کی بتی روشن ہو جاتی ہے۔ مجھے اس کا پتہ تب چلا جب میں اپنے چچا جان کے ہمراہ پہرے کی ڈیوٹی دے رہا تھا۔ اس پر (حضرت) خلیفہ رابع مسکرائے اور کہنے لگے:۔

"اچھا یہ بات ہے! اگر تم اسی طرح میرے راز افشا کرتے رہے تو مجھے تمہارے چچا جان سے بات کرنی پڑے گی"۔

سب جانتے ہیں کہ (حضرت) خلیفہ رابع رات بھر میں صرف تین گھنٹے

آرام کرتے ہیں اور دن کے وقت دو مرتبہ تیس تیس منٹ لمبا قیلولہ ایک، سہ پہر کے وقت اور دوسرا ساڑے چھ اور سات بجے شام کے درمیان۔ فرماتے ہیں:۔

"میرے اندر بھی ایک طرح کا ٹائم پیس ہے جب چاہوں اس کا الارم مجھے عین وقت پر جگا دیتا ہے"۔

صبح کے وقت جب دفتر کھلتا ہے اور سیکرٹری صاحبان دفتر میں پہنچتے ہیں تو ملاحظہ کی ہوئی ڈھیروں ڈاک کو اپنا منتظر پاتے ہیں۔ یہی روزانہ کا معمول ہے۔ ہفتے بھر میں صرف جمعہ کے دن اس میں کچھ فرق پڑتا ہے۔ اس دن آپ خطبہ جمعہ کی تیاری کرتے ہیں۔

اگر آپ دوسرے ممالک میں احمدی مشنوں کے دورے پر جائیں تو بھی اس معمول میں کوئی تبدیلی نہیں آتی۔ آپ کے ایک محافظ نے بتایا:۔

"ڈاک ملاحظہ کرنے کا یہ طریق تو دوران سفر بھی جاری رہتا ہے۔ ہم نے دیکھا کہ سکنڈے نیویا کے دورے پر کار میں بھی حضور مسلسل ڈاک ملاحظہ کرتے رہے۔ ایک دفعہ کشتی پر سوار ہونے سے رہ گئے۔ یوں لگتا تھا کہ رات کی رات سر چھپانے کے لئے کسی جگہ کا ملنا تو درکنار کھانے کے لئے بھی شاید کچھ نہ مل سکے۔ مگر آپ نے فرمایا کہ جاؤ کوشش کر دیکھو۔ ممکن ہے کہ جگہ مل جائے اور خود کار ہی میں بیٹھے بیٹھے بڑے سکون اور اطمینان سے ڈاک دیکھنے میں مشغول ہو گئے حتیٰ کہ آخر کار بڑی تگ و دو کے بعد رات گزارنے کے لئے ہمیں ایک ہوٹل میں جگہ مل گئی"۔

(حضرت) خلیفہ رابع کو اپنے شایان شان بڑے بڑے ہوٹلوں اور

ریستورانوں میں جاکر کھانا کھانے کا قطعاً شوق نہیں ہے۔ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ آپ جزائر برطانیہ کی جماعتوں کے دورے پر تھے۔ یہ ایبرڈین نامی شہر کا واقعہ ہے۔ قافلے کے ہم سفر اراکین اس شش و پنج میں تھے کہ کھانا کس ریستوران میں کھایا جائے۔ اچانک کیا دیکھتے ہیں کہ خلیفہ رابع چپکے سے کہیں غائب ہو گئے ہیں۔ پریشانی کے عالم میں ادھر ادھر تلاش شروع ہوئی۔ پتہ چلا کہ چند قدم آگے ایک چھوٹی سی مچھلی اور چپس کی دکان میں اطمینان سے بیٹھے ہوئے ہیں۔ اراکین قافلہ کو دیکھا تو کہنے لگے میں نے آپ سب کے لئے تلے ہوئے آلوؤں اور مچھلی کا آرڈر دے دیا ہے۔

اپنے مریدوں سے آپ جس شفقت محبت اور انکسار سے پیش آتے ہیں۔ اس کی شہرت تو اب افسانوی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ جزائر برطانیہ کی جماعتوں کے سالانہ جلسے کے موقع پر (حضرت) خلیفہ رابع کی خواہش اور خصوصی دعوت پر (حضرت) مولوی محمد حسین صاحب انگلستان آئے (حضرت) مسیح موعود (علیہ السلام) کے صحابہ اور رفقاء میں سے اب یہی ایک معروف صحابی بقید حیات ہیں۔ ان کی عمر اس وقت سو سال کے لگ بھگ تھی۔

یہ معمر بزرگ لندن پہنچے تو رضاکار انہیں ائرپورٹ سے مسجد لندن میں لے آئے اور (حضرت) خلیفہ رابع کے دفتر سے ملحق ویٹنگ روم میں بڑے ادب اور احترام سے سہارا دے کر بٹھا دیا۔ مولانا عطاء المجیب راشد جو ان دنوں لندن مشن کے انچارج تھے فوراً اٹھے اور اندرونی ٹیلی فون پر (حضرت) خلیفہ رابع کو اطلاع دی کہ (حضرت) مولوی محمد حسین صاحب لندن پہنچ گئے ہیں اور ملاقات کی اجازت چاہتے ہیں (حضرت) خلیفہ رابع نے جواباً کہا "شکریہ" اور فون بند کر دیا۔ عطاء المجیب کہتے ہیں اس مختصر جواب پر مجھے کچھ تعجب سا ہوا۔ مجھے توقع

تھی کہ (حضرت) مولوی محمد حسین صاحب کو فوراً ہی بلا توقف ملاقات کے لئے اندر بلالیا جائے گا۔ میں اس گومگو کے عالم میں ابھی فون نیچے رکھنے نہیں پایا تھا کہ اندر کا دروازہ کھلا اور میں نے دیکھا کہ حضور بزرگ مہمان سے ملنے کے لئے بنفس نفیس خود تشریف لا رہے ہیں۔ آپ نے بے تابانہ آگے بڑھ کر (حضرت) مولوی محمد حسین صاحب کا استقبال کیا اور فرمایا:

"میرے محترم! یہ آپ کا نہیں بلکہ میرا فرض تھا کہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا"۔

خلیفہ منتخب ہونے کے چند ہفتے بعد ہی انہوں نے چھڑی کا استعمال ترک کر دیا جو خلافت کے منصب کا نشان تصور کی جاتی تھی۔ فرمایا:۔

"میں اس طرح ہر وقت چھڑی لے کر گھومنے پھرنے کا تکلف گوارا نہیں کر سکتا"۔

آپ کے مطالعہ کی رفتار بے حد تیز ہے؟ جواباً فرمایا۔

"مجھے نہیں معلوم کہ میری پڑھنے کی رفتار کیا ہے۔ نہ ہی میں نے کبھی اسے ماپا ہے۔ البتہ میں خاصی تیز رفتاری سے پڑھ سکتا ہوں۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ میں نے مطالعہ بڑی وسعت سے کیا ہے"۔

بایں ہمہ انہیں جلدی ہی اس بات کا بخوبی اندازہ ہو گیا کہ ان کے پاس نہ اب اتنی فرصت ہے نہ فراغت کہ جن بے شمار کتابوں کا وہ مطالعہ کرنا چاہتے ہیں اور جن نت نئی معلومات کو حاصل کرنے کی وہ خواہش رکھتے ہیں ان کے حسب حال وہ وقت بھی نکال سکیں۔ چنانچہ اس مشکل کا ایک حل تو انہوں نے یہ نکالا کہ ایسے ماہرین کی خدمات حاصل کرلیں جو مسلمہ اصابت رائے کے مالک تھے۔ اب یہ کام

ان کے سپرد کیا گیا کہ وہ مختلف کتب اور رسائل کا بالاستیعاب مطالعہ کریں اور ضروری اور مفید مطلب مقامات کو اپنے امام کے نوٹس میں لائیں۔

سوال:۔ آپ کبھی نہ کبھی سوچتے تو ہوں گے کہ آپ کو کس قدر برداشت کی حد سے بڑھ کر کام کرنا پڑ رہا ہے؟

جواب:۔ نہیں ہرگز نہیں۔ یہ تو اللہ کا احسان اور اس کا فضل ہے کہ اس نے نہ صرف مجھے کام کرنے کی توفیق دی اور صلاحیت عطا فرمائی بلکہ اس سلسلے میں میری تربیت کے مواقع بھی بہم پہنچائے۔

ہر نئے مذہبی راہنما اور امام کے انتخاب کے بعد سابقہ طریق اور ایک حد تک جاری حکمت عملی میں کچھ نہ کچھ تبدیلی تو ویسے بھی آ ہی جاتی ہے۔ مشورے دینے والے اپنی بھانت بھانت کی رائے دینے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے۔ ان کو موقع مل جاتا ہے کہ وہ اپنے اپنے مشورے اور نقطہ نظر کو پُر زور اور مؤثر انداز میں پیش کریں جس کی ان کے زعم میں سابقہ قیادت کے زمانے میں پورے طور پر پذیرائی نہیں ہوتی تھی۔

اور پھر کبھی کبھی تو یوں ہوتا ہے کہ مشیروں کے اندازے دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں اور نئے آنے والے کی سوچ ان کی اپنی توقعات سے خاصی مختلف ثابت ہوتی ہے اور انہیں اس امر کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ آنے والا نیا قائد اپنی مرضی کا مالک ہے۔ چہرہ ہی نیا نہیں سوچ بھی نئی ہے۔ بظاہر پریشان کن لیکن باطن ٹھوس اور عزم و یقین سے پُر۔ ایسی صورت میں کچھ لوگ اپنے آپ کو مبارک باد دیتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ ان کے ذریعے کتنا عمدہ انتخاب ہوا لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ محض حسن اتفاق تھا اور ایک قدرتی حادثہ کہ انتخاب کے نتیجے میں ایک قائد ابھر کر سامنے آ گیا؟

کہیں ایسا تو نہیں کہ آنے والے نے حالات کو بھانپ کر انہیں اپنی خواہش اور مرضی کے مطابق ڈھال لیا ہو؟ اور پھر اصل سوال تو یہ ہے کہ کیا وہ اپنی مرضی سے میدان عمل میں اترا ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ ساری کارروائی ایک الٰہی فیصلے اور منصوبے کے ماتحت ہو رہی ہو؟

(حضرت) خلیفہ ثانی (رضی اللہ عنہ) کے عہد خلافت میں انتہائی سادگی اور پابندی کا پہلو نمایاں تھا۔ (حضرت) خلیفہ رابع کو مشورہ دینے والوں میں کچھ ایسے لوگ بھی تھے جنہوں نے خلافت ثانیہ کا زمانہ پایا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ جماعت پھر اسی سادگی اور پابندی کی طرف لوٹ جائے جو خلافت ثانیہ کا طرہ امتیاز تھی۔ ان کے نزدیک جماعت احمدیہ میں حد سے زیادہ آزاد خیالی کا رجحان پیدا ہو چلا تھا۔ بقول ان کے لوگ تفریحات پر بے دریغ وقت اور روپیہ برباد کر رہے تھے۔ ان کے نزدیک خصوصاً ٹیلی ویژن اور فلموں کا بخار تو کیا نوجوان اور کیا بوڑھے سبھی کو چڑھتا نظر آ رہا تھا۔

چودھری محمد ظفر اللہ خان جو ایک سادگی پسند' مرتاض' اور محتاط احمدی بزرگ تھے۔ ایک مرتبہ (حضرت صاحبزادہ مرزا) طاہر احمد کے ہاں کھانے کی دعوت میں شمولیت کے لئے تشریف لائے۔ یہ انتخاب خلافت سے پہلے کی بات ہے۔ (حضرت) صاحبزادہ صاحب کے ہاں ٹیلی ویژن سیٹ دیکھا تو بہت ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا اور بے ساختہ پکار اٹھے:۔

"میں یہ کیا دیکھ رہا ہوں۔ کیا آپ بھی ان فضول مشاغل کا شکار ہو گئے ہیں؟"

(حضرت) خلیفہ رابع فرماتے ہیں میں نے انہیں کچھ یوں جواب دیا:۔

"نہیں میں ان مشاغل کا شکار نہیں ہوا۔ البتہ یہ بھی صحیح ہے کہ آپ کے

حضرت خلیفۃ المسیح الرابع اپنی صاحبزادی طوبیٰ کو اٹھائے ہوئے۔ یہ تصویر سپین میں لی گئی۔

حضرت خلیفۃ المسیح الرابع اجے بوڈے (نائیجیریا) کے احمدیوں کے ساتھ۔

حضرت خلیفۃ المسیح الرابع اپنے والد محترم حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ کے ساتھ۔

یہ تصویر دہلی میں جلسہ مصلح موعود کے دوران اتاری گئی۔

اپنے بھائی کے ساتھ کھیلتے ہوئے۔

حضرت خلیفۃ المسیح الرابع گھڑسواری کرتے ہوئے۔

حضرت خلیفۃ المسیح الرابع مغربی افریقہ کے دو وزراء کے ہمراہ۔

حضرت خلیفۃ المسیح الرابع اپنی ایک کتاب پر اپنے دستخط ثبت فرما رہے ہیں۔

حضرت خلیفۃ المسیح الرابع اپنی بڑی صاحبزادی کو اٹھائے ہوئے۔

E.2939/83 ① 261-28-302465

This passport contains 36 pages
Ce passeport contient 36 pages

پاسپورٹ
PASSPORT
PASSEPORT

PAKISTAN پاکستان

پاسپورٹ کا نمبر
NO. OF PASSPORT
NO. DU PASSEPORT
AK827320

حامل کا نام
NAME OF BEARER
NOM DU TITULAIRE
Mr. Mirza Tahir Ahmad

والد/شوہر کا نام
NAME OF FATHER/HUSBAND
NOM DU PÈRE/DU MARI
Hazrat Mirza Bashiruddin Mahmud Ahmad

حامل کا پیشہ
Profession of bearer
Head of the Ahmadiyya Movement

مقام و تاریخ پیدائش
Place and date of birth
Lieu et date de naissance
Qadian India 18.12.28

قد
Height
Taille
1 m 67 cm

نمایاں امتیازی نشانات
Visible distinguishing marks
Signes particuliers
Scar on right elbow

قومی حیثیت
NATIONAL STATUS
NATIONALITÉ
Citizen of Pakistan

حضور کے پاسپورٹ کے پہلے صفحہ کی تصویر۔ حضور نے اس پاسپورٹ پر پاکستان کو چھوڑا جس میں آپ کا منصب "ہیڈ آف دی احمدیہ موومنٹ" درج ہے۔
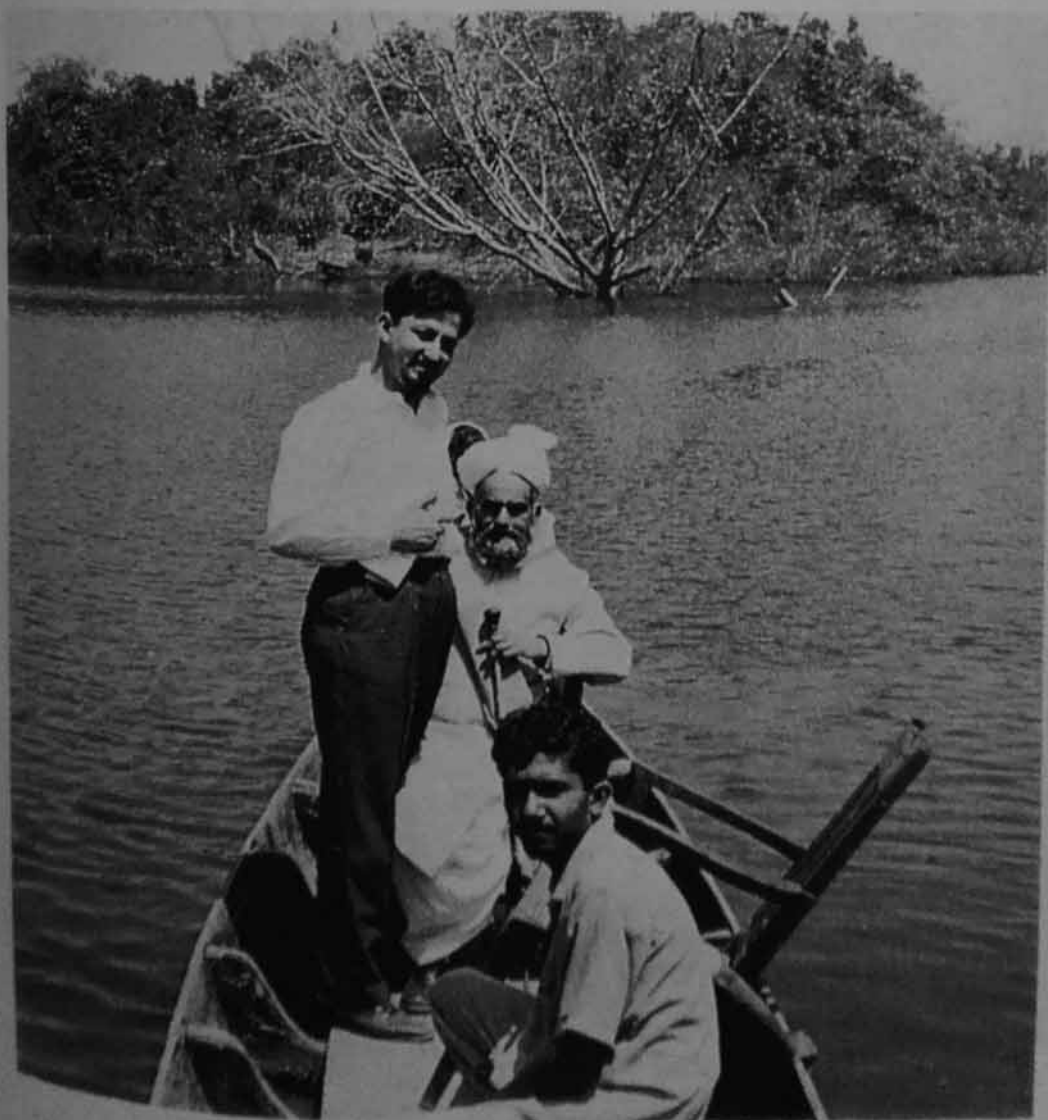
حضرت خلیفہ المسیح الرابع اور حضرت خلیفہ المسیح الثالث" کی ایک یادگار تصویر۔

کینیڈا کے ایک پارک میں اپنی صاحبزادیوں کے ہمراہ نماز پڑھ رہے ہیں۔

حضور اسلام آباد (انگلستان) میں نشانہ بازی کرتے ہوئے۔
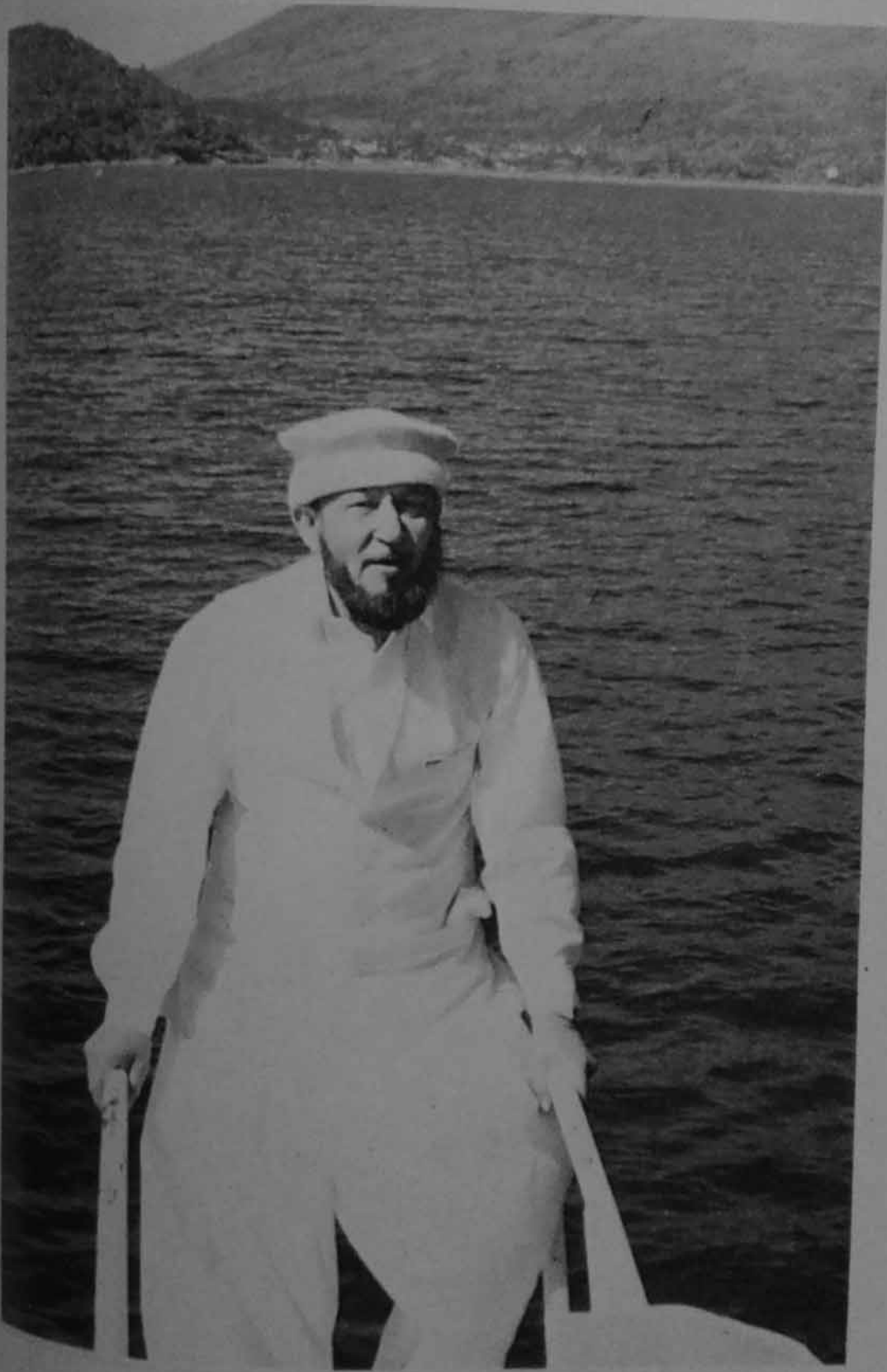
حضرت خلیفۃ المسیح الرابع سمندر کی سیر کرتے ہوئے۔

حضور اپنے نواسوں کے ساتھ تشریف فرما ہیں۔
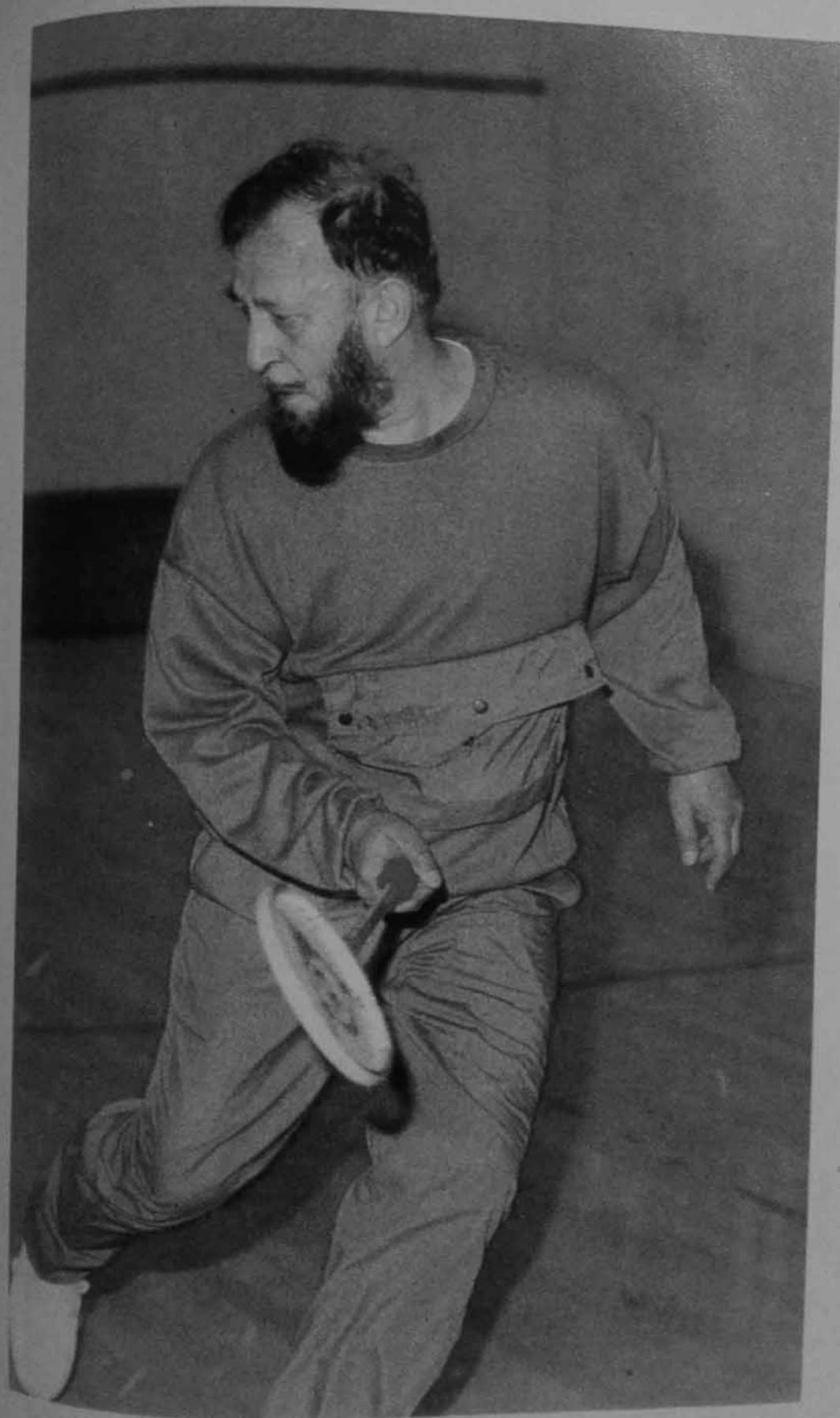
حضور سکوائش کھیلتے ہوئے۔

نقطہ نظر اور میرے نقطہ نظر میں فرق ہے۔ میری سوچ آپ سے بہت مختلف ہے۔ میں یہ ماننے کے لئے تیار نہیں ہوں کہ ٹیلی ویژن میں فقط خرابی ہی خرابی ہے۔ کوئی خوبی سرے سے ہے ہی نہیں۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ ٹیلی ویژن پر دکھائے جانے والے کچھ پروگرام یقیناً نامناسب ہوتے ہیں لیکن اگر آپ ٹیلی ویژن پر مکمل قدغن لگادیں اور اسے دیکھنا ممنوع قرار دے دیں تو جانتے ہیں کیا ہوگا؟ ذرا سوچئے تو سہی۔ کیا اس صورت میں ہم نوجوانوں کی فطرت کے خلاف اعلان جنگ نہیں کر رہے ہوں گے؟ اگر بچوں کے لئے اپنے گھر میں ٹیلی ویژن دیکھنا شجر ممنوعہ بن جائے تو وہ اسے اپنے گھر میں دیکھنے کے بجائے کسی ہمسائے کے گھر میں جاکر دیکھ لیں گے۔ اس طرح سے ہم انہیں منافقت اور دوغلے پن کی تربیت دے رہے ہوں گے اور بچے ماں باپ کی نظریں بچا کر ایک مجرمانہ احساس کے ساتھ چوروں کی طرح اپنے جذبات کی تسکین کے سامان تلاش کرنے لگیں گے۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک نہایت خطرناک راستہ ہے جس پر قدم مارنے کے نتائج بھیانک اور افسوس ناک ہوسکتے ہیں۔

کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ میں اپنے بچوں کو اپنے گھر میں اپنی نظروں کے سامنے ٹیلی ویژن دیکھنے کی اجازت دے دوں تاکہ ضرورت پڑنے پر میں ان کی راہنمائی کرسکوں اور بچے بھی جب چاہیں مجھ سے مشورہ کرسکیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم سب اکٹھے بیٹھتے ہیں اور ٹیلی ویژن پر دکھائے جانے والے کچھ ڈراموں اور پروگراموں کو مل کر دیکھتے ہیں۔ ٹھیک ہے کچھ پروگرام ناپسندیدہ ہوتے ہیں جنہیں دیکھنا میں ہرگز گوارا نہیں کرسکتا۔

لیکن ہوتا یوں ہے کہ میں پروگراموں پر تبصرہ بھی کرتا جاتا ہوں۔ اس طرح پسند یا ناپسند کا معقول رنگ میں اظہار بھی ہو جاتا ہے اور بچوں کو علم ہو جاتا ہے کہ

میری ان پروگراموں کے بارے میں کیا رائے ہے اور وہ میری رائے اور میرے نقطہ نظر کے مناسب اظہار سے نہ صرف متاثر ہوتے ہیں بلکہ ان کی اس قسم کے پروگراموں میں دلچسپی ماند پڑجاتی ہے اور وہ ان کے کھوکھلے پن کے قائل ہوجاتے ہیں۔ ان کی دلچسپی اور ذوق و شوق کا رخ بدل جاتا ہے۔ ورنہ عین ممکن ہے کہ اگر میں ان پر خشک سختی کرتا تو وہ میری پسند ناپسند کا احترام کرنے کی بجائے اس کے خلاف بغاوت کے مرتکب ہوجاتے"۔

(حضرت) خلیفہ رابع کہتے ہیں کہ چوہدری محمد ظفراللہ خان صاحب کو میرے اس جواب سے اندازہ ہوگیا کہ میں کن خطوط پر اپنے بچوں کی تربیت کرنے کی کوشش کررہا ہوں۔

سوال:۔ کیا اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ آپ (حضرت) خلیفہ ثانی (رضی اللہ عنہ) کے مسلک سے انحراف کے مرتکب ہوئے؟

جواب:۔ "نہیں۔ ہرگز نہیں۔ بات یہ ہے کہ بحیثیت امام جماعت احمدیہ میرا یہ فرض ہے کہ زندگی کے ہر میدان میں خواہ وہ روحانی ہو یا کوئی اور میں جماعت کی فلاح و بہبود اور ہمہ جہت صحت اور ترقی کے لئے کوشش کرتا رہوں۔ وقت وقت کی بات ہے۔ ہر دور کے اپنے تقاضے ہیں جن کی وجہ سے حکمت عملی میں کچھ نہ کچھ تبدیلی ہوکر رہتی ہے۔ قدریں نہیں بدلتیں ان کے حصول کے ذرائع بدل جاتے ہیں۔ کبھی سختی اور تنگی ترشی کا دور آتا ہے تو کبھی نسبتاً آسانی اور فراخی کا۔ اس لئے میرے اور میرے والد محترم (حضرت) خلیفہ ثانیؓ کے مقاصد میں کوئی فرق نہیں اور نہ ہی کسی قسم کا اختلاف رائے ہے۔ مقاصد تو وہی ہیں فرق صرف یہ ہے کہ بدلے ہوئے اور تیزی سے بدلتے ہوئے حالات میں اگر میں نے اپنی حکمت عملی میں مناسب حال تبدیلی نہ کی تو مجھے اندیشہ ہے کہ میں ان

مقاصد عالیہ کو حاصل نہیں کر سکوں گا جن کے حصول کے لئے جماعت احمدیہ ابتدا ہی سے کوشاں ہے۔ اس صورت میں مجھے ڈر ہے تو یہ ہے کہ کہیں میری وجہ سے جماعت احمدیہ کو کوئی نقصان نہ پہنچ جائے۔ اس لئے یقین رکھیں اصولوں اور سمت میں کوئی فرق نہیں۔ ہلکا سا فرق اگر نظر آتا ہے تو جدید تقاضوں سے نمٹنے کے لئے صرف طریق کار کا فرق ہے"۔

آزادی کے موضوع پر ایک بار پھر ان سے تبادلہ خیال ہوا بلکہ اس کھلی مادر پدر آزادی کے موضوع پر بھی جسے شخصی آزادی اور آزاد خیالی کے نام پر جائز قرار دیا جا رہا ہے۔ میں نے پوچھا کہ آخر بدی کی کوئی تعریف تو ہوگی۔ اس کی کوئی حدود تو ہوں گی۔ بدی کو بدی کہیں گے۔ کیا برائی صرف اس کو کہتے ہیں جو کسی دیکھنے والے کو بری نظر آئے۔ فرمایا:۔

"افراط و تفریط آزادی اور عدم آزادی کی دو انتہاؤں کے درمیان ایک مقام محمود آتا ہے جس کا دوسرا نام اعتدال ہے۔ اعتدال اور میانہ روی کا یہ ارفع مقام دیکھنے کو تو شاید پھیکا نظر آئے لیکن اگر سوچیں تو یہی ایک راستہ ہے جس پر چل کر معاشرے میں حقیقی حسن اور پائیدار توازن پیدا کیا جا سکتا ہے اور اسے خوفناک قسم کے غلط رویوں سے بچایا جا سکتا ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ شخصی آزادی کے نام پر حدود سے تجاوز کیا جا رہا ہے۔ نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ برائی کا (یعنی جسے ہم واقعی برائی سمجھتے ہیں) بلا روک ٹوک اور کھلے بندوں ارتکاب کیا جا رہا ہے اور کوئی نہیں جو اس کے خلاف

صدائے احتجاج بلند کرے۔ اس لئے ضروری ہے کہ جو
لوگ اس نام نہاد شخصی آزادی سے بے زار ہیں جس کی آڑ
میں یہ بے راہ روی پھیل رہی ہے انہیں چاہئے کہ ان
رجحانات کے خلاف کھل کر اپنی آواز بلند کریں۔ اس کا
انہیں بنیادی انسانی حقوق کے تحت پورا حق حاصل ہے۔
مناسب ہوگا کہ ایسے لوگوں کی حوصلہ افزائی کی جائے جو اس
بے لگام آزادی کے خلاف موثر اور احسن انداز میں دانائی
اور حکمت کے ساتھ نرمی اور ترغیب اور دلائل کے ساتھ
صدائے احتجاج بلند کرنے کے لئے تیار ہوں تاکہ لوگوں کو
کچھ تو اندازہ ہو کہ وہ اپنے آپ پر ظلم ڈھا رہے ہیں۔"

"ضرورت اس بات کی ہے کہ جہاں شخصی آزادی کی بات ہو وہاں عقل و دانش اور حزم و احتیاط کے تقاضوں کو بھی ملحوظ خاطر رکھا جائے تاکہ مادر پدر آزادی سے پیدا ہونے والے خوفناک اور دور رس نتائج کا پہلے سے اندازہ ہو جائے۔ کچھ نتائج کے خدوخال تو نظر بھی آنے لگ گئے ہیں مثلاً اعلیٰ زندگی اور اخلاقی قدریں تباہ ہو کر رہ گئی ہیں۔ کہاں تک فہرست بنائی جائے۔ ایک طرف ایڈز کی خوفناک مرض وبائی صورت اختیار کر رہی ہے تو دوسری طرف عمر رسیدہ لوگ بوڑھوں کی قیام گاہوں میں کسمپرسی کی حالت میں زندگی کے دن کاٹ رہے ہیں۔ جہاں ان کے بچے جھوٹے منہ کبھی کبھار رسمی ملاقات کے لئے آکر خانہ پُری کر جاتے ہیں۔

تہذیب کو کھلے بندوں خیرباد کہا جا رہا ہے۔ ان اعلیٰ قدروں کو جنہیں بنی نوع انسان نے ہزارہا سال کے تجربے کے بعد دریافت کیا تھا بڑی دیدہ دلیری سے پس

پشت ڈالا جا رہا ہے۔ مزے لوٹنے کی ایک بے محابا دوڑ ہے جس کی کوئی حد ہے نہ نہایت۔ اور ستم بالائے ستم یہ کہ سب کچھ آزادی اور آزاد خیالی کے نام پر کیا جا رہا ہے۔ ہر طرف سے هَلْ مِنْ مَّزِيْد کی صدائیں بلند ہو رہی ہیں۔ لذت کی بھوک ہے کہ مٹنے میں نہیں آتی جو انسانی قدروں کو کھائے جا رہی ہے۔ لیکن سوچئے تو لذت کے حصول کی اس دوڑ کی بھی کچھ نہ کچھ حدود ہیں۔ کچھ قیود ہیں۔ ان حدود سے ذرا سا تجاوز بھی دوسروں کے حقوق خاص طور پر ان کے حصول لذت کے حق پر ڈاکہ ڈالنے کے مترادف ہوگا۔ اس لئے ضروری ہے کہ ہم لوگوں کی مناسب تربیت کریں۔ ان میں شعور پیدا کریں کہ صبر اور تحمل نام کی بھی کوئی چیز ہے اور لذت کی بھی کوئی اخلاقی حدیں اور سرحدیں ہیں جن کو پار نہیں کیا جانا چاہئے۔ اگر محدود حصول لذت اور محبت اور نفرت کا مسئلہ سمجھ میں نہ آئے تو یوں فرض کرلیں کہ بات جائیداد کی ہو رہی ہے۔ اس سے سارا مسئلہ آسانی سے ذہن میں آجائے گا۔"

آپ نے دیکھا ہوگا کہ احمدی حضرات اپنی کاروں پر ایک مختصر سا سٹکر لگایا کرتے ہیں یعنی "محبت سب کے لئے نفرت کسی سے نہیں" یہ نعرہ اور پیغام (حضرت) خلیفہ ثالث (رحمہ اللہ) نے جماعت احمدیہ کو دیا۔

آپ نے فرمایا:-

"میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ ہر احمدی صدق دل سے اس پیغام پر یقین رکھتا ہے یعنی محبت سب کے لئے نفرت کسی سے نہیں۔ دراصل یہی وہ مقام ہے جہاں صحیح ایمان کا آغاز ہوتا ہے"۔

پھر فرمایا:-

"لیکن اگر کوئی شخص برائی سے باز نہ آئے تو اس سے محبت آسان نہیں ہوتی۔ کیونکہ بالآخر برا اور برائی ایک ہو کر رہ جاتے ہیں اور دونوں میں تمیز مشکل ہو جاتی ہے۔ ان حالات میں ہم پر فرض عاید ہو جاتا ہے کہ ہم اللہ کے حضور دعا کا سہارا لیں اور اس کے حضور عاجزانہ التجا کریں کہ وہ برے کو برائی سے نجات دے دے۔ لیکن اگر برا برائی سے باز نہ آئے تو پھر اس کا معاملہ اللہ پر چھوڑ دیں جو اس کے احتساب کے لئے کافی ہے"۔

یہ بات جلد ہی کھل کر سامنے آگئی۔ اپنے طریق کار' اپنے خطبات' اپنے معمول کے رد عمل اور لوگوں سے ملنے جلنے کے انداز سے (حضرت) خلیفہ رابع نے یہ واضح کر دیا کہ بدلے ہوئے عالمی حالات اور تقاضوں سے وہ اپنے خاص منفرد انداز سے نبرد آزما اور عہدہ برآ ہوں گے۔ نہ تو وہ گزرے ہوئے لمحات کے یرغمال بن کر رہیں گے اور نہ ہی خاموش تماشائی بن کر ہونے والے واقعات کے سامنے کبھی شکست تسلیم کریں گے۔

☆ ☆ ☆

18

تبلیغ اسلام کی علمبردار ایک جماعت

احمدیت در حقیقت ایک تبلیغی تحریک ہے جس کا بنیادی مقصد ساری دنیا کو حلقہ بگوش اسلام بنانا ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے ایک سادہ لیکن موثر اور مفصل نظام کا قیام عمل میں لایا جاچکا ہے یہ تحریک رضاکارانہ طور پر پیش کی گئی رقوم کی وصولی کرتی ہے اور ان رقوم کو جماعت کی خصوصاً اور بنی نوع انسان کی عموماً مذہبی، اخلاقی اور سماجی فلاح و بہبود اور تبلیغی مساعی پر خرچ کرتی ہے۔

یہ نظام سادہ اس وجہ سے ہے کہ اس کی روح رواں صرف ایک شخصیت ہے یعنی خلیفہ وقت اور وہی اس کے مختار اعلیٰ ہیں اور مفصل اس لحاظ سے کہ یہ ایک ہمہ جہت نظام ہے۔ جس نے متعدد فلاحی اور اصلاحی پروگراموں کا بوجھ اپنے شانوں پر اٹھایا ہوا ہے۔ جن کی بجا آوری اور تکمیل کی خاطر بہت سے مخصوص قسم کے گروپ۔ کمیٹیاں اور ایسوسی ایشنیں تشکیل دی گئی ہیں۔ جو آہستہ آہستہ ایک نہایت مخلص اور موثر نظام کی شکل اختیار کر چکی ہیں۔ ابتلاؤں اور مصائب

کے پے در پے حملوں نے اس نظام میں غیر معمولی قسم کی قوت برداشت اور لچک بھی پیدا کر دی ہے۔

سارے نظام کا اقتدار اعلیٰ خلیفہ وقت کی ذات میں مرکوز ہے۔ اس سے یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہئے کہ آپ کا منصب کسی اسلامی مملکت کے وزیر اعظم سے ملتا جلتا ہے۔ جماعت احمدیہ نبوت کے جاری رہنے کے عقیدے پر پختہ ایمان رکھتی ہے۔ حکیم و خبیر خدا نے اپنی حکمت کے تحت (حضرت) موسیٰؑ۔ (حضرت) عیسیٰؑ اور دیگر انبیاء (علیہم السلام) کو اپنے اپنے وقت کے تقاضوں اور ضروریات کے مطابق بھیجا۔ آخر میں اس نے (حضرت) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو مبعوث فرمایا۔ آپ کے آنے سے شریعت کی تکمیل ہو گئی۔ آپ ہی آخری شریعت لانے والے رسول ہیں۔ اور آپ کی لائی ہوئی کتاب قرآن آخری کتاب ہے۔ آپ کی شریعت کو اب کوئی طالع آزما نہ منسوخ کر سکتا ہے اور نہ ہی تبدیل۔ رہتی دنیا تک آپ ہی کی لائی ہوئی شریعت نافذ رہے گی۔ اب ہمیشہ کے لئے آپ ہی رسول ہیں اور آپ ہی پیشوا۔ لیکن احمدی کہتے ہیں کہ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے تابع غیر شرعی امتی نبی بھی نہیں آسکتے۔ ایسے نبی کوئی نئی شریعت لانے والے نہیں ہوں گے بلکہ انہیں بنی نوع انسان کی فلاح اور نجات کی خاطر اللہ تعالیٰ کی طرف سے خاص فرائض تفویض کئے جائیں گے۔

بانی جماعت احمدیہ (حضرت) مرزا غلام احمد قادیانی (علیہ السلام) (حضرت) محمد (مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم) کے نقش قدم پر چلنے والے۔ آپ کے مطیع۔ آپ کے غلام اور آپ کے عاشق صادق تھے۔ ان کا دعویٰ تھا کہ اللہ (تعالیٰ) نے انہیں نبوت کے مقام پر سرفراز فرمایا ہے۔ انہوں نے بار بار اعلان کیا کہ میں کوئی نئی شریعت لے کر نہیں آیا۔ آپ نے بڑے زور دار الفاظ میں وضاحت فرمائی کہ اب کوئی نئی

شریعت نہیں آسکتی۔ آپ نے دعویٰ کیا کہ میری نبوت کی نوعیت شرعی نبوت سے مختلف ہے۔ آپ نے فرمایا کہ قرآن مجید اور مقدس بائیبل کی پیشگوئیوں کے مطابق آنے والا میں ہی وہ مسیح موعود ہوں جس پر یہ فرض کیا گیا ہے کہ اسلام کا نور دنیا میں پھیلائے۔ نیز فرمایا کہ میری وفات کے بعد قدرت ثانیہ کا ظہور ہو گا۔ خلافت علیٰ منہاج النبوۃ قائم ہوگی اور میرے بعد آنے والے خلفاء کو یہ مقدس فرض سونپا جائے گا کہ وہ اسلام کا پیغام دنیا میں پھیلائیں اور اس کی وسیع پیمانے پر اشاعت کریں۔ وہ صبرو تحمل اور توکل سے کام لیں گے اور اپنے مفوضہ فرائض کی انجام دہی کے لئے صرف اور صرف اللہ تعالیٰ ہی سے نصرت طلب کریں گے۔

قرآن (مجید) میں اللہ (تعالیٰ) نے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ارشاد فرمایا کہ اپنے ذہین و فطین متبعین سے مشورہ طلب کیا کریں۔ احمدیوں کا کہنا ہے کہ اس ارشاد خداوندی کی اطاعت خلفائے احمدیت پر بھی واجب ہے۔ مشورہ مانگنے سے منصب خلافت کے تقدس اور اس کی عظمت پر حرف نہیں آتا۔ چھوٹا ہو یا بڑا جماعت احمدیہ کا ہر فرد دلی طور پر اس امر پر مکلف ہے کہ وہ اپنے واجب الاطاعت امام اور خلیفہ کی ہر لحاظ سے کامل اطاعت کرے۔ ممکنہ حد تک تمام احمدی بسا اوقات اپنے ذاتی معاملات میں بھی خلیفہ وقت سے راہنمائی کے طالب ہوتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ کوئی خاندان کہاں آباد ہو جائے۔ کیا پیشہ اختیار کرے یا کوئی نوجوان لڑکا یا لڑکی کس قسم کی اعلیٰ تعلیم کے حصول کی کوشش کرے۔ ایسے فیصلے جماعتی مفاد کے لئے بڑی اہمیت کے حامل ہوا کرتے ہیں۔ مثلاً شمالی انگلستان میں رہنے والے ایک ڈاکٹر نے (حضرت) خلیفہ رابع کی خدمت میں عرض کیا کہ میں پاکستان واپس جانا چاہتا ہوں۔ آپ نے اسے مشورہ دیا کہ اگر کچھ عرصے کے لئے دو اپنی واپسی ملتوی کردے تو بہتر ہو گا۔ فرمایا: جماعت کو آپ کی خدمات کی

ضرورت ہے۔ میرا مشورہ آپ کو یہ ہے کہ آپ یہیں ٹھہریں اور اسلام کا پیغام انگریزوں تک پہنچائیں اور یہ سمجھیں کہ میں اسلام اور احمدیت کا مبلغ ہوں۔

ڈاکٹر صاحب نے بعد میں بیان کیا کہ حضور کا یہ ارشاد سن کر میں خوشی سے پھولا نہ سمایا کہ میرے پیارے امام نے مجھ پر اتنے اعتماد کا اظہار فرمایا ہے۔ میں نے اپنے اہل خانہ تک حضور کا پیغام پہنچا کر اپنے ہوائی جہاز کے ٹکٹ منسوخ کر دیئے اور پھر میں حضور کے ارشاد کی تعمیل میں ہمہ تن مصروف ہو گیا۔

ڈاکٹر صاحب موصوف کی مساعی کے نتیجے میں ہارٹ لے پول کے قصبے میں جلد ہی انگلستان کی پہلی جماعت احمدیہ کا قیام عمل میں آ گیا۔ جس سے انگلستان میں پیدا ہونے والے نئے احمدیوں کی تعداد دیگر احمدیوں سے بھی بڑھ گئی۔

ریاستہائے متحدہ امریکہ کے ایک احمدی نوجوان کو اپنے ہائی سکول کے امتحان میں اعلیٰ درجے میں اعزاز کے ساتھ پاس ہونے کی امید تھی وہ اپنے حسب منشاء کوئی سا کورس بھی یونیورسٹی میں منتخب کر سکتا تھا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ قانون پڑھے اور وکالت کا پیشہ اختیار کرے۔ حسن اتفاق سے (حضرت) خلیفہ رابع ان دنوں امریکہ کے دورے پر تشریف لائے ہوئے تھے۔ چنانچہ اس نوجوان نے آپ سے مشورہ مانگا اور راہنمائی کی درخواست کی۔

آپ نے مشورہ دیا کہ بہتر ہو گا کہ آپ ڈاکٹر بنیں۔ فرمایا کہ وکیلوں کے بجائے ہمیں ایسے ڈاکٹروں کی زیادہ ضرورت ہے جو خدمت خلق کے ساتھ ساتھ اسلام کی تبلیغ کا فریضہ بھی سرانجام دیں۔ افریقہ۔ جنوبی امریکہ۔ چین۔ روس وغیرہ ممالک میں وکلاء کی اتنی ضرورت نہیں جتنی ڈاکٹروں کی ہے۔

جب اس نوجوان سے پوچھا گیا کہ آپ کو حیرت تو نہیں ہوئی اور ناگوار تو نہیں گذرا کہ آپ کو اس قسم کا مشورہ دیا جا رہا ہے۔ کیا یہ خالصتاً ذاتی نوعیت کا معاملہ

نہیں تھا؟

اس نے بلا توقف جواب دیا:

"ہرگز نہیں۔ اس کے برعکس مجھے انتہائی خوشی ہوئی کہ میرے پیارے امام نے اپنے انتہائی مصروف وقت میں سے میری راہنمائی کے لئے کچھ وقت دیا۔ انہیں خوب معلوم تھا کہ میرے لئے مفید ترین راستہ کونسا ہے۔ جس پر چل کر میں جماعت کی خدمت کے قابل ہو سکوں گا۔"

خلیفہ وقت کی اطاعت اور ان کے ارشادات کی تعمیل صمیم قلب سے اور رضاکارانہ طور پر کی جاتی ہے۔ اس میں کسی قسم کے جبر یا دباؤ کا عمل دخل نہیں ہوتا۔ یہ وہ اطاعت نہیں جو خوف سے پیدا ہوتی ہے۔ اس کا سرچشمہ محبت ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ احمدیوں کے دل اپنے مقصد حیات کے بارے میں کتنے عزم اور یقین سے پُر ہیں اور انہیں اپنے مطاع امام کے تقدس پر کتنا غیر متزلزل ایمان ہے نیز یہ کہ اللہ تعالیٰ نے (حضرت) خلیفہ رابع کو ان کی راہنمائی کے لئے اپنے ہاتھ سے چنا ہے اور چھوٹا ہو یا بڑا ہر فیصلے کے وقت اللہ تعالیٰ ان کی راہنمائی فرماتا ہے۔ اور یہ فیصلہ نہ صرف ان کے لئے بلکہ تمام بنی نوع انسان کے لئے فائدے اور برکت کا باعث ہوتا ہے۔ امام کی کامل اطاعت کے سلسلے میں صرف ایک استثنائی صورت ایسی ہے جب اطاعت فرض نہیں رہتی۔ یعنی جب خلیفہ وقت کوئی ایسا حکم دے۔ جو قرآن (کریم) یا نبی اکریم ﷺ کی سنت سے متصادم ہو۔ لیکن آج تک ایسا کوئی موقع پیدا نہیں ہوا اور نہ کبھی پیدا ہوگا۔ کیونکہ خلفاء احمدیت کے لئے لازم ہے کہ ان کے جملہ احکامات اور ارشادات اسلام کی کتب مقدسہ پر مبنی ہوں۔ خلفائے احمدیت کی کامل اطاعت اور ان کے فیصلوں پر والہانہ انداز سے لبیک کہنے کا ایک نتیجہ تو یہ نکلا ہے کہ جماعت تیزی سے ترقی کی منازل

طے کرتی چلی گئی ہے۔ بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں جماعت میں مالی لحاظ سے امیر لوگوں کا فقدان تھا۔ اقتصادی لحاظ سے متوسط الحال لوگ بھی انگلیوں پر گنے جاسکتے تھے۔ جماعت کی قوت کا دارومدار دیہات میں چھوٹے موٹے کاشتکاروں اور شہروں میں معمولی دکانداروں اور تاجر پیشہ لوگوں پر تھا۔ بعد کے دس پندرہ سالوں میں جماعت کے ایثار۔ خود انحصاری اور امداد باہمی کی حکمت عملی کو پھل لگنے شروع ہو گئے۔

(حضرت) مسیح موعود (علیہ السلام) نے فرمایا تھا کہ ہر احمدی کو چاہئے کہ اللہ (تعالیٰ) کے کلام یعنی قرآن (مجید) کی تلاوت کرے۔ اس لئے عین مناسب تھا کہ احمدیوں کی شرح خواندی سو فیصد ہوتی۔ اس سے نہ صرف دینی فرائض کی ادائیگی میں آسانی پیدا ہو گئی۔ بلکہ ان کے ذرائع معاش بھی بہتر سے بہتر ہوتے چلے گئے۔ کام کوئی بھی ہو خواندگی بہرحال کامیابی کی کلید ہے۔ چنانچہ اس کے نتیجے میں احمدی جہاں کہیں بھی تھے اپنی اپنی جگہ ترقی کی منازل طے کرنے لگے۔

مالی آسودگی سے جماعت کی تبلیغ مساعی پر بڑا خوش گوار اثر پڑا۔ جیسا کہ سب جانتے ہیں ہر احمدی ایک مبلغ ہوتا ہے۔ اس لئے بلا استثناء اپنی آمد کا مقررہ فی صد اس مقصد کے لئے جماعت کو طوعی طور پر پیش کرتا ہے اس لئے جوں جوں احمدیوں کے کاروبار میں ترقی اور آمد میں اضافہ ہوا، جماعتی چندوں اور عطایا کی مالیت بھی بڑھ گئی۔ خلیفہ وقت کی فعال رہنمائی میں تبلیغی مساعی میں نئی جان پڑ گئی۔ اور جماعت کی ترقی کی رفتار تیز سے تیز تر ہوتی چلی گئی۔

ہر احمدی کے لئے چندے کا کم از کم معیار یہ ہے کہ وہ اپنی ماہوار آمد کا سولھواں حصہ لازمی طور پر ادا کرے۔ اس میں کوئی استثناء نہیں۔ آپ امیر ہوں یا غریب اگر آپ کی آمد کی کوئی صورت موجود ہے تو آمد کے سولھویں حصے کی شرح

ے آپ کو چندہ ادا کرنا ہو گا۔ یہ چندہ (حضرت) مسیح موعود (علیہ السلام) کا مقرر زمودہ ہے۔ جیسا کہ صدر انجمن احمدیہ کے قواعد وضوابط سے پتہ چلتا ہے۔ (حضرت) مسیح موعود (علیہ السلام) نے مالی قربانیوں کی اہمیت پر بہت زور دیا ہے۔

ایک اور لازمی چندہ جلسہ سالانہ کا چندہ ہے اس کی شرح سال گذشتہ کی ماہوار آمدنی کے دس فیصد کے برابر ہے۔ اس رقم سے جلسہ سالانہ میں شامل ہونے والے مہمانوں کے جملہ اخراجات بشمول خوراک و رہائش پورے کئے جاتے ہیں۔ مہمان صرف آنے جانے کا کرایہ ادا کرتے ہیں۔ باقی خوراک اور رہائش کی ضرورت مہمانوں اور حاضرین کو مفت مہیا کی جاتی ہیں۔

(حضرت) مسیح موعود (علیہ السلام) نے وصیت کا نظام بھی قائم فرمایا تھا۔ اس نظام میں شامل ہونے والے احمدی جو اپنی ماہوار آمدن کے ۱/۱۰ سے لے کر ۱/۳ تک چندے کی ادائیگی کا عہد کرتے ہیں اور اسی شرح سے اپنی جائیداد کی بھی جماعت کے حق میں وصیت کرتے ہیں۔ انہیں موصی کہا جاتا ہے۔ اور وفات کے بعد ان کی ایک خاص قبرستان میں جو بہشتی مقبرہ کے نام سے موسوم ہے تدفین کی جاتی ہے۔ طوعی چندوں کی اور بھی کئی قسمیں ہیں۔ بیرون پاکستان ممالک میں تبلیغ کے لئے بھی تحریک کی جاتی ہے کہ احمدی خواتین حتیٰ کہ بچے بھی سال میں ایک مرتبہ صرف ایک مہینے کی آمدن کے بیس فیصد کے برابر تحریک جدید کا چندہ ادا کریں۔ قواعد وضوابط کے مطابق یہ چندہ طوعی ہے لیکن لازمی ہے کہ ہر احمدی اس میں حصہ لے۔ اس کی مختلف شرحیں ہیں وہ احمدی جو امریکہ میں ۳۰۰ امریکن ڈالر، برطانیہ میں ۲۰۰ پاؤنڈ، یورپ اور مشرق اوسط میں سو پاؤنڈ یا اس سے زیادہ ادا کریں۔ صف اول کے مجاہدین شمار کئے جاتے ہیں۔ جو ۱۵۰ امریکن ڈالر یا ۱۰۰ یا ۵۰ برطانوی پاؤنڈ ادا کرتے ہیں۔ وہ صف دوم کے مجاہدین کہلاتے

ہیں۔

وہ لوگ جن کی رقوم بنکوں میں جمع ہیں اور جنہیں انہوں نے بارہ ماہ یا زیادہ عرصہ سے استعمال نہیں کیا۔ ان پر زکوٰۃ واجب ہو جاتی ہے۔ جس کی شرح کل رقم کا اڑھائی فیصد ہے اسی طرح ان رقوم پر جو سود کی رقم ان کے حساب میں جمع ہوئی وہ ساری کی ساری جماعت کو ادا کریں۔ یہ رقم جماعت کی تبلیغی و تعلیمی مساعی اور طبی خدمات پر خرچ ہوگی۔ اس رقم کو وہ خود استعمال نہیں کر سکتے۔ اس کا ذاتی استعمال شرعاً حرام ہے۔

ان عام چندوں کے علاوہ بعض خاص چندے بھی ہیں۔ مثلاً صد سالہ جشن تشکر کا فنڈ، مشنوں کے قیام کا فنڈ، ریزرو فنڈ، افریقہ کے لئے فنڈ وغیرہ۔ تحریک جدید کے دفتر اول کے مجاہدین کے بچوں کو خاص طور پر تحریک کی گئی کہ وہ اپنے والدین کی وفات کے بعد ان کے چندوں کو جاری رکھیں تا کہ ان اولین مجاہدین کی یاد صدقہ جاریہ کے طور پر زندہ رہے۔

مجموعی طور پر ایک اندازے کے مطابق ایک فعال احمدی اپنی آمد کا پانچواں حصہ جماعت کو ادا کرتا ہے۔

(حضرت) خلیفہ رابع کی ولولہ انگیز قیادت میں جماعت کی تبلیغی مساعی کے نتیجے میں عالمی جماعت کی آمد میں بھی ڈرامائی اضافہ ہوا۔ لیکن یہ اضافہ بھی تیزی سے بڑھتی ہوئی ضروریات کے لئے کافی نہیں تھا۔ نئے احمدیوں کی اکثریت کا تعلق افریقہ اور ایشیا کے غریب ترین ممالک سے تھا۔ سب سے پہلے تو نئے تبلیغی مشنوں کے اخراجات کے لئے رقم کی ضرورت تھی۔ جوں جوں جماعت کی افرادی قوت بڑھ رہی تھی اسی رفتار سے نسبتاً خوشحال افراد جماعت پر مالی قربانی کے بوجھ کا اضافہ بھی ہو رہا تھا۔

مبلغین کو اگرچہ برائے نام مشاہرہ ملتا تھا پھر بھی ان کو کسی قسم کے مالی مفاد کے حصول کے لئے کاروبار یا ملازمت کی اجازت نہیں تھی تاکہ ان کی تمام تر توجہ اور ان کے اوقات ان کے فرائض منصبی کی ادائیگی ہی میں صرف ہوں۔ ڈاکٹروں، انجینیروں اور دیگر ماہرین نے بھی پرائیویٹ پریکٹس کی بجائے اپنی اپنی ماہرانہ صلاحیتوں کو تبلیغی خدمات کے لئے وقف کردیا۔ ان کے ساتھ کام کرنے والے نکنبکی کارکنوں نے بھی جو جماعت سے تعلق رکھتے تھے بلامعاوضہ اپنی خدمات پیش کردیں۔

تمام دنیا کو تبلیغ کے ذریعے احمدیت یعنی حقیقی اسلام سے روشناس کرانے اور حلقہ بگوش اسلام کرنے کے لئے رقم درکار تھی۔ چنانچہ (حضرت) خلیفہ رابع نے نہ صرف جماعت کے امیر ترین افراد سے بلکہ امیر ترین ممالک سے تعلق رکھنے والی احمدی جماعتوں کو تحریک کی کہ وہ بعض مخصوص کاموں کو اختتام تک پہنچانے کا بیڑا اٹھائیں۔ یہ کام بھی اتنے آسان نہیں تھے۔ ان میں ہاتھ ڈالنے اور انہیں بخیروخوبی سرانجام دینے کے لئے وقت کی قربانی۔ انتھک محنت اور مالی ایثار کی ضرورت تھی۔ (حضرت) خلیفہ رابع کو نظام جماعت اور اس کی ذیلی تنظیموں کے طریق کار اور اس کی پوری تفاصیل پر پورا عبور ہے۔ آپ کو مختلف تنظیموں میں نیچے سے لے کر اوپر تک ہر سطح پر خدمت کی سعادت حاصل ہو چکی ہے۔ آپ نے جلسہ سالانہ کے بعد کوڑے کرکٹ کی صفائی سے لے کر ایک جونیئر کلرک کی حیثیت تک کام کیا ہے۔ (حضرت) خلیفہ ثانی نے یکے بعد دیگرے نظام جماعت کی مختلف شاخیں اور تنظیمیں قائم فرمائیں۔ نظام سلسلہ کی اس مرحلہ وار توسیع و ترقی کے ساتھ ساتھ (حضرت) خلیفہ رابع بھی بڑھے اور پھلے پھولے۔ آپ کی شیرخوارگی، عہد طفولیت، عنفوان شباب اور پھر بھرپور جوانی کے دن اسی عہد بعہد

ترقی کے سائے میں گذرے اور آپ نے توسیع و ترقی کے اس عمل میں بذات خود بھی جی بھر کر حصہ لیا۔

سات سے چودہ سال کے بچوں کی تربیت کی ذمہ داری خدام الاحمدیہ کی تنظیم کے سپرد ہے۔ بچوں کی اپنی تنظیم ہے جو خدام الاحمدیہ کی تنظیم کے سپرد ہے۔ بچوں کی یہ تنظیم جو خدام الاحمدیہ کی زیر نگرانی کام کرتی ہے۔ اطفال الاحمدیہ کہلاتی ہے۔ جہاں کہیں بھی اس عمر کے تین یا چار احمدی بچے موجود ہوں۔ اطفال الاحمدیہ کی تنظیم کا قیام ضروری ہے۔ اور ہر احمدی بچے کی اس میں شمولیت لازمی ہے۔

اطفال الاحمدیہ کی تنظیم کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ ہر احمدی بچہ احمدیت یعنی حقیقی اسلام کی فضامیں پروان چڑھے۔

اطفال الاحمدیہ ہر قسم کے کھیلوں میں بڑھ چڑھ کر شامل ہوتے ہیں اور اپنے اپنے ملکی حالات کے مطابق عمر رسیدہ اور نادار لوگوں کی فلاح و بہبود کے مختلف کاموں کے لئے چندوں کی فراہمی میں حصہ لیتے ہیں۔ مسلسل کوشش کی جاتی ہے کہ بچے قرآن (کریم) ناظرہ اور باترجمہ پڑھیں اور سیکھیں اور بچپن ہی سے نہایت صحت مند اور پاکیزہ ماحول میں اپنے دینی فرائض کو سمجھیں تاکہ ان کی زندگیاں اسلامی تعلیمات کے مطابق نیکی اور سچائی کے سانچے میں ڈھل جائیں۔ ان کی دینی معلومات کا اندازہ کرنے کے لئے اطفال الاحمدیہ کی تنظیم کے ماتحت ان کے آپس میں مقابلے کروائے جاتے ہیں اور امتحانات لئے جاتے ہیں۔

پندرہ سال کی عمر میں اطفال الاحمدیہ کا ہر رکن یعنی ہر احمدی بچہ خود بخود خدام الاحمدیہ کا رکن بن جاتا ہے۔ یہ نوجوانوں کی تنظیم ہے جس میں پندرہ سال سے لے کر چالیس سال کی عمر کے نوجوان شامل ہوتے ہیں۔ اس مجلس کے اراکین

خدام کہلاتے ہیں جس کا مطلب ہے خدمت کرنے والے اور در حقیقت یہی ان کا کام ہے یعنی جماعت اور بنی نوع انسان کی بے لوث اور بے غرض خدمت۔

جہاں تین یا چار خدام موجود ہوں وہاں لازمی طور پر خدام الاحمدیہ کی شاخ قائم کردی جاتی ہے۔ اتنی وسیع تنظیم میں معتمد عمومی سے لے کر مہتمم مال اور مہتم تعلیم سے لے مہتمم وقار عمل تک انیس بیس مہتممین ہوتے ہیں جو اپنے اپنے شعبے کے انچارج ہوتے ہیں۔ خدام الاحمدیہ کے لائحہ عمل میں اس امر کی تاکید کی گئی ہے کہ کوشش کی جائے کہ ہر احمدی خواندہ ہو۔ اسی طرح ہر احمدی اپنے ہاتھ سے کام کرنا سیکھے۔ کیونکہ اپنے ہاتھ سے کام کرنے سے کسی کے وقار میں کمی واقع نہیں ہوتی بلکہ جماعت اور قوم کی خدمت تو ایک سعادت ہے۔ جس سے خادم کی عزت اور وقار میں اضافہ ہوتا ہے۔ حضرت خلیفہ رابع ان دنوں مجلس خدام الاحمدیہ کے فعال رکن تھے جب تقسیم ملک کے موقع پر حفاظت قادیان کے سلسلے میں آپ نے ایک تاریخی کردار ادا کیا۔ تقسیم ہند کے بعد آپ ربوہ میں آئے تو مجلس خدام الاحمدیہ مقامی کے قائد مقرر ہوئے۔ بعد میں جب آپ عالمی مجلس کے صدر منتخب ہوئے تو آپ نے مجلس کے آئین اور قواعد وضوابط کو نئے سرے سے مرتب کیا۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ مجلس خدام الاحمدیہ ایک انتہائی فعال اور سرگرم تنظیم ہے اور اس کے اراکین اپنی جوانی کی پوری ذہنی اور جسمانی صلاحیتوں سے خدمت کا بھرپور کردار ادا کر رہے ہیں۔

جب آپ چالیس سال کے ہوئے تو آپ کو مجلس انصار اللہ کی رکنیت حاصل ہوگئی۔ جس کے آپ بالآخر صدر منتخب ہوگئے۔ اگرچہ مجلس انصار اللہ کے اراکین سے زیادہ جسمانی مشقت کی توقع نہیں کی جاتی۔ لیکن پھر بھی اس کے اراکین جماعت کے کاموں میں بڑے جذبے اور انہماک سے حصہ لیتے ہیں۔

خواتین کی تنظیم لجنہ اماء اللہ کہلاتی ہے۔اس کا قیام ۱۹۲۲ء میں عمل میں آیا۔ ان دنوں اکثر مسلمان ممالک میں خواتین کی تعلیم کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی جاتی تھی۔ لجنہ اماء اللہ کا لائحہ عمل اور قواعد وضوابط دیگر ذیلی تنظیموں سے ملتے جلتے ہیں۔ اغراض ومقاصد سب تنظیموں کے یکساں ہیں البتہ لجنہ اماء اللہ میں تعلیم وتربیت پر زور دیا جاتا ہے۔ کوشش کی جاتی ہے کہ خواتین کی شرح خواندگی سو فیصد ہو جائے۔ کیونکہ الاماشاء اللہ بچے کی تعلیم وتربیت کی اصل درسگاہ ماں کی گود ہی تو ہے۔

ختم القرآن کی تقریب بھی بڑی دلچسپ ہوتی ہے جب بچہ قرآن (کریم) ناظرہ کا پہلا دور ختم کرتا ہے تو گھر بھر میں ایک گونہ عید اور جشن کا ساسماں بندھ جاتا ہے۔ بچے کو نئے کپڑے پہنائے جاتے ہیں اور یہاں لندن مسجد میں تو بچہ قرآن (کریم) کا آخری صفحہ عموماً (حضرت) خلیفہ رابع کی موجودگی بلکہ راہنمائی میں دہراتا ہے۔ اور ساری جماعت اس خوشی کی تقریب میں شامل ہو جاتی ہے۔ والدین پھولے نہیں سماتے اور حاضرین میں مٹھائی تقسیم کی جاتی ہے۔

لجنہ اماء اللہ کے پروگراموں میں خدمت خلق کے علاوہ صحت جسمانی اور مال کے شعبے بھی قائم ہیں۔ یہ امر بجائے خود مسلمان خواتین کی کسی بھی تنظیم کے لئے ایک غیر معمولی انفرادیت کا حامل ہے۔ اگرچہ احمدی خواتین مردوں کے ساتھ مخلوط کھیلوں میں حصہ نہیں لیتیں لیکن جہاں تک کھیل برائے کھیل کا تعلق ہے۔ تیراکی' تیراندازی وغیرہ مختلف قسم کے کھیلوں میں شمولیت کے لئے انکی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔ان کے اپنے رسائل ہیں۔ جو باقاعدگی سے چھپتے ہیں۔ ان کا اپنا مالیاتی نظام ہے اور ان کی اپنی سالانہ مجلس شوریٰ ہے جس کے اجلاس عام طور پر جلسہ سالانہ کے موقعوں پر ہوتے ہیں اور دنیا بھر کی رکن مجالس کی طرف سے

پیش کردہ تجاویز پر سیر حاصل بحث ہوتی ہے۔

احمدی خواتین کی آراء کے اظہار و بیان کا یہ ادارہ ۱۹۲۲ء میں قائم کیا گیا اور تعجب کی بات یہ ہے کہ برطانیہ اور دیگر یورپین ممالک میں صرف چند ہی سال قبل خواتین کو حق رائے دہی ملا تھا۔ سوچئے تو یہ بات ایک عجوبہ معلوم ہوتی ہے۔ شروع شروع میں خواتین سالانہ مجلس مشاورت میں باقاعدہ شامل تو ہوا کرتی تھیں لیکن عام بحث و تمحیص میں اپنی رائے کا اظہار کسی مرد نمائندے کی وساطت سے کیا کرتی تھیں۔ اپنی رائے قائم کرتے وقت وہ زیر بحث مسائل پر وہ خود تو بات نہیں کر سکتی تھیں لیکن انکی موجودگی میں ایک نمائندہ ان کی طرف سے انکی مجموعی رائے کا اظہار کیا کرتا تھا۔

خلافت رابعہ کے انتخاب کے بعد جلد ہی یہ تفریق اور پابندی بھی ختم کر دی گئی اور مجلس مشاورت کے ایوان میں خواتین نمائندگان کی آواز بھی سنائی دی جانے لگی اور وہ مجلس مشاورت میں زیر بحث مسائل پر اپنی آراء کا بلاواسطہ کھل کر اظہار کرنے لگیں۔ قیاس کہتا ہے کہ اس قسم کا غیر معمولی فیصلہ کرتے وقت (حضرت) ام طاہر یعنی اپنی والدہ محترمہ کا نمونہ اور نقطہ نگاہ (حضرت) خلیفہ رابع کے پیش نظر رہا ہو گا۔ جو سال ہا سال تادم آخر لجنہ اماء اللہ مرکزیہ کی صدارت کے فرائض نہایت خوش اسلوبی اور کامیابی سے ادا کرتی رہیں۔ ان ہی کے دور صدارت میں لجنہ کے طریق کار اور معمول میں متعدد اصلاحات نافذ کی گئیں۔

جماعت احمدیہ کے جملہ اراکین پر مشتمل یہ وہ سماجی اور جماعتی ادارے تھے جن کی بنیاد پر (حضرت) خلیفہ رابع کو توسیع و ترقی کی بلند و بالا عمارت استوار کرنا تھی۔ چنانچہ آپ نے جماعت سے مطالبہ کیا کہ "احمدیت کی دوسری صدی میں داخل ہونے کے لئے مجھے ایک لاکھ نئے احمدی درکار ہیں"۔

آپ نے فرمایا کہ اگرچہ نئی بیعتوں کی رفتار تیز ہو گئی ہے اور ان ممالک میں جہاں سے اسلام کا نام و نشان تک مٹ چکا تھا یا جہاں ابھی تک اسلام کی تبلیغ نہیں پہنچ پائی تھی وہاں اب یکے بعد دیگرے بہت سی نئی مساجد تعمیر کی جا چکی ہیں یا ان کی تعمیر نو جاری ہے۔ اور اس میں بھی شک نہیں کہ قرآن (کریم) کے نئی سے نئی زبانوں میں ترجمے کئے جا رہے ہیں لیکن بایں ہمہ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ وقت کم ہے اور کام بہت۔ سستی اور سہل انگاری کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ سرتوڑ محنت کریں۔ جماعت احمدیہ کو آئندہ دو سو سال میں ساری دنیا کو مشرف بہ اسلام کرنا ہے اور یاد رکھیں کہ (حضرت) مسیح موعود (علیہ السلام) کی پیشگوئی کے مطابق ایسا ہو کر رہے گا۔

☆ ☆ ☆

19

اَمْرُهُمْ شُوْرٰی بَیْنَهُمْ

ذیلی تنظیموں کی طرح مرکزی نظام جماعت بھی نہایت مربوط۔ باقاعدہ اور منظم بنیادوں پر قائم ہے۔ جماعت احمدیہ کا مرکزی نظام حقیقی معنوں میں ایک بین الاقوامی نظام ہے۔ عالمی جماعت احمدیہ کے ماتحت ہر ملک کا اپنا اپنا ایک قومی نظام بھی ہے۔ جو صوبوں، ضلعوں اور درجہ بدرجہ شہروں، قصبوں اور دیہات کی جماعتوں میں مرحلہ وار بٹا ہوا ہے۔ ہر جماعت اپنے اپنے حلقے اور دائرہ کار میں رہتے ہوئے نظام سلسلہ اور ذیلی تنظیموں کے پروگرام کی بجا آوری اور تکمیل کے لئے سرگرم عمل رہتی ہے۔

ہر جماعت کو ضلعی یا علاقائی مجلس عاملہ میں اور ہر ضلعی جماعت کو ملکی مجلس عاملہ میں نمائندگی دی جاتی ہے۔ اسی طرح ہر ملک کی جماعت کی عالمی مجلس عاملہ میں باقاعدہ نمائندگی ہوتی ہے۔ ہر ملک کی جماعت کو اپنے اراکین کی تعداد کی بناء پر عالمی مجلس مشاورت میں نمائندے بھیجنے کا حق حاصل ہے۔ مجلس مشاورت کے

اجلاس ہر سال جماعت کے جلسہ سالانہ کے موقع پر منعقد ہوتے ہیں۔ اور دو سے چار دن تک جاری رہتے ہیں۔ (حضرت) خلیفہ رابع بنفس نفیس ان اجلاسوں کی صدارت فرماتے ہیں۔

اسی طرح ہر ملک کی قومی مجلس مشاورت کے اجلاس کی کارروائی بھی اس ملک کے نیشنل امیر کی زیر صدارت انجام پذیر ہوتی ہے۔

مجلس مشاورت جماعت احمدیہ کا ایک عظیم، منفرد اور نمائندہ ادارہ ہے۔ یہ جمہوری ہے لیکن اسے کلیتہً جمہوری بھی نہیں کہہ سکتے۔ یہ آزاد ہے لیکن بالکل آزاد بھی نہیں۔ عالم اسلام کے پس منظر میں یہ جتنا انوکھا اور جدید ہے۔ اتنا ہی قدیم بھی ہے۔ اس کا منبع و ماخذ مشاورت کی وہ مجالس ہیں جو بانی اسلام (آنحضرت ﷺ) نے اپنی (مبارک) زندگی میں خود طلب فرمائی۔

افریقہ اور ایشیا کے نو آزاد ملکوں میں مغربی قسم کی جمہوریت کا تجربہ بالعموم ناکام رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جماعت احمدیہ کی مجالس شوریٰ کی باوقار۔ مؤثر اور مربوط کارکردگی سے متاثر ہو کر ان ممالک کے بہت سے سیاسی قائدین اسے للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا کرتے ہیں۔ سیاسی تناظر میں اس قسم کی مجلس مشاورت کے امکان پر بعض قائدین نے تو (حضرت) خلیفہ رابع سے تبادلہ خیال بھی کیا ہے۔ مغربی افریقہ کے ایک ملک کے صدر نے تو اپنے ملک سے رخصت ہونے والی استعماری طاقت یعنی برطانیہ کا شکوہ کرتے ہوئے برملا اعتراف کیا کہ ہم ابھی پارلیمانی جمہوریت کے تقاضوں سے پورے طور پر عہدہ برآ ہونے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ ہمیں تو کسی ایسے نظام کی ضرورت ہے جو جماعت احمدیہ کی مشاورت کے طریق کار سے ملتا جلتا ہو۔

اپنے مؤقف کی تائید میں موصوف نے جو دلائل دیئے وہ یہ تھے۔ جمہوریت

کا مطلب ہے ایک کس۔ ایک ووٹ لیکن جہاں رائے دہندگان کی غالب اکثریت جاہل اور ان پڑھ ہو اور قبائلی سرداروں کی مرضی کی غلام ہو۔ وہاں اس قسم کی جمہوریت ایک ڈھکوسلا بن کر رہ جاتی ہے۔ فساد۔ بددیانتی اور رشوت ستانی لوگوں کا اوڑھنا بچھونا بن جاتی ہے۔ قبائل میں باہمی مسابقت کی ایک دوڑ شروع ہو جاتی ہے۔ ہر قبیلہ قومی وسائل کی بندر بانٹ میں اپنی اپنی تجوریاں بھرنا چاہتا ہے۔ ان پُر آشوب حالات میں اگر کوئی سیاسی طالع آزما اپنی آمریت مسلط کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے تو کیا جرنیل اور کیا ائرمارشل بلکہ معمولی سا ایک سارجنٹ بھی اپنی آمریت کے خواب دیکھنے لگتا ہے۔

مغربی جمہوریت کا حال بھی اس سے چنداں مختلف نہیں۔ جمہوریت کے حمام میں سب ننگے ہیں۔ مغرب کی کسی بھی پارلیمانی جمہوریت کو لے لیجئے۔ بنیادی طور پر وہاں بھی یہی نظارہ نظر آتا ہے۔ مسئلہ زیر بحث کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ حزب اقتدار اور حزب اختلاف کے اراکین ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی دھن میں ضد کی پٹی آنکھوں پر باندھ کر انہی گھسے پٹے دلائل کو گلا پھاڑ پھاڑ کر دھراتے چلے جاتے ہیں جنہیں پہلے بھی دھرایا جا چکا ہوتا ہے۔ اور جنہیں سن سن کر سامعین اکتا چکے ہوتے ہیں۔ اور وہ سماں تو قابل دید اور حیرت ناک حد تک ناقابل یقین ہوتا ہے۔ جب ایوان میں تقسیم آراء کے وقت پارٹیوں کے WHIP (یعنی پارٹی کے تازیانہ بردار نگران) انہیں بھیڑ بکریوں کی طرح ہانک کر ہاں یا نہ کے متعلقہ کمروں میں لے جاتے ہیں۔ ان لوگوں نے جاگتی آنکھوں یہ نظارہ بھی دیکھا ہے کہ جماعت احمدیہ کی مجلس مشاورت ایک خاص وقار، باہمی تعاون، یگانگت، آزادی، پیار اور محبت کی حسین فضا میں اپنے فرائض کو کتنی خوش اسلوبی سے ادا کرتی چلی آرہی ہے۔

اپریل ۱۹۲۲ء میں جماعت احمدیہ کی پہلی مجلس مشاورت سے خطاب کرتے ہوئے (حضرت) خلیفہ ثانیؓ نے فرمایا:

"اس میں کوئی شک نہیں کہ آج دنیا کی نظروں میں ہماری مجلس مشاورت کی کوئی قابل ذکر حیثیت نہیں۔ لیکن وقت آتا ہے جب بڑی سے بڑی دنیوی پارلیمنٹ کو بھی ہماری اس مجلس مشاورت پر فوقیت نہیں دی جاسکے گی...... بادشاہ اور صدران مملکت فخر کیا کریں گے کہ انہیں مجلس مشاورت میں شمولیت کی دعوت دی گئی"۔

مجلس مشاورت کسی قسم کی مجلس مناظرہ نہیں ہے۔ یہ ایک ایسا معزز ایوان ہے۔ جس میں بحث و تمحیص کے بعد ایک اجماعی رائے تک پہنچنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس قسم کی مجلس مشاورت کی مؤثر کارکردگی کے راستے میں صرف ایک مشکل حائل ہے۔ یعنی ضروری ہے کہ اسے ایک ایسے کریم النفس اور مطاع قائد کی راہنمائی حاصل ہو جس کی نیکی، سچائی اور قائدانہ صلاحیتوں کے نہ صرف اراکین مجلس بلکہ چھوٹے بڑے سب کے سب رائے دہندگان بھی گواہ ہوں اور اس کی فیصلہ کن حیثیت کو دل و جان سے قبول کرتے ہوں۔ یہ ایک بالکل منفرد تصور ہے۔ اور جہاں تک جماعت احمدیہ کا تعلق ہے۔ اس تصور کا کسی بھی قسم کا "مشفقانہ آمریت" سے دور کا واسطہ بھی نہیں ہے۔ عالمی مجلس مشاورت کے اجلاس عموماً جلسہ سالانہ کے فوراً بعد منعقد ہوتے ہیں۔ لیکن اگر (حضرت) خلیفۃ المسیح چاہیں تو یہ اجلاس کسی وقت بھی بلائے جاسکتے ہیں۔ (حضرت) مرزا طاہر احمد نے خلافت رابعہ کے منصب پر فائز ہوتے ہی فیصلہ فرمایا کہ آئندہ سے خواتین اپنے نمائندے کی وساطت سے بالواسطہ نہیں بلکہ مجلس کے ایوان

ہیں موجودرہ کر براہ راست اور بلاواسطہ اس کے اجلاسوں میں شریک ہوا کریں گی۔ چنانچہ خواتین کے لئے اجلاس کے اندر باقاعدہ پردے اور محدود داخلی ٹیلیویژن اور ہیڈ فونوں کا انتظام کردیا گیا۔ جس کے نتیجے میں خواتین نے مجلس کی کارروائی میں زیادہ مؤثر اور فعال طریق سے حصہ لینا شروع کردیا۔

عالمی مجلس مشاورت کا طریق کار کچھ اس طرح سے ہے ہر ملک کی نیشنل مجلس مشاورت اپنی متفقہ تجاویز کو انٹرنیشنل مجلس مشاورت میں بھیجنے کی مجاز ہے۔ یہ تجاویز جماعت کے کسی موجودہ مسئلہ یا آئندہ کی حکمت عملی سے متعلق ہوتی ہیں۔ انتظامی امور سے ان کا تعلق نہیں ہوتا۔ انتظامی امور طے کرنے کے لئے الگ طریق کار اور قواعد و ضوابط موجود ہیں۔ مجلس مشاورت میں پیش کردہ ہر تجویز پر شرح و بسط سے غور کرنے کے لئے ایوانوں کی طرف سے کمیٹیاں مقرر کی جاتی ہیں۔ جن کی رکنیت کے لئے یا تو اراکین مجلس اپنے اپنے تجربے اور دلچسپی کے مطابق خود اپنا نام پیش کرتے ہیں یا ان کے نام ان کے نیشنل امیر کی طرف سے پیش کئے جاتے ہیں۔

کمیٹیوں کی تشکیل کے بعد بڑی دلچسپ صورت حال پیدا ہو جاتی ہے۔ کم و بیش تقریباً سب کے سب اراکین مجلس کسی نہ کسی کمیٹی کے رکن نامزد ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد یہ کمیٹیاں مقررہ وقت اور جگہ پر اپنی متعلقہ تجاویز پر غور و فکر کے لئے اجلاس منعقد کرتی ہیں۔ کوئی رکن بیک وقت ایک سے زیادہ کمیٹیوں کا ممبر نہیں بن سکتا۔

زیر غور آنے والی تجاویز کے ساتھ ساتھ کچھ ہدایات بھی طبع کروا کر شائع کی جاتی ہیں۔ جو مجلس میں شمولیت کے آداب کے متعلق ہوتی ہیں۔ جن کے ذریعے سے اراکین مجلس سے گذارش کی جاتی ہے کہ آپ مجلس مشاورت میں ایک

نہایت ارفع مقصد کی خاطر شمولیت کر رہے ہیں۔ آپ کے یہاں تشریف لانے کا ایک خاص مقصد ہے۔ آپ حسن نیت اور اخلاص سے جماعت کی خدمت کے لئے حاضر ہوئے ہیں۔ اس لئے آپ کو چاہئے کہ آپ بلاخوف وخطر صمیم قلب سے اپنی بے لاگ اور مخلصانہ رائے کا اظہار فرمائیں۔ اپنی اپنی صوابدید اور تجربے کی روشنی میں بات کریں۔ آپ کی رائے بے لاگ ہو اور اس میں جنبہ داری اور مفاد پرستی کا شائبہ تک نہ ہو۔ یاد رکھیں حقائق کے مقابلے پر ذاتی پسند ناپسند اور خواہشات کی کچھ بھی حیثیت نہیں۔

یہ امر بھی ملحوظ خاطر رکھیں کہ ایک ہی دلیل کو بار بار دہرانے کی کوشش نہ فرمائیں تا کہ اس معزز ایوان کا وقت ضائع نہ ہو۔ مجلس مشاورت کی قائم کردہ کمیٹیاں پوری بحث وتمحیص اور غور وخوض کے بعد زیر بحث تجاویز کے بارے میں کسی حتمی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کرتی ہیں اور وقت مقررہ کے اندر اپنی اپنی سفارشات ایوان کے سامنے پیش کردیتی ہیں۔ ان سفارشات کو کمیٹیوں کے صدر صاحبان ایوان میں پیش کرتے ہیں۔ ایوان میں موجود اراکین کمیٹی کی سفارشات پر اپنی اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں اور خوب کھل کر بحث ہوتی ہے اب اس بحث میں چیئرمین کے علاوہ کسی کمیٹی کے دیگر اراکین حصہ نہیں لے سکتے۔ البتہ وہ اراکین کمیٹی حصہ لے سکتے ہیں جنہوں نے کمیٹی کے مجموعی فیصلہ سے اختلاف کیا ہو اور چیئرمین سے کہہ کر اپنی اختلافی رائے کے اظہار کا حق محفوظ کرالیا ہو۔

ان تجاویز پر عام بحث مقررہ وقت کے اندر اندر ختم ہو جاتی ہے۔ آراء شماری ہاتھ اٹھا کر کی جاتی ہے۔ مجلس مشاورت کی سفارشات بالآخر (حضرت) خلیفۃ المسیح کی خدمت میں پیش کی جاتی ہیں جو دعا اور غور وفکر کے بعد اپنا فیصلہ صادر فرما دیتے ہیں۔

اس کی متعدد صورتیں ہیں۔ آپ مجلس کی کسی سفارش کو اس کی اصل شکل میں قبول فرما سکتے ہیں۔ کسی سفارش کے کچھ حصے کو منظور اور کچھ حصے کی ترمیم کر سکتے ہیں۔ اگر محسوس فرمائیں کہ مسئلہ زیر نظر پر مزید غور و خوض اور تفحص کی ضرورت ہے تو اس مقصد کے لئے ایک اور سب کمیٹی مقرر فرما دیتے ہیں جسے وقت مقررہ کے اندر اپنی رپورٹ پیش کرنا ہوتی ہے اور اگر آپ کی رائے میں مجلس مشاورت کی کوئی سفارش جماعت احمدیہ کے حقیقی مفاد میں نہ ہو یا اسلام کے کسی اصول یا نص سے متصادم ہو تو آپ دلائل کے ساتھ اسے کلیتہً مسترد فرما دیتے ہیں آپ کا فیصلہ آخری اور حتمی ہوتا ہے اور اسے چیلنج نہیں کیا جا سکتا

ایک عالم دین نے اس پر یہ تبصرہ کیا:

"خلافت جمہوریت نہیں۔ جمہوریت میں رائے دہندگان کسی سیاسی لیڈر کو ایک معینہ مدت کے لئے منتخب کرتے ہیں۔ لیڈر مرد ہو یا عورت کم از کم فطری طور پر اس سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ منتخب ہونے کے بعد وہ اپنے لائحہ عمل کو اپنے انتخابی منشور کے خطوط پر ہی استوار کرے گا۔

خلافت آمریت بھی نہیں۔ آمر تو مطلق العنان ہوتا ہے۔ اپنی من مانی کر سکتا ہے۔ آئین اور قانون کو جب چاہے توڑ مروڑ سکتا ہے۔ لیکن اس کی حاکمیت اقتدار کے سرچشموں اور ماخذ کی محتاج اور دست نگر رہا کرتی ہے۔ عمر رسیدہ ہونے کے ساتھ ساتھ اس کے اقتدار کو بھی گھن لگنا شروع ہو جاتا ہے حالات پر گرفت ڈھیلی ہونے پر اکثر اس کا تختہ الٹ دیا جاتا ہے۔ اس کی وفات کے بعد ایک بہت بڑا

رد عمل ہوتا ہے اور جمہوریت کو واپس لانے کی مہم از سر نو شروع ہو جاتی ہے، لیکن خلافت کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ اگرچہ خلیفہ وقت انتہائی محترم، محبوب اور واجب الاطاعت شخصیت کا مالک ہوتا ہے۔ لیکن شرعاً اس پر لازم ہے کہ وہ اپنی جماعت کے اہل الرائے افراد سے مشورہ طلب کرے اور جب وہ کوئی فیصلہ صادر کردے خواہ وہ فیصلہ کتنا ہی خلاف توقع کیوں نہ ہو تو جماعت کا فرض ہے کہ صمیم قلب سے سر تسلیم خم کردے۔ کسی فیصلے پر عمل درآمد سے گریز یا عدم اطاعت کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

یہ فیصلے آسمان کے نور اور ہدایت کی روشنی میں کیے جاتے ہیں۔ بڑھاپا فیصلہ کرنے والے کی وقعت، عزت اور حرمت پر اثر انداز نہیں ہوتا۔ خلیفہ وقت کو معزول نہیں کیا جاسکتا اور نہ ہی وہ اپنے آپ کو معزول کر سکتا ہے۔

وہ آخری سانس تک خلافت کے منصب پر فائز رہتا ہے لیکن کامل مطاع اور واجب الاطاعت امام ہونے کے باوجود اسے ہرگز یہ اختیار حاصل نہیں کہ وہ قانون شریعت میں کوئی معمولی سا ردوبدل بھی کر سکے۔ قانون کی پابندی اس پر شرعاً فرض ہے۔ شریعت اسلامیہ میں کوئی تبدیلی یا تصرف نہیں کیا جاسکتا۔ یہ آسمان سے نازل ہونے والا آخری قانون ہے"۔

جن دنوں افریقہ کے ایک ملک میں یہ بحث زور شور سے جاری تھی کہ ایک جماعتی نظام جاری رہے یا مغربی جمہوریتوں سے ملتا جلتا کثیر جماعتی نظام نئے سرے

سے رائج کیا جائے تو کابینہ کا ایک سینئر وزیر (حضرت) خلیفہ رابع کی خدمت میں مشورے اور راہنمائی کے لئے حاضر ہوا۔

آپ نے اس سلسلے میں فرمایا:

"میں نے اسے کثیر جماعتی نظام کے نقائص سے خبردار کرتے ہوئے بتایا کہ ہوتا یہ ہے کہ حکومت کے خلاف ایک منفی محاذ قائم ہو جاتا ہے جس کی عمارت اعلیٰ قدروں کی بجائے مخالفت برائے مخالفت کے اصول پر مبنی ہوتی ہے۔ سوچو تو سہی کہ اگر ملک بھر کو منفی تنقید کی عادت پڑ جائے تو انجام کار لوگوں کے فکر و ذہن پر اس کا کیا اثر مرتب ہو گا؟

کثیر جماعتی نظام میں سکھایا تو یہی جاتا ہے کہ جب کسی مسئلے پر بحث چل رہی ہو تو جھوٹی سچی جو دلیل بھی آپ دیں قومی مفاد کو فائدہ پہنچے یا نقصان۔ لیکن ضروری ہوتا ہے کہ جماعتی اور گروہی مفاد کو کسی قسم کا نقصان نہ پہنچنے پائے۔ اس لفظی جنگ کا مقصد صرف اور صرف یہ ہوتا ہے کہ آپ کی پارٹی پھر اقتدار کی مسند پر قابض ہو جائے۔ بحث کے دوران قومی مفاد کا ذکر تو بار بار آتا ہے لیکن مقصد کچھ اور ہوتا ہے یعنی ہاتھی کے دانت کھانے کے اور دکھانے کے اور۔

میں نے وزیر موصوف کو بتایا کہ اسلامی مشاورتی اداروں کا تصور اس سے مختلف ہے اس کے مطابق آپ کی جدوجہد اور وفاداریاں کسی حزب یا پارٹی کی بجائے اصولوں اور مسئلہ زیر بحث کے صحیح اور حتمی حل کی تلاش پر مرکوز

ہو جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری مجلس مشاورت میں کسی دلیل کو بار بار دہرایا نہیں جاتا۔ اور اگر ایوان میں ایک بار ایک دلیل پیش کردی جائے تو بعد میں آنے والا مقرر آرام سے کھڑا ہو کر کہہ دیتا ہے کہ یہی بات مجھے کہنا تھی جواب کہی جاچکی ہے۔ اس لئے میں اس کے دہرانے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ یہ کہہ کروہ شرح صدر سے اپنی نشست پر جابیٹھتا ہے۔

یہی وجہ ہے ہماری مجلس شوریٰ میں دلائل کے بے مصرف تکرار اور نظام سلسلہ پر بے موقع نکتہ چینی کی بجائے ہمیشہ اصل مقصد مدنظر رہتا ہے اور باہم مل کر اکٹھی سوچ کے ساتھ کسی زیر بحث مسئلے کے صحیح اور مؤثر حل تک پہنچنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

بظاہر وجہ نظر نہیں آتی کہ ایک دنیوی نظام میں بھی اس سے ملتا جلتا تجربہ کیوں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اس کے لئے کسی ایسی شخصیت کی ضرورت ہوگی۔ جو اجتماعی رائے کے مطابق کاروبار سلطنت چلا سکے۔ خاتون ہو یا مرد، وہ اپنے اقتدار کے لئے کسی گروہی سہارے کا محتاج نہ ہو۔ اپنی عقل ودانش، معاملہ فہمی، اور اخلاص میں سب سے افضل ہو۔ صدق دل سے قومی مفاد کا تحفظ کرنے والا ہو۔ اور ان صفات حسنہ کی وجہ سے اس کی شخصیت خود بخود نہ کہ کسی ذاتی خواہش کی بناء پر کھل کر قوم کے سامنے آجائے۔ اس قسم

کے نظام میں سچی اور صائب رائے، صحت مند انداز فکر اور اعلیٰ اقدار اور فضائل کا حصول اور قیام آسان ہو جاتا ہے۔ آپ ذاتیات سے بالا ہو جاتے ہیں اور ذاتی تعلق کی بناء پر آپ کسی فرد کی حمایت کرتے ہیں نہ ہی کسی پارٹی کی۔

اس قسم کے غیر گروہی نظام میں قومی مفاد کے وسیع تر تناظر میں جوہر قابل کا انتخاب آسانی سے کیا جا سکتا ہے۔ ہماری مجلس مشاورت کا راہنما اصول فقط یہ ہے کہ آپ افراد کی خاطر نہیں بلکہ سچائی کی خاطر اٹھ کھڑے ہوں۔ یہاں تک کہ سچائی فتح یاب ہو جائے۔"

فرمایا: "اس قسم کے صحت مند نظام کے قیام میں وقت لگے گا کیونکہ اس وقت معاشرہ بحیثیت مجموعی ایک بیمار معاشرہ ہے۔ اس لئے لامحالہ آپ کو دونوں جانب سے جدوجہد کرنا ہو گی۔ یہ نیا نظام بتدریج متعارف کروانا ہو گا۔ یہاں تک کہ بالآخر وہ ایسی سوچ پیدا کرنے پر منتج ہو جائے جو اس قسم کے نظام کو کامیابی سے چلانے کے لئے ضروری ہے۔ جب ہر چیز مسخ اور برباد ہو چکی ہو تو دو ہی راستے باقی رہ جاتے ہیں یا تو اپنے آپ کو بھی برباد کر لیا جائے یا پھر حکمت اور دانش سے کام لے کر کسی باقاعدہ سوچے سمجھے منصوبے کے تحت حالات کی بتدریج اصلاح کی جائے۔ یاد رکھیں اس قسم کی معیاری قلب ماہیت صرف اور صرف اسلام ہی کے طفیل ممکن ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے۔ اسلامی نظام "غیر جماعتی" نظام

ہے۔ اس نظام کے ماتحت آپ کی جدوجہد کسی عارضی یا محدود کامیابی کے لئے نہیں ہوا کرتی۔ آپ کسی مخصوص گروہ یا طبقے یا نسل یا چند ایک نسلوں کے لئے سردھڑ کی بازی نہیں لگا دیتے۔ آپ کی منزل تو بہت دور کی منزل ہوا کرتی ہے۔ جو کئی صدیوں پر ممتد کہیں بہت بعد میں جا کر ممکن الحصول ہوتی ہے۔"

فرمایا:

"ہم تو لمبی دوڑ دوڑنے والے کھلاڑی ہیں۔ نہ ہم بے صبرے ہیں اور نہ ہی شکست کے مفہوم سے آشنا ہیں۔ زود یا بدیر ہم اپنی منزل کو پا کر رہیں گے۔ انشاء اللہ۔ یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہئے کہ محض منزل کے حصول کی وہ اہمیت نہیں جو اہمیت اس مخلصانہ جدوجہد کی ہے۔ جو ہم منزل تک پہنچنے کے لئے کرتے ہیں۔ منزل کتنی ہی دور کیوں نہ ہو۔ ایک نسل کے فاصلے پر ہو یا ایک سو نسلوں کی دوری پر۔ اگر آپ اس تک پہنچنے کی پوری کوشش کرتے ہوئے راستے ہی میں جان دے دیتے ہیں تو سمجھ لیں کہ آپ نے اپنے مقصد کو پا لیا۔ اور آپ فتح و نصرت سے ہمکنار ہو گئے۔

ایسی موت کو موت نہیں کہہ سکتے۔ دنیا اس اطمینان اور روحانی لذت اور سرور کا تصور بھی نہیں کر سکتی جو اس قسم کی موت کے نتیجے میں حاصل ہوا کرتا ہے۔ یاد رکھیں۔ پوری نسل بلکہ نسل کی نسل اور اس کے آنے والی نسل

در نسل بھی کیوں نہ گذر جائے۔ فتح بالآخران روحانی قدروں ہی کی ہوگی جن کا دوسرا نام احمدیت اور حقیقی اسلام ہے۔ میں اور میرے ساتھی جانتے ہیں کہ ہم لحہ بہ لحہ قدم بقدم اس فتح کی منزل کے قریب تر ہو رہے ہیں لیکن ہم اتنے سادہ لوح بھی نہیں ہیں کہ یہ یقین کرلیں کہ ہماری زندگیوں ہی میں اور اسی نسل کے جیتے جی یہ روحانی انقلاب برپا ہو جائے گا۔ ہمارا مقصد بلند اور منزل دور بہت دور ہے ہمارا فرض فقط یہ ہے کہ جس طرح بن پڑے، کام اور کام کرتے چلے جائیں۔ یہ انقلاب حقیقی بالآخر برپا ہو کر رہے گا۔ کوئی نہیں جو اس کو روک سکے۔ انشاءاللہ (تعالیٰ)

جماعت کے دس بڑے بڑے محکمے ایسے ہیں۔ جن کے سربراہ (حضرت) خلیفہ رابع کے سامنے براہ راست جواب دہ ہیں۔

جماعت کے ایک عہدیدار نے ایک انٹرویو کے دوران جماعتی نظام کا مختصر تعارف ان الفاظ میں کروایا:۔

"سب سے پہلے تعمیل و تنفیذ کا محکمہ ہے۔ جس کا سربراہ (حضرت) خلیفہ رابع کے ارشادات کی تعمیل و تنفیذ کی نگرانی کرتا ہے۔ پھر مختلف محکموں کے سربراہ ہیں۔ جماعت کی روحانی تعلیم و تربیت۔ علوم دینیہ کی تدریس۔ اساتذہ۔ علماء اور مبلغین اور مبشرین کی فراہمی۔ بنیادی تعلیم۔ تصنیف و اشاعت۔ اخبارات و رسائل سب کے لئے الگ الگ انتظامات ہیں۔ پھر عملے کی دیکھ بھال اور اس سے متعلقہ

امور کی نگرانی کا محکمہ ہے۔ جسے نظارت دیوان کہہ سکتے ہیں۔ پھر ناظر بیت المال آمد اور ناظر بیت المال خرچ ہیں۔ پھر جماعت کی املاک کی نگرانی کے لئے الگ محکمہ ہے۔ اسی طرح مبلغین کی ٹریننگ اور جلسہ سالانہ کے لئے الگ الگ محکمے ہیں۔ اس کے علاوہ قضاء کا محکمہ اور اس کا ماتحت عدالتی نظام ہے۔ جس کے تحت قاضی لین دین سے متعلق احمدیوں کے ان باہمی دیوانی تنازعات کو شرع کی روشنی میں نپٹاتے ہیں جو ملکی قانون کے مطابق قابل دست اندازی پولیس نہیں ہوتے لیکن اسلامی فقہ کے مطابق جرائم میں داخل ہیں۔ میاں بیوی کے باہمی تنازعات بھی انہی عدالتوں میں پیش ہوتے ہیں۔ کوشش تو یہی کی جاتی ہے کہ باہمی افہام و تفہیم سے صلح صفائی کی صورت پیدا ہو جائے۔ لیکن اگر فریقین تنسیخ نکاح پر مصر ہوں تو ان کے مؤقف کو سن کر قاضی طلاق یا خلع کے حق میں فیصلہ دے دیتا ہے۔ جس کی روشنی میں فریقین سرکاری عدالت میں پیش ہو کر تنسیخ نکاح کا باقاعدہ فیصلہ کروا لیتے ہیں۔

قضاء کے فیصلوں کے خلاف اپیل کا حق محفوظ رہتا ہے۔ مرافعہ اول کو سننے والا بورڈ تین قاضیوں پر مشتمل ہوتا ہے اس کے فیصلے کے خلاف اپیل کی سماعت پانچ قاضیوں پر مشتمل بورڈ کرتا ہے جس کی توثیق سے آخری اپیل خلیفہ وقت کے سامنے پیش کی جا سکتی ہے۔

ان مقدمات کے سلسلہ میں کسی مرحلے پر بھی کوئی فیس وصول نہیں کی جاتی۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ سارے کے سارے محکمے خلیفہ وقت کا ہاتھ بٹانے کے لئے قائم کئے گئے ہیں۔ یہ آپ ہی کی زیر نگرانی کام کرتے اور آپ ہی کے ارشادات کی روشنی میں اپنے اپنے فرائض سرانجام دیتے ہیں۔ آپ اپنی صوابدید کے مطابق حسب حالات قواعد میں تبدیلی بھی کر سکتے ہیں۔

ہم اس یقین پر مضبوطی سے قائم ہیں کہ اللہ (تعالیٰ) قدم قدم پر آپ کی راہنمائی فرماتا ہے۔ اس لئے خلیفہ وقت کی اطاعت دراصل اللہ (تعالیٰ) ہی کی اطاعت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جماعت احمدیہ امام وقت کے ہر اشارے کو واجب التعمیل سمجھتی ہے۔ اور یقین رکھتی ہے کہ محکمانہ قواعد وضوابط بالآخر خلیفہ وقت ہی کے وجود کا ایک رخ بلکہ حصہ ہیں"۔

20

ضیاء کا اقتدار پر قبضہ

جولائی ۱۹۷۷ء میں مسٹر بھٹو کی پیپلز پارٹی خاصی اکثریت کے ساتھ ایک بار پھر برسراقتدار آگئی تھی۔ مخالف سیاسی جماعتوں کو شکایت تھی کہ الیکشن کے دوران دھاندلی ہوئی ہے۔ وہ سڑکوں پر نکل آئی تھیں۔ ہنگامے ہو رہے تھے۔ مخالف جماعتوں اور مسٹر بھٹو کے درمیان گفت و شنید جاری تھی۔ بالآخر باہم ایک معاہدہ طے پا گیا جس کے مطابق مسٹر بھٹو اس بات پر آمادہ ہو گئے تھے کہ پیپلز پارٹی قومی اسمبلی کی کچھ نشستیں خالی چھوڑ دے۔ اس طرح اس شکایت کا ازالہ بھی مقصود تھا کہ الیکشن میں تصرف ہوا ہے۔ معاہدے کو ضبط تحریر میں لایا جا رہا تھا اور جلد اس کا اعلان ہونے والا تھا۔

صبح کے چھ بج رہے تھے کہ جنرل ضیاء الحق کمانڈر انچیف بری افواج پاکستان نے اچانک اقتدار پر قبضہ کر لیا اور مسٹر بھٹو۔ ان کے وزیروں اور نو جماعتی حزب اختلاف کے تمام لیڈروں کو گرفتار کر لیا گیا۔ جنرل ضیاء اور پانچوں علاقائی

کمانڈروں نے مارشل لاء کا اعلان کردیا۔ جنرل ضیاء نے اعلان کیا کہ نئے انتخابات نوے دن کے اندر اندر کروا دیئے جائیں گے۔ شروع شروع میں تو لوگ پُر امید تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ جنرل ضیاء سچ بول رہا ہے اور حقیقتاً چاہتا ہے کہ ملک سے رشوت ستانی اور بددیانتی کا خاتمہ ہو اور پاکستان جلد سے جلد پارلیمانی جمہوریت کی طرف واپس آجائے۔

سپاہی بالعموم اپنی زندگی سیدھے سادھے ضابطوں اور قواعد کے ماتحت گذارنے کے عادی ہوتے ہیں۔ وہ احکامات بجالاتے ہیں اور ملک کی حفاظت کرتے وقت وہ طاقت کے بل بوتے پر اپنی جیبیں بھرنے میں نہیں لگ جاتے۔ اس لئے یہ چنداں تعجب کی بات نہیں کہ وہ بددیانت اور موقع پرست سیاست دانوں کو بنظر حقارت دیکھیں اور دعویٰ کریں کہ وہ ملک کا نظم ونسق سیاست دانوں کی نسبت بدرجہا بہتر طریق پر چلا سکیں گے۔

کہتے ہیں کہ مطلق طاقت مطلقاً بددیانت بنادیتی ہے۔ کم از کم یہ قول جنرل ضیاء الحق کے متعلق تو حرف بحرف سچا ثابت ہوا۔ نوے دن ختم ہو گئے لیکن انتخابات نہ ہوئے۔ وعدوں پر وعدے ہوتے چلے گئے یہاں تک کہ جنرل ضیاء کے ساتھی جرنیل بھی بالآخر پکار اٹھے کہ جنرل ضیاء نے انہیں اُلّو بنادیا ہے۔

جنرل ضیاء نے ایک جمہوری حکومت کا تختہ الٹا تھا۔ یہ حکومت کتنی ہی بددیانت کیوں نہ ہو، تھی تو جمہوری۔ اس لئے عالمی رائے عامہ نے ضیاء کے فعل کی جی بھر کے مذمت کی۔ ان حالات میں جنرل ضیاء کی کوشش یہ تھی کہ کسی نہ کسی طرح اس کی ناجائز حکومت کو جواز کا جامہ پہنایا جاسکے۔ اس نے اس مشکل کا حل بڑی آسانی اور چابک دستی سے ڈھونڈ نکالا اور پاکستان میں بقول خود اسلام کا نفاذ کردیا۔

اس اقدام کا اسے ایک فائدہ تو یہ ہوا کہ اس نے مولویوں کی حمایت حاصل کرلی۔ اس لئے پہلے پہل تو اس نے عالمی رائے عامہ کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ اسے ملک بھر کے مذہبی رہنماؤں کی اکثریت کی حمایت حاصل ہے۔ اس کے ساتھ ہی کوڑوں اور بدنی سزاؤں کا ایک خوفناک دور شروع ہو گیا۔ اس سے جہاں بنیاد پرست خوش ہو گئے وہاں ملک کی باقی آبادی نے خوفزدہ ہو کر خاموشی اختیار کرلی۔ اب ضیاء ایک مطلق العنان ڈکٹیٹر بن چکا تھا یعنی مطلقاً بددیانت اور اپنا قانون آپ۔

ایسے مطلق العنان آمروں کا جانا پہچانا طریقہ واردات یہ بھی ہوا کرتا ہے کہ وہ عوام کی توجہ ان کے حقیقی مسائل سے ہٹانے کے لئے کسی مذہبی یا نسلی اقلیت کو چن لیتے ہیں اور تعصب کی چنگاریوں کو ہوا دیکر ان اقلیتوں کے خلاف مخالفت کی آگ بھڑکا دیتے ہیں۔

یہی کچھ ضیاء نے بھی کیا۔ ضیاء کی نظر انتخاب جماعت احمدیہ پر پڑی۔ ایک سوچی سمجھی سکیم کے ماتحت جماعت پر ایذارسانی کے دروازے کھول دیئے گئے۔ ظلم و ستم کی انتہا کر دی گئی۔ احمدیوں کی دکانیں لوٹی اور جلائی گئیں۔ مشتعل ہجوم ان کی مساجد کے تقدس کو پامال کرتے ہوئے ان پر حملہ آور ہوئے اور مساجد کے اندر داخل ہو کر انہیں توڑ پھوڑ کر رکھ دیا۔ مسٹر بھٹو نے سرکاری محکموں میں احمدی ملازمین کے خلاف امتیاز کی جو مہم شروع کی تھی اب اس میں شدت پیدا ہو گئی۔ معصوم اور بے گناہ احمدیوں کو جن کا واحد قصور یہ تھا کہ وہ احمدی تھے اور کسی قانونی یا اخلاقی کوتاہی یا جرم کے مرتکب نہیں ہوئے تھے۔ بپھرے ہوئے ہجوم اور کرائے کے غنڈوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا۔ ان کو سرعام زدوکوب کیا گیا۔ انہیں قتل کیا گیا۔ اس سارے عمل کو پولیس خاموش تماشائی بن کر دیکھتی

رہی۔ نہ ہی اس نے جرم کے ارتکاب کو روکا اور نہ ہی کسی کارروائی کی ضرورت سمجھی۔ دور جانے کی ضرورت نہیں۔ ماضی قریب میں بھی ایسا ہی تشدد اور اسی قسم کی ایذارسانی ایک اور مذہبی اقلیت کے خلاف بھی روا رکھی گئی تھی۔ سب جانتے ہیں کہ دنیا کو اس کی کتنی بڑی قیمت ادا کرنی پڑی تھی۔ (حضرت) خلیفۃ المسیح نے مظلوم احمدیوں کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا۔

"جارحیت کا جواب جارحیت سے نہ دو۔ اپنی حفاظت ضرور کرو لیکن حملہ کرنے والوں پر حملہ مت کرو نہ جسمانی طور پر اور نہ ہی زبان سے۔ یاد رکھو کہ (حضرت) مسیح موعود (علیہ السلام) نے پیش گوئی فرمائی تھی کہ تمہیں ستایا جائے گا اور تم پر ستم توڑے جائیں گے۔ گند اچھالا جائے گا لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ پیش گوئی بھی کی تھی کہ انجام کار جماعت احمدیہ ہی فتحیاب ہو گی"۔

اگرچہ (حضرت) امام جماعت احمدیہ نے جماعت کو بار بار تلقین کی کہ صبر و تحمل سے کام لیں لیکن ان مظالم پر جو امن پسند اور بے زبان احمدیوں پر توڑے جا رہے تھے، خود ان کے لئے خاموش رہنا ممکن نہ تھا۔ چنانچہ انہوں نے لگی لپٹی رکھے بغیر ضیاء کی ان ظالمانہ حرکات پر صدائے احتجاج بلند کی اور اپنے خطبات میں مسلسل اس پر کڑی نکتہ چینی کی اور اسے آڑے ہاتھوں لیا اور دو ٹوک الفاظ میں واضح کیا کہ یہ مظالم صرف احمدیوں ہی پر نہیں بلکہ سوچئے تو تمام اہل پاکستان پر بھی ڈھائے جا رہے ہیں۔ فرمایا :

سارے پاکستان کو مجروح کر رہے ہیں۔ تجارتوں کو تباہ کر رہے ہیں۔ ملک کو شریف شہریوں سے محروم کر رہے ہیں۔

رقابت کی آگ بھڑکا رہے ہیں- عداوتیں پیدا کر رہے ہیں-
خاندانوں کو تقسیم کر رہے ہیں اور امن و سلامتی کو جس کا
دوسرا نام اسلام ہے مسخ اور آلودہ کر رہے ہیں- اگر تم نے
ظلم و تعدی اور بدی کے ان راستوں کو ترک نہ کیا اور ان
مذموم حرکات سے باز نہ آئے تو یاد رکھو تم خدا تعالیٰ کے
غضب سے نہیں بچ سکو گے اور مت بھولو کہ خدا کا غضب
سخت ہیبت ناک ہوا کرتا ہے"-

ان دنوں (حضرت) خلیفہ رابع نے ایک نظم بھی لکھی (یہ نظم کتاب کے آخر میں ملاحظہ فرمائیں)- اس نظم نے ضیاء کے حاشیہ برداروں میں تہلکہ برپا کردیا- جماعت میں تقسیم کے لئے یہ نظم بار بار چھپی- احمدی بچوں نے اسے زبانی یاد کرلیا- ایک احمدی نے اس نظم پر یہ تبصرہ کیا:

"تاریخ انسانی میں ایسے لمحات بھی آتے ہیں جب ایک تقریر' ایک نظم یا ایک گیت ساری قوم میں جوش اور ولولہ پیدا کردیتا ہے- یوں لگتا ہے جیسے ایک لمحہ قبل لوگ اپنے آپ کو شکست خوردہ محسوس کرتے ہوں- ان کے اردگرد انتشار اور مایوسی کے سوا کچھ نظر نہ آتا ہو اور پھر یوں ہوتا ہے کہ ایک تقریر یا ایک نظم گرتے ہوؤں حوصلوں کو سہارا دے دیتی ہے اور پژمردہ دل یکایک امید اور یقین سے بھر جاتے ہیں-

ایسی ہی ایک تقریر ونسٹن چرچل نے بھی کی تھی جس میں انہوں نے خون' پسینے اور آنسوؤں والا عہد باندھا تھا اور

یہ خوش خبری بھی دی تھی کہ فتح بالآخران ہی کی ہوگی۔ اس
تقریر نے جادو کا سا کام کیا تھا اور اہل برطانیہ کے دل ایک نئے
عزم اور یقین سے بھر گئے تھے۔
(حضرت) خلیفۃ المسیح الرابع کی نظم نے بھی یہی کچھ کر
دکھایا۔ اس نے ہمارے دلوں میں ایک نیا حوصلہ اور ولولہ پیدا
کردیا۔ اس نے ہمارے غم واندوہ اور دکھ اور درد کو زبان
دی۔ اس نے ہماری مظلومیت کو پہچان دی اور سب سے بڑھ
کر یہ کہ اس نے ہمیں امید اور اعتماد دیا اور ہم اس یقین پر
قائم ہو گئے کہ بالآخر فتح ہماری ہی ہوگی اور ضیاء کو شکست فاش
کا منہ دیکھنا پڑے گا۔"

منظوم کلام کا ترجمہ ایک مشکل کام ہے۔ شعر کا ترجمہ ایک شاعر ہی کر سکتا ہے۔ پھر بھی ترجمے سے اصل کا مزہ اور تاثر ختم ہو کر رہ جاتا ہے۔ بلکہ ترجمہ بجائے خود ایک نئی نظم کا روپ دھار لیتا ہے۔ اپنی نظم میں (حضرت) خلیفہ رابع نے سب احمدیوں پر زور دیا کہ وہ صبرو تحمل اور حوصلے اور برداشت سے کام لیں۔ دعائیں کریں۔ اللہ سے مدد مانگیں۔ ظلم و ستم کا طوفان جس میں وہ گھرے ہوئے ہیں ان کی دردمندانہ دعاؤں سے ٹکرا کر یوں غائب ہو جائے گا جیسے وہ کبھی تھا ہی نہیں۔ ان پر کئے جانے والے مظالم کی کالی گھٹائیں چھٹ جائیں گی اور ایک پُرسکون اور روشن سویرے کی پَو پھٹے گی۔ انشاء اللہ (تعالیٰ)۔ اس لئے اپنی عاجزانہ دعاؤں میں لگے رہو۔ دعاؤں نے ہی نمرود کو نیست و نابود کیا تھا۔ دعاؤں نے ہی بڑے بڑے فرعونوں کے سر جھکا دیئے تھے۔ یاد رکھو دعا کا ہتھیار انسان کے بنائے ہوئے ہر ہتھیار سے طاقتور ہے۔ تباہی خواہ دروازے پر کھڑی دستک کیوں نہ دے رہی ہو'

امید کا دامن نہ چھوڑو بلکہ پہلے سے بڑھ کر دعاؤں میں لگ جاؤ۔ ظالم پر خدا تعالیٰ کی لعنت ضرور پڑے گی اور اسے تباہ و برباد کر کے رکھ دے گی۔

ضیاء ایک پڑھا لکھا سپاہی تھا۔ جب اسے پتہ چلا کہ اسے نمرود سے تشبیہ دی گئی ہے تو وہ غصے سے لال پیلا ہو گیا۔

جماعت کے بزرگوں نے (حضرت) خلیفہ رابع کو مشورہ دیا کہ جنرل ضیاء الحق ایک سنگدل، کینہ توز اور مغلوب الغضب شخص ہے۔ درگذر کا مادہ اس میں نہیں ہے۔ اس لئے مناسب خیال فرمائیں تو جماعت کی بقاء کی خاطر اتنی صاف گوئی سے کام نہ لیں۔ ہمیں آپ کی ضرورت ہے۔ آپ کے بغیر ہم کہیں کے نہ رہیں گے۔ آپ نہ ہوئے تو ہمارا ہونا نہ ہونا برابر ہو گا۔

(حضرت) خلیفہ رابع نے اس مشورے پر عمل کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ انہوں نے جواب دیا کہ ضیاء کے متعلق سچ بولنا اس کی مخالفت ہے تو ایسی مخالفت کو میں اپنے فرائض منصبی کا حصہ سمجھتا ہوں۔ اللہ میری مدد کرے گا اور وہ جماعت کو کبھی اکیلا نہیں چھوڑے گا۔

یہ مارچ ۱۹۸۴ء کی بات ہے۔ جماعت احمدیہ کے مرکز ربوہ میں بذریعہ ٹیلیفون ایک پیغام موصول ہوا۔ یہ پیغام امریکن سفارت خانے کی طرف سے تھا۔ اس کا مفہوم یہ تھا کہ عنقریب امریکن مشن کے ایک رکن کو ربوہ کے قریب سے گذرنے کا اتفاق ہو گا۔ اگر (حضرت) خلیفۃ المسیح ملاقات کا موقع عطا فرما سکیں تو ہم شکر گذار ہوں گے۔

(حضرت) خلیفہ رابع کے نزدیک اس ملاقات کی بظاہر کوئی وجہ نظر نہیں آتی تھی لیکن انہوں نے ملاقات کی اجازت دے دی۔ اسلام آباد میں متعین کچھ امریکی سفارت کار اجازت کے فوراً بعد ربوہ پہنچ گئے۔ ملاقات ہوئی تو یوں لگا جیسے

وہ اتفاقاً ربوہ نہ آئے ہوں بلکہ وہ عملاً ملاقات ہی کے لئے آئے ہوں۔ ان کی باتوں سے یہ بھی محسوس ہوا کہ بعض ایسے امور ان کے علم میں ہیں جن کا جماعت کے مستقبل سے گہرا تعلق ہے۔ یہ ملاقات کم وبیش ڈیڑھ گھنٹہ تک جاری رہی۔ فرمایا: "میرا ماتھا ٹھنکا کہ وہ اتنے اصرار سے کیوں معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ حکومت کے کسی ممکنہ اقدام کے خلاف جماعت کا رد عمل کیا ہو گا؟ چنانچہ میں نے بلا تامل ان سے جواباً پوچھا کہ آپ کی اس اقدام سے کیا مراد ہے؟

وہ بولے: "آپ تو جانتے ہیں کہ ہر طرف چیخ پکار کی صدائیں اٹھ رہی ہیں اور طرح طرح کے مطالبات کئے جا رہے ہیں۔ لوگ آپ کی جان کے درپے ہیں۔ ظاہر ہے کہ حکومت دباؤ میں آکر کوئی بھی قدم اٹھا سکتی ہے۔ اگر ایسی صورت حال پیدا ہوئی تو ہم یہ جاننا چاہیں گے کہ جماعت احمدیہ کا رد عمل کیا ہو گا؟"

میں نے بتایا کہ ہم تو ایک پُرامن جماعت ہیں۔ ہمارا رد عمل ہماری صالح روایات کے عین مطابق ہو گا۔ بہرحال ان کی باتوں سے اتنا ضرور ظاہر ہو گیا کہ وہ کسی بات کو چھپا رہے ہیں۔ انہیں کسی خبر کا علم ضرور ہے اور وہ اپنی رپورٹ واشنگٹن بھیجنے سے پہلے میرا عندیہ معلوم کرنا چاہتے ہیں۔

اسلام آباد میں موجود سفارتکاروں میں سے کئی لوگ (حضرت) خلیفۃ المسیح الرابع کے دیرینہ دوست تھے۔ بعض سے تو اس وقت سے جان پہچان تھی جب آپ (حضرت) خلیفۃ المسیح الثالث کے ذاتی نمائندے کی حیثیت سے اسلام آباد آیا جایا کرتے تھے اور بعض سے خلیفہ منتخب ہونے کے بعد کچھ شناسائی ہو گئی تھی۔ آپ فرماتے ہیں:

"لہٰذا میں نے طے کیا کہ کچھ دنوں کے لئے اسلام آباد چلا جاؤں اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کروں کہ کیا ہونے

والا ہے۔ چنانچہ میں اسلام آباد پہنچا اور دو ہفتے تک وہاں مقیم رہا۔ اس قیام کے دوران کئی لوگوں سے گفتگو کا موقع ملا۔ یوں بھی میرے برطانوی، فرانسیسی، کینیڈین، چینی اور دیگر کئی سفارتخانوں سے خوشگوار تعلقات تھے۔ ان لوگوں سے ملنے کا موقع ملا۔ سبھی نے بڑی خوشی اور مسرت کا اظہار کیا۔ بعض سے تو ملاقاتیں ان کے دفاتر میں ہوئیں۔ بعض سے ان کی رہائش گاہوں پر علیٰحدگی میں۔ کیونکہ یہ لوگ ضیاء حکومت سے اپنے تعلقات کو خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتے تھے۔ باتوں باتوں میں یہ اندازہ تو ہو گیا کہ کچھ نہ کچھ ہونے والا ضرور ہے لیکن قطعی طور پر کسی کو بھی کچھ معلوم نہیں تھا کہ دراصل کیا ہونے والا ہے۔

البتہ ایک بات اندھوں کو بھی صاف نظر آ رہی تھی۔ جماعت کے مخالفین کو لاریوں اور بسوں میں بھر بھر کر اسلام آباد لایا جا رہا تھا۔ خصوصاً شمالی مغربی سرحدی صوبے سے"۔

(حضرت) خلیفۃ المسیح الرابع کی رہائش گاہ کے سامنے گروہ در گروہ ہجوم جمع ہونا شروع ہو گیا تھا۔

"پھر اچانک جنرل ضیاء نے انٹیلی جنس بیورو کے ایک افسر کے ہاتھ پیغام بھجوایا کہ اگرچہ علماء بہت شور مچا رہے ہیں۔ آپ فکر نہ کریں۔ میں ایک سیاسی لیڈر سے نپٹ لوں پھر ان علماء کو بھی دیکھ لوں گا کہ وہ کتنے پانی میں ہیں۔ اس لئے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔

یہ ایک عجیب و غریب قسم کا پیغام تھا۔ اتفاق کی بات ہے کہ یہ پیغام ضیاء کا پہلا اور آخری پیغام ثابت ہوا۔ اگرچہ اس نے اس کے بعد بھی اپنا ایک ایلچی بھیجا تھا۔ اس پیغام سے یوں لگا جیسے وہ کہنا چاہتا ہو کہ مجھے اسلام آباد ہی میں ٹھہرے رہنا چاہئے اور یہ کہ پریشان ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ ضیاء کے مندرجہ بالا پیغام کے فوراً بعد انٹیلی جنس بیورو کے ایک افسر کی طرف سے مجھے ایک اور پیغام ملا جس کا لب لباب یہ تھا کہ میں بلا توقف فوراً اسلام آباد سے چلا جاؤں۔ یہ اس کا ذاتی مشورہ تھا۔

اب یہ دونوں باہم متضاد پیغامات تھے لیکن ایک بات روز روشن کی طرح عیاں تھی۔ اس افسر کو علم تھا کہ میرے متعلق کیا منصوبہ بندی کی گئی ہے۔ اس سے یہ تاثر بھی پیدا ہوتا تھا کہ افسر مذکور ایک شریف انسان ہے اور اس مکاری اور دجل میں شریک ہونا نہیں چاہتا جس کا جال پھیلایا جا رہا تھا"۔

پولیس انٹیلی جنس سے تعلق رکھنے والے ایک دوست کی طرف سے (حضرت) خلیفۃ المسیح الرابع کو ایک اور پیغام بھی ملا۔ پیغام کا خلاصہ یہ تھا:

"اسلام آباد سے فوراً چلے جائیں"۔

ایک اور صاحب بھی تھے۔ یہ فرانسیسی سفارتخانے سے تعلق رکھتے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے اوروں کی نسبت ان کی معلومات کچھ زیادہ وسیع ہیں۔ (حضرت) خلیفۃ المسیح الرابع سے انکی ملاقات ان کی رہائش گاہ پر ہوئی۔ سب جانتے ہیں فرانسیسی

زبان آج بھی دنیا بھر کی سفارتی زبان ہے۔ اہل فرانس بڑے رکھ رکھاؤ اور حکمت عملی سے بات کرنے کے ماہر ہوتے ہیں خواہ وہ انگریزی زبان ہی میں گفتگو کیوں نہ کر رہے ہوں اور حضرت خلیفۃ المسیح الرابع تو فرانسیسی نہیں بولتے تھے۔ گفتگو بظاہر اِدھر اُدھر کی باتوں تک محدود رہی۔ فرانسیسی سفارت کار نے دریافت کیا:

"آپ یہاں کب تک قیام کریں گے؟"

"دو ہفتے (حضرت) خلیفہ رابع نے جواب دیا"۔

فرانسیسی سفارت کار: "میرا خیال ہے کہ سال کے ان دنوں میں اسلام آباد کا موسم اتنا خوشگوار نہیں رہتا۔ یقیناً آپ یہی چاہتے ہوں گے کہ جلد سے جلد یہاں سے رخصت ہو جائیں"۔

یہ ملاقات صرف پندرہ منٹ تک جاری رہی۔ پھر (حضرت) خلیفۃ المسیح الرابع اپنی قیام گاہ پر پہنچ گئے اور ایک گھنٹے کے اندر اندر ربوہ روانہ ہو گئے۔

☆ ☆ ☆

21

بدنام زمانہ آرڈیننس

جمعرات کا دن تھا اور ۲۶ اپریل ۱۹۸۴ء کی تاریخ جب حکومت پاکستان کے گزٹ میں صدر پاکستان جنرل ضیاء الحق کی طرف سے مارشل لاء کا بدنام زمانہ آرڈیننس نمبر ۲۰ جاری کیا گیا تاکہ احمدیوں کو خواہ وہ قادیان کی جماعت سے تعلق رکھتے ہوں یا لاہوری جماعت سے ان کی "اسلام دشمن سرگرمیوں" سے باز رکھا جاسکے۔ آرڈیننس کے الفاظ یہ تھے:-

"ہر گاہ کہ یہ ضروری ہو گیا ہے کہ قانون میں ایسی ترمیم کی جائے جس سے احمدیوں کو خواہ وہ قادیانی جماعت سے تعلق رکھتے ہوں یا لاہوری جماعت سے انہیں ان کی اسلام دشمن سرگرمیوں سے روکا جاسکے اور ہر گاہ صدر پاکستان کو اطمینان ہے کہ ایسے وجوہ موجود ہیں جن کی وجہ سے اس بارے میں فوری اقدامات ناگزیر ہو گئے ہیں۔ لہٰذا پانچ جولائی ۱۹۷۷ء کے اعلان اور ان اختیارات کے ماتحت جو صدر پاکستان کو اس اعلان کے ذریعے حاصل ہیں۔ صدر پاکستان

مندرجہ ذیل فرمان کا اجراء اور نفاذ کرتے ہوئے خوشی محسوس کرتے ہیں۔

مختصر عنوان اور آغاز

۱۔ یہ آرڈیننس قادیانی گروپ۔ لاہوری گروپ اور احمدیوں کی خلاف اسلام سرگرمیوں (امتناع و تعزیر) آرڈیننس ۱۹۸۴ء کے نام سے موسوم ہوگا۔
۲۔ یہ فی الفور نافذ العمل ہوگا۔

آرڈیننس عدالتوں کے احکام اور فیصلوں پر غالب ہوگا۔

اس آرڈیننس کے احکام کسی عدالت کے کسی حکم یا فیصلے کے باوجود مؤثر ہوں گے۔

ایکٹ نمبر ۴۵ بابت ۱۸۶۰ء میں نئی دفعات۔

۲۹۸۔ب اور ۲۹۸۔ج کا اضافہ
مجموعہ تعزیرات پاکستان (ایکٹ نمبر ۴۵، ۱۸۶۰ کے باب ۱۵ میں) دفعہ ۲۹۸۔

الف کے بعد حسب ذیل نئی دفعات کا اضافہ کیا جائے گا۔

یعنی ۲۹۸-ب- بعض مقدس شخصیات یا مقامات کے لئے مخصوص القاب، اوصاف یا خطابات وغیرہ کا ناجائز استعمال۔

ا۔ قادیانی گروپ یا لاہوری گروپ (جو خود کو "احمدی" یا کسی دوسرے نام سے موسوم کرتے ہوں) کا کوئی فرد جو الفاظ کے ذریعے خواہ زبانی ہوں یا تحریری یا نظر آنے والی کسی علامت کے ذریعے۔

ا۔ خلفاء راشدین یا (حضرت) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے صحابی کے علاوہ کسی اور شخص کو امیر المومنین یا خلیفۃ المسلمین یا صحابی یا رضی اللہ عنہ کہہ کر پکارے۔

ب۔ (حضرت) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ازواج مطہرات کے علاوہ کسی اور کو ام المومنین کے نام سے یاد کرے یا مخاطب کرے۔

ج۔ اہل بیت کے علاوہ کسی فرد کو اہل بیت کہہ کر یاد کرے یا مخاطب کرے یا

د۔ اپنی عبادت گاہ کو مسجد کے نام سے یاد کرے یا پکارے۔

تو اسے کسی ایک قسم کی سزائے قید اتنی مدت کے لئے دی جائے گی جو تین سال تک ہو سکتی ہے اور وہ جرمانے کا بھی مستوجب ہو گا۔

۲۔ قادیانی گروپ یا لاہوری گروپ (جو خود کو احمدی یا کسی دوسرے نام سے موسوم کرتے ہوں) کا کوئی شخص جو زبانی یا تحریری الفاظ کے ذریعے یا کسی مرئی طریقے سے اپنی مذہبی عبادت کے لئے بلانے کے طریقے یا طرز کو اذان کہہ کر یاد کرے یا اس طرح اذان دے جس طرح مسلمان اذان دیتے ہیں تو اسے ایک ہی قسم کی سزائے قید اتنی مدت کے لئے دی جائے گی جو تین سال تک ہو سکتی ہے اور وہ جرمانے کا مستوجب بھی ہو گا۔

۲۹۸-ج- قادیانی گروپ وغیرہ کا شخص جو خود کو مسلمان کہے یا اپنے مذہب

کی تبلیغ یا تشہیر کرے۔

قادیانی گروپ یا لاہوری گروپ (جو خود کو احمدی یا کسی دوسرے نام سے موسوم کرتے ہیں) کا کوئی شخص جو بالواسطہ یا بلاواسطہ خود کو مسلمان ظاہر کرے یا اپنے مذہب کو اسلام کے طور پر موسوم کرے یا منسوب کرے یا الفاظ کے ذریعے خواہ زبانی ہوں یا تحریری یا کسی مرئی طریقے سے اپنے مذہب کی تبلیغ یا تشہیر کرے یا دوسروں کو اپنا مذہب قبول کرنے کی دعوت دے یا کسی بھی طریقے سے مسلمانوں کے مذہبی احساسات کو مجروح کرے تو اس کو کسی ایک قسم کی سزائے قید اتنی مدت کے لئے دی جائے گی جو تین سال تک ہو سکتی ہے اور وہ جرمانے کا بھی مستوجب ہو گا"۔

دنیا اس آرڈیننس کی خبر سن کر سکتے میں آگئی۔ خود پاکستان میں کیا وکلاء' اساتذہ اور سفارت کار اور کیا عام شہری اور کاروباری لوگ سبھی اس بات پر حیران اور ششدر رتھے کہ اب اذان اور نماز بھی جرم قرار دیئے جا چکے تھے۔ سبھی افسردہ خاطر تھے کہ ان کا وطن عزیز مذہبی تعصب' منافرت' مذہب کے نام پر مفاد پرستی کی ایک خوفناک اور بھیانک دلدل میں پھنس کر رہ گیا ہے اور ان بدنام زمانہ ممالک کی فہرست میں شامل ہو گیا ہے جن کی حکومتیں اپنا اُلّو سیدھا کرنے کے لئے اپنے شہریوں کو مذہب یا رنگ و نسل کی آڑ میں طرح طرح کے ظلم و تشدد کا نشانہ بناتی رہتی ہیں۔

یہ آرڈیننس فوجی اور تجارتی لحاظ سے بھی قابل اعتراض تھا۔ امریکہ اور دیگر مغربی ممالک کے نزدیک پاکستان کمیونزم کے خلاف ایک مضبوط دفاعی مورچے کی حیثیت رکھتا تھا۔ اب ان ممالک کی حکومتیں شش و پنج میں پڑ گئیں کہ کیا ایسے ملک کو جس میں اقلیتوں پر ستم ڈھائے جا رہے ہوں ہتھیاروں کی فراہمی اور وہ بھی

آزادی اور آزاد خیالی کے نام پر جاری رکھی جاسکتی ہے۔

وکلاء اور عدالتیں الگ پریشان تھیں۔اس خلاف عقل آرڈیننس نے قانون کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دی تھیں۔ بحیثیت مجموعی اب تک ان کی یہی کوشش رہی تھی کہ ایک جابر نظام کے علی الرغم وہ کسی نہ کسی طرح حق وانصاف کے تقاضے پورے کرتے رہیں۔

قانون دانوں کا تو ایک ہی سوال تھا کہ کسی ریاست یا حکومت کو اپنے زعم میں یہ فیصلہ کرنے کا اختیار کہاں سے اور کیسے حاصل ہو گیا کہ وہ یہ بتائے کہ اسلام کسے کہتے ہیں اور کسے نہیں کہتے؟ مسلمان علماء خواہ وہ اکثریت کی نمائندگی کے دعوے دار ہی کیوں نہ ہوں کیسے دعویٰ کر سکتے ہیں کہ قرآن (کریم) یا بالفاظ دیگر کلام الٰہی کی تشریح و تفسیر کا حق صرف اور صرف انہیں کو حاصل ہے؟

اور کسی ریاست کے پاس اس امر کا کیا جواز ہے کہ وہ اپنے پُرامن اور بے گناہ شہریوں کا یہ حق بھی سلب کرلے کہ وہ اپنے مذہبی عقیدے اور شناخت کا اعلان کرسکیں اور سب سے اہم بات تو یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے مذہب کا پابند ہو، نماز ادا کرتا ہو اور اپنے عقیدے کے تمام اوامر اور نواہی پر عمل پیرا ہو تو کوئی جج یا جیوری کیسے فیصلہ کرے گی کہ مذکورہ شخص دل سے نہیں بلکہ محض دکھاوے کے طور پر ایسا کر رہا ہے؟

سنی، شافعی، حنفی، وہابی اور احمدی غرض کہ سبھی مؤذن نماز سے پہلے اذان دیتے ہیں تو صرف احمدی مؤذن ہی کے متعلق کیوں کہا جائے کہ وہ جھوٹ موٹ مسلمان بن رہا ہے؟

اس میں تو کوئی شک نہیں کہ جماعت احمدیہ اور اسلام کے دیگر فرقوں کے درمیان بنیادی اختلاف موجود ہے لیکن یاد رہے کہ امت مسلمہ تہتر فرقوں میں

بٹی ہوئی ہے اور یہاں ہر فرقے کے علماء کسی نہ کسی موقع پر کسی دوسرے فرقے سے تعلق رکھنے والوں کے متعلق یہی فتویٰ صادر کر چکے ہیں اور انہیں کافر اور دائرہ اسلام سے خارج قرار دے چکے ہیں۔ اس صورت حال کے پیش نظر کوئی ریاست کیسے فیصلہ صادر کر سکتی ہے کہ مسلمان کون ہے اور کون نہیں؟ جبکہ سبھی مسلمان کہلانے کا دعویٰ بھی کرتے ہوں۔

یوں لگتا ہے جیسے فرض کر لیا گیا ہو کہ یہ انسانی معاشرہ نہیں آرویل (ORWELL) کا جانوروں کا انیمل فارم (Animal Farm) ہے جہاں افراد کے اندرونی خیالات تک بھی آسانی سے رسائی ہو سکتی ہے۔ جہاں ایسی ماہر پولیس موجود ہے جو لوگوں کے عقائد اور خیالات کو بڑی مہارت سے پڑھ لیتی ہے اور فیصلہ کر سکتی ہے کہ نماز تو سب پڑھتے ہیں لیکن ان میں سے مخلص کون ہے اور غیر مخلص کون؟ اور یہ راز دلوں میں جھانک کر آسانی سے بتایا بھی جا سکتا ہے۔ سچ پوچھئے تو اس آرڈیننس کے ماتحت جن ججوں نے بھی فیصلے کئے انہیں حکومت کی طرف سے شرک کے مقام پر کھڑا کر دیا گیا۔ یوں لگا جیسے وہ دلوں کے بھید جانتے ہوں اور اپنے آپ کو خدا تعالیٰ کے ہم پلہ قرار دے رہے ہوں۔

ایک امریکن اخبار نویس نے جب ایک خصوصی انٹرویو کے دوران جو بظاہر اس لئے لیا گیا تھا کہ جنرل ضیاء الحق کی تعریف و توصیف میں قلابے ملائے جائیں۔ بار بار پوچھا کہ اس آرڈیننس کے ذریعے آپ نے پاکستان کے آئین اور مجلس اقوام عالم کے بنیادی انسانی حقوق کے اعلان کی خلاف ورزی کی ہے تو جنرل ضیاء الحق نے کندھے مٹکائے ہوئے بڑی بے نیازی سے جواب دیا۔

"اچھا؟ تو پھر؟"

ادھر (حضرت) خلیفہ رابع نے اپنے سینئر مشیروں اور معتمدین کا اجلاس ربوہ

میں طلب کیا۔اس اجلاس کا ذکر کرتے ہوئے (حضرت) خلیفہ رابع کہتے ہیں:۔

"اس آرڈیننس کے نفاذ کے بعد صورت حال یکسر بدل گئی۔اب صرف میری اپنی سلامتی ہی خطرے میں نہیں تھی بلکہ میری زبان بندی بھی کردی گئی تھی۔اس نئے قانون کی آڑ میں جنرل ضیاء الحق نے مجھ پر ہی نہیں بلکہ جماعت احمدیہ کے فعال امام اور سربراہ کی حیثیت سے میری زبان پر بھی پہرے بٹھا دیئے تھے۔ اور میرے لئے فرائض منصبی کی ادائیگی محال کردی تھی۔یعنی پاکستان میں تو رہوں لیکن بولوں تو جیل کی ہوا کھاؤں۔اور جب سزا بھگت کر واپس آؤں اور پھر بولوں تو پھر تین سال کے لئے جیل بھیج دیا جاؤں"۔

یادرہے کہ جماعت احمدیہ کے عقائد کے مطابق خلیفہ وقت کی زندگی میں کسی اور کو خلیفہ منتخب نہیں کیا جاسکتا قطع نظر اس کے کہ خلیفہ وقت قید و بند کی صعوبتیں جھیل رہا ہو یا بوجوہ اس کا جماعت سے رابطہ یکسر منقطع ہو جائے۔ظاہر ہے ایسی صورت میں جماعت بغیر سربراہ کے رہ جاتی ہے۔

"ہمارا عقیدہ ہے کہ ہر فیصلے کے موقع پر خلیفہ وقت کی خود اللہ تعالیٰ راہنمائی فرماتا ہے۔فیصلہ کرنے کا یہ فرض کسی کمیٹی کے سربراہ کے سپرد نہیں کیا جاسکتا۔کچھ فیصلے ایسے بھی ہوتے ہیں جو بہر حال خلیفہ وقت کو خود کرنے ہوتے ہیں اور اس کا فیصلہ ہی آخری فیصلہ ہوتا ہے۔اگر جبر و تشدد سے ایسے حالات پیدا کر دیئے جائیں جن کی وجہ سے خلیفہ وقت کے لئے کوئی فیصلہ کرنا ناممکن ہو جائے تو ظاہر ہے ایسی صورت

حال جماعت کے لئے بے حد خطرناک ہو سکتی ہے"۔

(حضرت) خلیفہ رابع کے مشیروں اور معتمدین نے اتفاق رائے سے بہ یک زبان مشورہ دیا کہ آپ کو فوراً پاکستان سے چلے جانا چاہئے۔

☆ ☆ ☆

22

ضیاء کی غلطی

(حضرت) خلیفہ رابع نے امراء اور دیگر مشیروں کے اس مشورے کو کہ انہیں پاکستان سے فوراً چلا جانا چاہئے مان تو لیا لیکن صرف اس شرط پر کہ پاکستان چھوڑتے وقت ان کے خلاف ان کی گرفتاری کے نہ تو کسی قسم کے وارنٹ جاری ہوئے ہوں اور نہ ہی کسی مبینہ الزام کی جواب دہی کے لئے انہیں کسی کمیشن کے رُوبرُو پیش ہونے کے لئے کہا گیا ہو۔ چنانچہ فرمایا:-

"اگر اس قسم کا کوئی بھی وارنٹ جاری ہو چکا ہو تو میں ہرگز ملک نہیں چھوڑوں گا کیونکہ میں جانتا ہوں میری سلامتی اور تحفظ کے لئے جماعت کو کتنی بڑی قربانی دینی پڑے گی۔

علاوہ ازیں ایسے حالات میں ملک سے میری روانگی کی صورت میں بعض لوگوں کو اگر بلا واسطہ نہیں تو بالواسطہ

افواہوں کی شکل میں ہی سہی طرح طرح کی باتیں بنانے کا موقع مل جائے گا اور یہ کہا جائے گا کہ یقیناً مجھ سے کوئی جرم سرزد ہوا ہو گا ورنہ میں اس طرح ملک چھوڑ کر نہ چلا جاتا۔ مجھے اندیشہ ہے کہ اس صورت میں مجھ پر اس قسم کا الزام ضرور لگایا جائے گا اور میں ہرگز نہیں چاہتا تھا کہ کسی کو بھی اس قسم کی الزام تراشی کا موقع فراہم کروں"

بادلِ ناخواستہ امراء اور مشیروں نے (حضرت) خلیفہ رابع کے اس مشروط فیصلے کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا چنانچہ پاکستان سے خاموشی سے نکل جانے کے جملہ انتظامات ایک ایسے دوست کے سپرد کر دیئے گئے جو افواج پاکستان میں ایک سینئر افسر رہ چکے تھے اور اب ریٹائرڈ زندگی گزار رہے تھے۔ سب سے پہلے تو انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ (حضرت) خلیفہ رابع ہوائی جہازوں کی کمپنی کے۔ایل۔ ایم کے ذریعے ہی سفر کریں گے کیونکہ یہی آپ کی پسندیدہ ہوائی سروس تھی جس پر آپ سفر کرنے کے عادی تھے۔ چنانچہ ربوہ سے تقریباً سات سو پچاس میل دور ایک رضاکار صرف اس غرض سے کراچی بھجوا دیا گیا تاکہ روانگی کے جملہ انتظامات کر سکے۔ یہی کام ٹیلیفون کے ذریعہ بھی ہو سکتا تھا لیکن ٹیلیفون کے تار تو ٹیپ کئے جا رہے تھے اور اس پر کی گئی ساری گفتگو باقاعدہ سرکاری طور پر ریکارڈ کر لی جاتی تھی۔

اس ہفتے میں کراچی سے یورپ جانے والی صرف دو پروازیں تھیں۔ ایک کی روانگی تیس اپریل پیر کی صبح اور دوسری کی روانگی دو مئی بدھ کو تھی۔ (حضرت) خلیفہ رابع کی خواہش تھی کہ وہ بدھ کو روانہ ہونے والی پرواز پر جائیں تاکہ تیاری کے لئے تھوڑا بہت وقت مل جائے لیکن جب کراچی بھیجا جانے والا شخص

واپس آیا تو اس نے بتایا کہ کے۔ایل۔ایم کے مینیجر کی خواہش ہے کہ آپ اولین یعنی تیس اپریل کو علی الصبح روانہ ہونے والی پرواز پر ہی سفر کریں۔

بدھ کی پرواز پر بہت سی نشستیں خالی تھیں جبکہ پیر کو اس پرواز پر سب نشستیں پُر ہو چکی تھیں۔ لیکن مینیجر نے یقین دلایا کہ اس پرواز پر کم از کم چھ نشستیں مل جائیں گی۔ مینیجر نے اس پیشکش کی کوئی وجہ تو نہیں بتائی تھی لیکن اس کی پیشکش قبول کرلی گئی۔ بعد میں بتایا گیا کہ یہ پرواز براہ راست ایمسٹرڈم جاکر رکتی تھی جبکہ بدھ کو جانے والی پرواز خلیج کی ایک ریاست سے ہو کر جاتی تھی اور اس امر کا قوی امکان بلکہ اندیشہ تھا کہ حکومت پاکستان ہوائی جہاز کو خلیج کی ریاست ہی میں روک لیتی اور (حضرت) خلیفہ رابع کو ملزم قرار دے کر گرفتار کر لیتی۔

ان دنوں جماعت احمدیہ کے صدر مقام ربوہ کی کڑی نگرانی کی جارہی تھی۔ یہ نگرانی جنرل ضیاء الحق کی پانچ مختلف خفیہ تنظیمیں کر رہی تھی۔ ربوہ آنے جانے والے تمام راستوں پر ان خفیہ تنظیموں کے کارکن ہمہ وقت موجود رہتے تھے۔

ان لوگوں کی شناخت بہت مشکل بھی نہ تھی۔ ایک تنظیم پاکستان کی بری افواج سے تعلق رکھتی تھی۔ اس تنظیم کے کارکنوں نے فقیروں کا بھیس بدلا ہوا تھا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ عالم میں تنہا یہی ایسے فقیر رہ گئے تھے جنہوں نے اپنے فقیرانہ لباس کے ساتھ ملٹری کے مخصوص قسم کے بھاری بھرکم بوٹ بھی پہن رکھے تھے۔

(حضرت) خلیفہ رابع اس بات پر مصر تھے بلکہ یہ ان کا تاکیدی حکم تھا کہ ان کی روانگی کے متعلق کسی قسم کی غلط بیانی یا ابہام سے ہرگز کام نہ لیا جائے اور وہ خود نہ تو کوئی بھیس بدلیں گے اور نہ ہی کسی اور پاسپورٹ پر سفر کریں گے البتہ اگر جنرل ضیاء کی خفیہ تنظیمیں کسی خوش فہمی کا شکار ہو جائیں تو وہ جانیں اور ان کا کام۔

نماز فجر کے بعد علی الصبح (حضرت) خلیفہ رابع کی کار ربوہ سے روانہ ہوتی ہوئی نظر آئی۔ کار کی عقبی نشست پر ایک صاحب تشریف فرما تھے۔ وہ (حضرت) خلیفہ رابع کے معمول کے لباس میں تھے یعنی اچکن زیب تن تھی۔ انہوں نے پنجابی طرز کی طرے دار سفید پگڑی جو سنہری کلا پر بندھی ہوئی تھی، پہن رکھی تھی۔ حضرت خلیفہ رابع کا معمول کا حفاظتی دستہ ان کے ہمراہ تھا۔ ایک کار ان کی کار کے آگے اور دو کاریں پیچھے پیچھے چل رہی تھیں۔ ان کاروں میں ان کا حفاظتی دستہ سوار تھا، جس کے ایک ایک فرد کو خفیہ تنظیمیں خوب جانتی پہچانتی تھیں اور ان میں سے ہر شخص اپنی اپنی نشست پر بیٹھا ہوا صاف دکھائی دے رہا تھا۔

راہ چلتے اکا دکا احمدیوں نے جب اس قافلے کو روانہ ہوتے ہوئے دیکھا تو یہی سوچا کہ (حضرت) خلیفہ رابع دو سو میل دور اسلام آباد تشریف لے جا رہے ہیں۔ ربوہ کی نگرانی پر متعین پانچ سرکاری خفیہ تنظیموں میں سے چار خفیہ تنظیموں کا اندازہ بھی کم و بیش یہی تھا۔ ان تنظیموں نے اپنے افسران بالا کو رپورٹ بھجوائی کہ (حضرت) خلیفہ رابع اسلام آباد جانے کے لئے ربوہ سے روانہ ہو گئے ہیں اور ان کے قافلے کا معمول کے مطابق پیچھا کیا جا رہا ہے۔ کچھ عرصے بعد انہوں نے دوسری رپورٹ بھجوائی کہ (حضرت) خلیفہ رابع براہ راست پنڈی اسلام آباد نہیں جا رہے بلکہ یوں لگتا ہے جیسے وہ پہلے جہلم رکیں گے جہاں ان کے عم زاد مرزا منیر احمد کی چپ بورڈ کی فیکٹری ہے۔ جہلم اسلام آباد سے ۷۰ میل مشرق میں واقع ہے۔ اندازہ یہی تھا کہ وہ رات معمول کے مطابق اپنے عم زاد کے ہاں گزاریں گے اور اگلے دن اسلام آباد روانہ ہوں گے۔

ظاہر ہے کہ اگر وہ سیدھے راولپنڈی / اسلام آباد چلے جاتے تو وہاں کوئی نہ کوئی حکومتی نمائندہ ان سے ملاقات کا متمنی ضرور موجود ہوتا۔

لیکن اس مرسیڈیز کار کی عقبی سیٹ پر (حضرت) خلیفہ رابع نہیں بلکہ ان کے تیسرے بڑے بھائی (صاحبزادہ) ڈاکٹر مرزا منور احمد تشریف فرما تھے۔ (صاحبزادہ) مرزا منور احمد کے قافلے کی روانگی سے کافی پہلے رات کے دو بجے منہ اندھیرے دو اور کاریں ربوہ سے روانہ ہو چکی تھیں۔ یہ کاریں پہلے تو ایک ذیلی راستے سے لالیاں پہنچیں، جو ایک چھوٹا سا قصبہ ہے۔ پھر وہاں سے ضلعی صدر مقام جھنگ اور بالآخر کراچی جانے والی شاہراہ پر کراچی کے لئے عازم سفر ہو گئیں۔ ربوہ سے کراچی کا یہ فاصلہ تقریباً ۷۵۰ میل ہے۔ ان دو کاروں میں سے پہلی کار میں (حضرت) خلیفہ رابع کا حفاظت خاص کا عملہ تھا جبکہ دوسری کار میں (حضرت) خلیفہ رابع بہ نفس نفیس تشریف فرما تھے۔

اس ریٹائرڈ فوجی افسر کا (جنہیں یہ ذمہ داری سونپی گئی تھی) اصرار تھا کہ (حضرت) خلیفہ رابع کے پاکستان چھوڑنے کے اس فیصلے کا علم انتہائی ناگزیر صورت میں بھی چند گنے چنے افراد ہی کو ہو اور تفاصیل کا علم تو صرف چند گنتی کے افراد تک ہی محدود رہے۔ سوال اعتماد کا نہیں احتیاط کا تھا۔ ظاہر ہے کہ اگر آپ کسی راز سے واقف ہی نہیں تو نادانستہ طور پر بھی اسے فاش نہیں کر سکتے۔

لیکن خدا تعالیٰ نے پہلے ہی کم از کم دو افراد کو اس راز سے آگاہ فرما دیا تھا۔ (حضرت) خلیفہ رابع کے پاکستان چھوڑ دینے کے فیصلے اور روانگی کی تفاصیل طے ہو چکنے کے بعد روانگی سے دو دن قبل ایک معمر چینی النسل احمدی بزرگ "عثمان چو" کا لکھا ہوا خط موصول ہوا جس میں انہوں نے اپنی ایک خواب کی تفصیل بیان کی تھی۔ خواب کا مفہوم تو ان کی سمجھ میں نہیں آسکتا تھا لیکن انہیں یہ یقین تھا کہ اس خواب کا (حضرت) خلیفہ رابع سے کوئی نہ کوئی تعلق ضرور ہے۔ انہوں نے لکھا کہ

"میں نے خواب میں دیکھا کہ (حضرت) خلیفہ رابع کی کار اسلام آباد کے لئے روانہ ہونے والی ہے۔ میں کار کے پاس جاتا ہوں تاکہ سلام عرض کرسکوں لیکن جب کھڑکی میں سے جھانکتا ہوں تو یوں لگتا ہے جیسے کار بالکل خالی ہو۔

مجھے سخت صدمہ ہوتا ہے اور میں گھبراہٹ کے عالم میں پکار اٹھتا ہوں "(حضرت) خلیفہ رابع جارہے ہیں۔ ان کی کار بھی جارہی ہے لیکن آپ کار میں موجود نہیں ہیں"۔ پھر ایک آواز سنائی دیتی ہے کہ (حضرت) خلیفہ رابع کسی اور راستے سے روانہ ہوچکے ہیں اور بیرون ملک تشریف لے جاچکے ہیں۔ اس پر میں کار کے ساتھ ساتھ چلتا جاتا ہوں اور اسلام آباد کی بجائے ہم جہلم پہنچ جاتے ہیں جہاں ہم رات بسر کرتے ہیں"۔

یہ وہ خواب تھا جس کی تفصیل عثمان چُو نے اپنے خط میں بیان کی تھی۔ اس خط میں اس منصوبے کا سارا خاکہ موجود تھا جس کے مطابق (حضرت) خلیفہ رابع کو سفر کرنا تھا اور جس کے متعلق آخری فیصلہ ہوئے ابھی چند ایک گھنٹے ہی گزرے تھے۔

(حضرت) خلیفہ رابع نے فرمایا:۔

"دوسرا خواب میری دوسری بیٹی فائزہ نے دیکھا جو اس وقت تیئس سال کی تھی۔ فوری طور پر تو اس خواب کی تعبیر سمجھ میں نہ آئی لیکن بعد میں ہونے والے واقعات نے اس خواب کی سچائی پر مہر تصدیق ثبت کردی۔ ہمارے گھر میں کسی کو علم نہ تھا کہ بیرون ملک جانے کا فیصلہ ہوچکا ہے۔ لیکن

روانگی سے ایک دن قبل میری بیٹی نے بتایا کہ اس نے خواب میں دیکھا کہ جیسے مَیں ایک ویران سی سڑک پر سفر کر رہا ہوں۔ دو کاریں ہیں۔ لیکن یہ وہ کاریں نہیں جن پر میں عموماً سفر کیا کرتا ہوں۔ کاریں ایک ایسی جگہ پہنچتی ہیں جہاں یوں لگتا ہے جیسے سڑک کی مرمت ہو رہی ہو۔ وہاں میری کار کی رفتار سست پڑ جاتی ہے۔ ویسے بظاہر سڑک کی مرمت کا کام نہیں ہو رہا اور نہ ہی کام کرنے والے مزدور کہیں دکھائی دے رہے ہیں۔ صرف بجری کے کچھ ڈھیر ہیں جن کے پاس سے گذرتے وقت کار کی رفتار دھیمی پڑ جاتی ہے۔ کیا دیکھتی ہوں کہ عین اس وقت کچھ بھکاری تیزی سے کاروں کی طرف بڑھتے ہیں لیکن ان کا انداز اور حلیہ مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ میں سخت پریشان اور سراسیمہ ہو جاتی ہوں۔ اچانک اگلی کار میں سے ایک بازو نمودار ہوتا ہے جو ایک ایک روپے کے بہت سے نوٹ ہوا میں اچھال دیتا ہے۔ نتیجتاً اکثر بھکاری ان نوٹوں پر جھپٹ پڑتے ہیں اور دونوں کاریں بجری کے ڈھیروں سے بچتی بچاتی آسانی سے آگے بڑھ جاتی ہیں اور کراچی جانے والی شاہراہ پر روانہ ہو جاتی ہیں"۔

ہوا یوں کہ لالیاں اور جھنگ کے درمیان سڑک ایک جگہ سیلاب کی وجہ سے ٹوٹ پھوٹ گئی تھی۔ وہاں اس کی مرمت کے لئے بجری کے کچھ ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ بری فوج سے تعلق رکھنے والی جاسوسی ٹیم نے اس قدرتی رکاوٹ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے وہاں اپنی نگران چوکی قائم کر دی تھی۔ فوجی جوانوں نے

بھک منگوں کا روپ دھار رکھا تھا۔ جب یہ دونوں کاریں جن پر (حضرت) خلیفہ رابع اور ان کا حفاظتی عملہ سوار تھا ذرا آہستہ ہوئیں تو فقیرانہ وضع کے یہ نوجوان فوراً کار کی طرف بڑھے۔ ان میں سے بعضوں نے درویشوں کی طرح لمبے لمبے لبادے اوڑھ رکھے تھے۔ سبھی تنومند اور ہٹے کٹے جوان تھے۔ لیکن ایک غلطی ان سے ضرور سرزد ہوئی۔ وہ یہ بھول گئے کہ انہوں نے بری فوج کے سکہ بند بھاری بھرکم بوٹ بھی پہن رکھے ہیں۔ یہ عجیب و غریب "فقیر" اپنی ہیئت کذائی کے ساتھ کار نمبر ۲ کی طرف تیزی سے بڑھ رہے تھے۔ یہی وہ کار تھی جس میں (حضرت) خلیفہ رابع اگلی سیٹ پر ڈرائیور کے ساتھ تشریف فرما تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے اب یقینی طور پر وہ (حضرت) خلیفہ رابع کو پہچان لیں گے۔ اچانک اگلی کار میں بیٹھے ہوئے حفاظتی عملے کے ایک رکن نے کار کی کھڑکی میں سے اپنا بازو باہر نکالا اور ایک ایک روپے کے مٹھی بھر نوٹ باہر پھینک دیئے۔ جس کا ردعمل یہ ہوا کہ فقیر نوٹوں پر جھپٹ پڑے۔ اس اثنا میں (حضرت) خلیفہ رابع کی کار آگے بڑھ گئی اور بجری کے ڈھیروں سے بچتی بچاتی پوری رفتار سے اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہو گئی۔ البتہ کچھ فقیر اپنے باقی ساتھیوں کی طرح اڑتے ہوئے نوٹوں کا پیچھا کرنے کی بجائے بڑے غور سے کار میں موجود مسافروں کو گھورتے رہے۔

اگلے روز بری فوج کے جاسوس یونٹ کی طرف سے افسران بالا کو رپورٹ موصول ہوئی کہ (حضرت) خلیفہ رابع کو جھنگ کی طرف جاتی ہوئی ایک کار میں دیکھا گیا ہے۔ ممکن ہے وہ کراچی جا رہے ہوں۔ لیکن اس رپورٹ کی طرف کوئی توجہ نہ دی گئی کیونکہ باقی چار خفیہ اداروں کی طرف سے دی گئی متفقہ اطلاع یہ تھی کہ (حضرت) خلیفہ رابع اپنے حفاظتی عملے کی معیت میں اسلام آباد جا رہے ہیں اور راستے میں انہوں نے اپنے چچازاد بھائی کے ہاں رات بسر کی ہے۔

کے۔ ایل۔ ایم کی ایمسٹرڈم جانے والی پرواز کو صبح دو بجے روانہ ہونا تھا۔ (حضرت) خلیفہ رابع کی کراچی ائرپورٹ تک کی یہ سات سو پچاس میل طویل زمینی مسافت تو بخیریت طے ہو گئی تاہم حفاظتی عملے کے لئے اس سفر کا لمحہ لمحہ سولی پر لٹکے ہوئے گزرا۔

یہ مختصر قافلہ ایک ریستوران پر بھی رکا۔ ریستوران کیا تھا۔ بس مخصوص قسم کی سادہ سی دکان تھی جو سڑک کے کنارے پر واقع تھی۔ جہاں ڈرائیور لوگ رک کر کھانا کھاتے اور چائے نوش کیا کرتے ہیں۔ (حضرت) خلیفہ رابع کے ڈرائیور نے احتیاطاً دکان سے دور ایک الگ تھلگ جگہ پر کار روک لی۔ مقصد یہ تھا کہ آپ دکان پر جانے کی بجائے وہیں کار ہی میں کھانا کھالیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کوئی آپ کو پہچان لے۔

لیکن (حضرت) خلیفہ رابع نے اس درخواست کو یکسر مسترد فرمادیا۔ فرمایا:۔

"میری تو اس چائے خانے کے مالک سے خاصی شناسائی ہے۔ خلیفہ منتخب ہونے سے قبل میں کئی مرتبہ یہاں رکا ہوں اور چائے پی ہے"

چنانچہ آپ کار سے اترے اور چائے خانے کے مالک سے ملے۔ پرانی یادیں تازہ کیں۔

چائے پی اور تازہ دم ہو کر پھر سفر پر روانہ ہو گئے۔ کراچی ائرپورٹ پہنچنے پر آپ ایک پرائیویٹ کمرے میں تشریف فرما ہوئے۔ جہاز کی روانگی کے مقررہ وقت سے ایک گھنٹہ قبل پاسپورٹ وغیرہ کی معمول کی چیکنگ ختم ہوئی۔ اب صرف اس اعلان کا انتظار تھا کہ مسافر جہاز پر سوار ہو جائیں۔ لیکن انتظار کی گھڑیاں لمبی ہوتی چلی گئیں۔

بالآخر اعلان ہوا کہ جہاز کی روانگی میں تاخیر ہو گئی ہے (حضرت) خلیفہ رابع ایک الگ کمرے میں روانگی کے منتظر تھے۔ انتظار کے لمحے طویل سے طویل تر ہوتے چلے گئے لیکن جہاز روانہ نہ ہوا۔

کے۔ ایل۔ ایم کے مینیجر نے یقین دلایا تھا کہ جہاز مقررہ وقت پر روانہ ہو جائے گا لیکن اب اس نے آکر معذرت کی اور بتایا کہ روانگی میں تاخیر صرف ائرپورٹ کے حکام کی وجہ سے ہو رہی ہے۔ ان کی وجہ ہی سے جہاز کو اڑنے کی اجازت نہیں دی جا رہی۔

(حضرت) خلیفہ رابع تو اطمینان سے انتظار کر رہے تھے لیکن ان کی (حضرت) بیگم صاحبہ اور حفاظتی عملے کے چہروں پر پریشانی کے آثار چھپائے نہیں چھپتے تھے۔ البتہ ان کی دونوں چھوٹی بیٹیاں آرام کی نیند سو رہی تھیں ان معصوموں کو کیا خبر کہ انتظار کے لمحات کتنے کربناک ہوتے ہیں۔

لمحوں پر لمحے گزرتے چلے گئے۔

مقررہ وقت سے ایک گھنٹہ بعد کہیں جا کر اعلان ہوا کہ جہاز روانہ ہونے والا ہے (حضرت) خلیفہ رابع' ان کی بیگم صاحبہ' دو بیٹیاں' جناب چوہدری حمید نصر اللہ خان امیر جماعت ہائے احمدیہ لاہور اور بری افواج کے مذکورہ ریٹائرڈ افسر جہاز پر سوار ہو گئے۔ اب یہ لوگ تھے اور آٹھ گھنٹے کا طویل ایمسٹرڈم تک کا سفر۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جہاز کی روانگی میں تاخیر صرف (حضرت) خلیفہ رابع ہی کی وجہ سے ہو رہی تھی۔

اگرچہ اس وقت تو اس بات کا علم نہیں ہو سکا تھا لیکن کئی ماہ بعد جا کر پتہ چلا کہ اس موقع پر (حضرت) خلیفہ رابع کس طرح گرفتار ہوتے ہوتے بال بال بچ گئے۔

ائرپورٹ کے پاسپورٹ کنٹرول کے سامنے جنرل ضیاء کا اپنے دستخطوں سے

جاری کردہ ایک حکمنامہ پڑا تھا۔ یہ حکمنامہ ملک کے تمام ہوائی، سمندری اور بری راستوں اور گزر گاہوں تک پہنچ چکا تھا۔ حکمنامے کے الفاظ یہ تھے۔

"مرزا ناصر احمد کو جو اپنے آپ کو جماعت احمدیہ کا خلیفہ کہتے ہیں، پاکستان کی سرزمین چھوڑنے کی ہرگز اجازت نہیں"۔

اس لئے کراچی ائرپورٹ پر جہاز کی روانگی میں کچھ تاخیر ہوئی تو چنداں تعجب کی بات نہ تھی۔ جنرل ضیاء کو (حضرت) خلیفہ ثالث سے اکثر سابقہ پڑتا رہا تھا۔ اس لئے اس نے غلطی سے حکم نامے پر (حضرت) خلیفہ رابع یعنی (حضرت) مرزا طاہر احمد کی بجائے (حضرت) خلیفہ ثالث یعنی (حضرت) مرزا ناصر احمد کا نام اپنے ہاتھ سے لکھ دیا!

جنرل ضیاء الحق نے پابندی لگائی بھی تو (حضرت) خلیفہ ثالث پر جو اس پابندی کے لگنے سے دو سال قبل وفات پا چکے تھے!

(حضرت) خلیفہ رابع کے پاسپورٹ پر وضاحت سے لکھا ہوا تھا کہ ان کا نام (حضرت) مرزا طاہر احمد ہے اور یہ کہ وہ عالمی جماعت احمدیہ کے امام ہیں۔

ائرپورٹ پر انتظار کی ان طویل گھڑیوں کے دوران پاسپورٹ کنٹرول آفس کی مصروفیت اور تگ و دو بھی قابل دید تھی۔ اس الجھن کے حل کے لئے اسلام آباد سے مسلسل رابطہ کیا جا رہا تھا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس گتھی کو سلجھانے کے لئے اگر کوئی افسر مجاز ملتا بھی تو کس طرح اور وہ بھی صبح کے دو بجے، ڈیوٹی پر حاضر عملے نے جواباً یہی کہا کہ معلوم ہوتا ہے یہ کوئی پرانا حکم ہے جو شاید اب زائد المیعاد ہو چکا ہے۔ بہرحال مصدقہ اطلاع یہی ہے کہ (حضرت) خلیفہ رابع ربوہ سے اسلام آباد جانے کے لئے روانہ ہو چکے ہیں اور اب اسلام آباد پہنچنے ہی والے ہیں۔

بالآخر جہاز کو پرواز کی اجازت دے دی گئی۔

صبح کے تین بج رہے تھے۔ امام صاحب مسجد فضل لندن جناب عطاء المجیب راشد کے ہاں ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ راشد صاحب نے ٹیلیفون اٹھایا۔ "تیار ہو جائیے" آواز آئی۔

"تیار تو میں ہوں لیکن کیسی تیاری؟"

آواز تو راشد صاحب نے فوراً پہچان لی تھی۔ یہ ربوہ سے بیرونی ممالک میں جماعت احمدیہ کے مشنوں کے ناظم مسعود احمد تھے۔ انہوں نے بتایا "(حضرت) خلیفہ رابع چار گھنٹے قبل پاکستان سے یورپ روانہ ہو چکے ہیں۔ ان کے یورپ پہنچے کا انتظار تھا۔ اس لئے آپ کو اس سے پہلے اطلاع نہیں دی گئی۔

عطاء المجیب راشد کہتے ہیں "یہ خبر سن کر میں فرط تشکر سے گنگ ہو کر رہ گیا۔ میری اہلیہ نے پوچھا کیسا فون تھا خیر تو ہے؟ لیکن میں جواب کیا دیتا۔ میرے جسم و جان تو اللہ (تعالیٰ) کے حضور اس کا شکر ادا کرنے کے لئے سجدہ ریز ہو چکے تھے کہ اس نے محض اپنے فضل سے آپ ہی ہمارے پیارے آقا کے مقدس وجود کی حفاظت کے سامان فرما دیئے تھے"۔

اس کے ساتھ ہی امام عطاء المجیب راشد (حضرت) خلیفہ رابع کے استقبال کی تیاریوں میں ہمہ تن مصروف ہو گئے۔ ان کی اہلیہ نے (حضرت) خلیفہ رابع کی رہائش گاہ کے لئے کمرے خالی کر دیئے اور ان کی صفائی شروع کر دی۔ اسی طرح دفتر کے لئے بھی کمرہ خالی ہو گیا۔

لندن میں موجود جماعت کے اعلیٰ عہدہ داران کو بذریعہ ٹیلیفون فوراً خبردار کر دیا گیا کہ وہ اس وقت یعنی ساڑھے چار بجے صبح ایک ہنگامی اجلاس میں لازماً شمولیت کریں۔

جماعت ہائے احمدیہ ہالینڈ کو بھی (حضرت) خلیفہ رابع کی متوقع آمد سے مطلع کر دیا گیا۔

اس کے فوراً بعد یہ اطلاع بھی مل گئی کہ حضور کا جہاز ایمسٹرڈم کے ہوائی اڈے پر اتر چکا ہے اور آپ لندن کے لئے بذریعہ ہوائی جہاز روانہ ہو چکے ہیں۔

آپ ساڑھے بارہ بجے سے ذرا پہلے مسجد فضل لندن پہنچ گئے۔ کم و بیش تین سو احمدی آپ کے استقبال کے لئے موجود تھے جو آپ کی آمد کی خبر سن کر کھینچے چلے آئے تھے۔

اس طویل ہوائی سفر کے بعد (حضرت) خلیفہ رابع کے چہرے پر تھکن کے آثار نظر آ رہے تھے۔ آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور کپڑے شکن آلود تھے۔ لیکن آپ نے سب سے پہلے مسجد میں حاضری دی اور ظہر کی نماز پڑھائی۔ آپ نے بتایا کہ میرا گلا بیٹھا ہوا ہے اس لئے میں بلند آواز سے نہیں بول سکتا۔ ربوہ میں چونکہ لاؤڈ سپیکر پر پابندی ہے۔ مسجد میں احباب جماعت سے مخاطب ہوتے وقت مجبوراً مجھے پورے زور سے بولنا پڑتا تھا۔ جس کی وجہ سے گلا متاثر ہوا ہے۔ ادھر حضرت خلیفہ رابع کے ایمسٹرڈم پہنچتے ہی جناب کاہلوں صاحب کی طرف سے ان کے برادر نسبتی کو ربوہ میں ٹیلیکس کے ذریعے ایک عجیب و غریب پیغام ملا۔ جس کا متن یہ تھا!

"قیمتی سامان جو ایمسٹرڈم بھیجا گیا تھا بخیریت پہنچ گیا ہے اور جلد ہی لندن پہنچ جائے گا"

کوشش کے باوجود ٹیلیکس کا معمہ انکی سمجھ میں نہ آیا۔ پہلے انہوں نے دفاتر میں گھوم پھر کر اس کے حل کی کوشش کی۔ وہاں سے ناکامی کے بعد اپنی بیگم سے پوچھا کہ تمہارے بھائی نے یہ ایک عجیب و غریب ٹیلیکس بھیجی ہے کہ ایک قیمتی پیکٹ پہنچ گیا۔ لاکھ مغز کھپایا لیکن کچھ سمجھ نہیں آ رہا کہ وہ کہنا کیا چاہتے ہیں۔ کسی کو

کچھ پتہ نہیں۔ کہیں آپ نے تو ان کو کوئی پیکٹ نہیں بھیجا؟

ان کی بیگم "نہیں" کہتے کہتے رک گئیں۔ پھر بولیں سنا تو ہے کہ (حضرت) خلیفہ رابع پاکستان سے تشریف لے جا چکے ہیں۔ میرا مشورہ تو یہ ہے کہ آپ یہ ٹیلیکس فوری طور پر امیر مقامی کے پاس لے جائیں۔

دراصل یہی تو ایک خوش خبری تھی جس کا اس راز میں شریک چند لوگوں کو انتظار تھا۔ اب کیا تھا چشم زدن میں یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پہلے ربوہ اور پھر پاکستان بھر میں پھیل گئی۔

جنرل ضیاء الحق تو یہ خبر سن کر غصے سے باؤلا ہو گیا۔ وہ پہلے تو کراچی میں محکمہ امیگریشن کے افسران بالا پر گرجا برسا اور انہیں بیک قلم معطل کر دیا۔ پھر اس نے حکم دیا کہ پوری اور ہمہ جہت تحقیق اور چھان بین کی جائے اور کوئی گوشہ فرو گذاشت نہ ہونے پائے کہ "آخر یہ سب کچھ بغیر سازش اور ملی بھگت کے ہوا کیسے؟ یاد رکھو جو لوگ بھی اس سازش میں ملوث پائے گئے، میں ان کو ناکوں چنے چبوا دوں گا"۔ جنرل ضیاء الحق نے چیخ کر کہا۔ ادھر ضلع جھنگ کی پولیس کے افسر اعلیٰ اسی صبح اپنے ایک دوست کے ہمراہ دفتر میں بیٹھے ہوئے تھے۔ انہیں بتایا گیا کہ اسلام آباد سے ٹیلیفون کال ہے۔ صدر پاکستان جنرل ضیاء الحق فون پر منتظر ہیں۔ آپ ان سے بات کریں۔

"مرزا طاہر احمد کہاں ہے؟" جنرل ضیاء الحق چلا رہا تھا "اسے میرے سامنے پیش کیا جائے۔" ضیاء الحق کی آواز دفتر میں بیٹھے ہوئے مہمان کو بھی صاف سنائی دے رہی تھی۔

"جناب مجھے تو کچھ علم نہیں" پولیس آفیسر نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا۔ مہمان مذکور نے بتایا کہ جواب دیتے وقت ضلعی پولیس کا یہ افسر اعلیٰ خوف سے

تھر تھر کانپ رہا تھا۔

جواب سن کر جنرل ضیاء الحق غصے سے آگ بگولا ہو گیا اور دھاڑ کر بولا

"تم کہنا کیا چاہتے ہو؟ تمہیں کیوں علم نہیں ہے؟ یہ ذمہ داری تمہاری ہے۔ وہ تمہارے ضلع کی حدود میں رہتا ہے۔ تمہارے ہوتے ہوئے تمہارے سامنے وہ غائب ہو گیا اور تمہیں اس کی کانوں کان خبر نہ ہو سکی۔ میں تو تمہیں پکڑوں گا۔ عافیت چاہتے ہو تو اسے فوراً پیش کرو" ضلعی پولیس کے افسر اعلیٰ نے اپنی سراسیمگی پر قابو پاتے ہوئے انتہائی لجاجت سے جواب دیا۔

"جناب خاطر جمع رکھیں میں ابھی ایک تحقیقاتی ٹیم تشکیل دے کر مرزا طاہر احمد کو جہاں کہیں بھی ہو اڈھونڈ نکالوں گا۔

جنرل ضیاء الحق کا جواب کیا تھا، دھمکیوں اور گالیوں کا ایک لاوا تھا جو کئی منٹ تک ابلتا رہا۔

ادھر لندن میں پاکستانی سفارت خانے میں سیکورٹی کا سربراہ اپنی جگہ مصروف عمل تھا۔ اس نے لندن میں مقیم ایک سابق پاکستانی سفیر سے ٹیلیفون پر دریافت کیا:۔

"کیا تم جانتے ہو کہ مرزا طاہر احمد اس وقت کہاں ہیں؟" سابق سفیر نے جواب دینے کی بجائے ایک اور سوال کر دیا: "آپ یہ بات مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہیں؟"

سفارت خانے کے سیکورٹی افسر نے جواب دیا :۔

"ہمیں پاکستان سے اطلاع ملی ہے کہ مرزا طاہر احمد خفیہ طریق سے پاکستان چھوڑ کر سوئٹزرلینڈ چلے گئے ہیں لیکن سوئٹزرلینڈ کے ذرائع نے بتایا ہے کہ وہاں تو ان کی آمد کا نام و نشان تک نہیں ہے"۔

اس پر سابق سفیر نے جواب دیا:

"(حضرت) خلیفہ رابع ایک عام مسافر کی طرح ایک معمول کی پرواز پر پاکستان سے روانہ ہوئے تھے اور وہ اس وقت لندن میں ہیں"۔

اگلے دن آپ کی پاکستان سے ہجرت کی خبر کو دنیا بھر کے اخباروں نے جلی حروف میں شہ سرخیوں کے ساتھ صفحہ اول پر جگہ دی۔ پاکستان اور ہندوستان کے مسلمانوں نے یہ خبر بی بی سی کی عالمی سروس کے ذریعے سنی۔ انگریزی اور اردو میں دیئے گئے انٹرویو میں جو بی بی سی کے اردو اور انگریزی کے پروگراموں میں نشر ہوا (حضرت) خلیفہ رابع نے سفر ہجرت اور اپنے آئندہ منصوبوں پر روشنی ڈالی۔

جنرل ضیاء الحق کو یقین تھا کہ وہ جماعت احمدیہ کا گلا گھونٹ کر رکھ دے گا۔ لیکن یہ سب کچھ اس کی کوشش اور خواہش کے برعکس ہوا اور اس نے اس تحریک کو ترقی کرنے اور پھولنے پھلنے کا ایک نادر موقع فراہم کر دیا۔ لندن آج بھی بین الاقوامی رابطے اور میل ملاپ کے لئے ایک مصروف ترین مرکزی گزرگاہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ لندن پہنچ کر (حضرت) خلیفہ رابع کو وہ موقع میسر آگیا جس سے فائدہ اٹھا کر اب وہ جماعت احمدیہ کی بھرپور اور مؤثر راہنمائی کر سکتے تھے جس سے جماعت کا دنیا بھر کو حلقہ بگوش اسلام کرنے کا خواب بآسانی شرمندہ تعبیر ہو سکتا تھا۔

لندن آنے کے بعد آپ نے ایک مرتبہ اس سلسلے میں فرمایا "خدائی حکمتیں بھی کتنی حیرت انگیز ہوتی ہیں"

اس میں کوئی شک نہیں کہ (حضرت) خلیفہ رابع اپنی یقینی گرفتاری سے صرف بارہ گھنٹے قبل بچ نکلنے میں کامیاب ہوئے تھے۔ آپ کی ہجرت کی خبر سے صرف بارہ گھنٹے پہلے گورنر پنجاب بذریعہ ٹیلیفون یہ حکم دے چکے تھے کہ مرزا طاہر احمد لاہور

پہنچ کر فوراً اس کے دفتر میں حاضر ہوں۔ اگر یہ حکم ان تک پہنچ جاتا اور اس کی
تعمیل میں وہ گورنر پنجاب سے ملتے تو یقینی طور پر گرفتار کر لئے جاتے۔

☆ ☆ ☆

23

ایک نادر موقع

(حضرت) خلیفہ رابع کی لندن میں تشریف آوری سے مسجد فضل لندن پر غیر معمولی دباؤ پڑنے والا تھا۔ اب تک تو یہاں پر جماعت ہائے احمدیہ برطانیہ ہی کا مرکزی نظام قائم تھا۔ اگرچہ افراد جماعت کی تعداد میں مسلسل اضافے کی وجہ سے یہ کوشش بھی جاری تھی کہ دفاتر وغیرہ کے لئے زیادہ کھلی جگہ میسر آجائے لیکن اب اچانک ایک انقلابی صورت حال پیدا ہونے کی وجہ سے مسجد فضل صرف برطانیہ کی ہی نہیں دنیا بھر کی جماعتوں کا مرکز بن گئی تھی۔ یعنی خلافت رابعہ کا مرکزی دفتر بھی یہیں پر منتقل ہو گیا تھا۔

بعض لحاظ سے لندن ربوہ کی نسبت ایک بہتر جگہ تھی۔ صرف یہی نہیں کہ دنیا بھر کے ہوائی راستے لندن سے ہو کر جاتے تھے اور عملاً لندن ہوائی جہازوں کی بین الاقوامی گزرگاہ بن چکا تھا بلکہ یہ مواصلات اور ذرائع ابلاغ کا عالمی مرکز بھی تھا۔ (حضرت) خلیفہ رابع ٹیلیفون اوپریٹروں کی وساطت سے ٹیلیفون کی کالیں بک

کروانے کی بجائے فون اٹھا کر انتظار کی زحمت اٹھائے بغیر کسی بھی ملک میں بلا توقف رابطہ قائم کر سکتے تھے۔ فیکس کے نظام کے ذریعے دستاویزات کی فوری منتقلی تو بے حد آسان ہو گئی تھی۔

عالمی جماعت احمدیہ کا یہ مرکزی دفتر اتنا خوبصورت نہیں جتنا فعال اور متحرک ہے۔ یہ ۱۰ افٹ × ۱۰ افٹ کا ایک کمرہ ہے جس میں صرف ایک میز۔ چند کرسیوں اور چند کتابوں کی گنجائش ہے اور بس۔ کہیں سے بھی باہر کا نظارہ نظر نہیں آتا۔ تھوڑی بہت روشنی تنگ اور لمبی کھڑکیوں کے راستے اندر داخل ہوتی تو ہے لیکن اتنی کم کہ زائرین کی توجہ روشنی کی طرف نہیں جا سکتی۔ بلکہ اگر جاتی بھی ہے تو ان ماہرین تعمیر کی کوتاہ نظری اور سوچ کے فقدان کی طرف جاتی ہے جنہوں نے جنگ کے بعد اس قسم کی تعمیرات کے نقشے بنائے۔

(حضرت) خلیفہ رابع ربوہ کی کھلی ہوا اور روشنی کو ترس گئے تھے۔ وہ چاہتے تھے جہاں تک ممکن ہو سکے ان کے دفتر میں پھول اور پودے دکھائی دیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کے کمرے میں ان کے ذاتی نوادرات بھی نظر آنے لگے۔ کچھ تو بیرونی ممالک کے دوروں کی تصاویر تھیں۔ ان کے علاوہ کاغذ کا ایک انمول پرزہ بھی تھا جس پر بانی جماعت احمدیہ (حضرت) مسیح موعود مہدی معہود کی خودنوشت تحریر درج تھی۔ کاغذ کا یہ پرزہ انہیں ایک احمدی نے تحفتاً پیش کیا تھا۔ میز کے پاس ایک ڈبہ سا رکھا ہوا ہے جو ملاقاتیوں کو نظر نہیں آتا۔ یہ ان بچوں کے لئے ٹافیوں سے بھرا رہتا ہے جو (حضرت) خلیفہ رابع سے ملاقات کے لئے آتے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں۔

"ملاقات سے قبل والدین کی طرف سے بچوں کو بار بار
اور بڑی پر زور تاکید کی جاتی ہے کہ وہ ملاقات کے وقت

بڑے مؤدب اور "بیبے" بن کر رہیں۔ چنانچہ جب وہ ملاقات
کے لئے آتے ہیں تو غریب سہمے ہوئے سے لگتے ہیں اور ملنے
سے پہلے ہی سخت مرعوب ہو چکے ہوتے ہیں۔ حالانکہ خلافت
کے کڑے منصب پر فائز ہونے کے بعد جو عظیم خوشیاں اور
مسرتیں قدرت نے مجھے عطا کی ہیں ان میں سے ایک دلی
مسرت اور سچی خوشی وہ ہے جو مجھے بچوں سے مل کر حاصل
ہوتی ہے۔ بچوں سے گفتگو کرنا میرا پسندیدہ مشغلہ ہے۔ ان کی
معصومیت سے مجھے بے پناہ محبت ہے۔ ان سے بات کر کے
مجھے تو مزا آجاتا ہے اور ساری کوفت دور ہو جاتی ہے"۔

(حضرت) خلیفہ رابع کی رہائش اور دفتر کے لئے جگہ کا جب کچھ نہ کچھ
بندوبست ہو چکا گو ناکافی ہی سہی، تو ان کے رضاکار عملے کے لئے بھی جگہ کی
ضرورت پڑی جہاں یہ لوگ دلجمعی سے بیٹھ کر کام کر سکیں۔

بالآخر یہ مشکل بھی حل ہو گئی۔ جس طرح نئی عمارت کی تعمیر کے موقع پر دفتر
کے لئے عارضی قیام گاہیں کھڑی کر لی جاتیں ہیں اسی طرح ان دفاتر کے لئے بھی
عارضی موبائل قیام گاہیں حاصل کر لی گئیں۔ اس سلسلے میں کسی پلان یا منصوبے
کے مطابق اجازت لینے کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ کیونکہ یہ عارضی قیام گاہیں
ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کی جاسکتی تھیں۔ میٹنگ ہال کے چاروں طرف
گیلری کو تقسیم کر کے چھوٹے چھوٹے دفاتر میں تبدیل کر دیا گیا۔ اس کے علاوہ
ایک شامیانے میں کھانے کا بندوبست بھی کر دیا گیا جہاں بیٹھ کر دوپہر کو گرما گرم
کھانا تناول کیا جا سکتا تھا۔

تمام کا تمام عملہ رضاکاروں پر مشتمل تھا۔ ان لوگوں نے اپنے اپنے فارغ

اوقات سلسلہ احمدیہ کی خدمت کے لئے وقف کر کے اپنے اپنے مفوضہ فرائض نہایت تندہی اور اخلاص سے سرانجام دینے شروع کردیئے تھے۔اساتذہ سکولوں کے اوقات کے بعد آتے۔اسی طرح کارخانوں میں کام کرنے والے بھی اپنی اپنی شفٹ کے اوقات کار کے مطابق بعد میں یا پہلے پہنچ جاتے۔جماعت ایک عرصے سے بچوں اور بچیوں کو زیور تعلیم سے آراستہ کرنے پر زور دے رہی تھی۔یہ اندازہ کہ اس درخت کو کتنے عمدہ پھل لگ چکے ہیں اس وقت ہوا جب خواتین نے مردوں سے بھی زیادہ تعداد میں اپنی رضاکارانہ خدمات پیش کردیں۔

لندن میں لجنہ اماء اللہ نے جو کہ احمدی خواتین کی عالمی تنظیم ہے۔نہایت خوش اسلوبی سے مرکزی دفتر کا سارا کام سنبھال لیا۔ان میں سے اکثریت ایسی خواتین کی تھی جو سیکریٹریل، کمپیوٹر اور دیگر دفتری امور کی بجاآوری کے لئے بھرپور صلاحیتوں کی مالک تھیں اور تربیت یافتہ تھیں۔کچھ خواتین بچوں کو سکول بھیجنے کے بعد دو گھنٹے کے فارغ وقت کو غنیمت جان کر مسجد میں حاضر ہو جاتیں۔خطوں، رپورٹوں اور مختلف اعداد و شمار اور مراسلوں کو سمیٹ کر اپنے ہمراہ گھر لے جاتیں اور شام کے فارغ لمحات میں کام نپٹا دیتیں۔بعض خواتین تو ایسی بھی تھیں جو صبح سے ایک بجے تک مسلسل کام میں لگی رہتیں اور اگلے دن پھر خطوں اور مراسلوں کی نئی کھیپ وصول کرنے کے لئے پہنچ جاتیں۔

عالمی جماعت احمدیہ سے متعلق امور پر محیط ایک کمپیوٹر سسٹم قائم کردیا گیا جس کا تمام تر عملہ رضاکار خواتین پر مشتمل تھا۔اس کمپیوٹر سسٹم سے جماعتی امور، سرعت، سہولت اور زیادہ مرتب اور منظم رنگ میں طے ہونے لگے۔کمپیوٹر کے ذریعہ نام، پتہ، تعلیم، جماعت میں شامل ہونے سے پہلے کے عقائد، ذہنی پس منظر، ادبی ذوق وغیرہ کے لحاظ سے فہرستیں مرتب ہو گئیں۔

ربوہ میں تو تقریباً دو لاکھ پچاس ہزار زائرین کے لئے (جو دسمبر میں ہونے والے سالانہ جلسے میں شرکت کے لئے آتے تھے) مختلف قسم کی رہائش کا انتظام موجود تھا۔ لندن میں یہ ذمہ داری خواتین کی تنظیم کے کاندھوں پر آن پڑی۔

اب یہ خواتین کا فرض قرار پایا کہ (حضرت) خلیفہ رابع سے ملاقات کے لئے آنے والوں کے قیام و طعام کا حسب گنجائش مختلف گھروں میں انتظام کریں۔

لندن آکے (حضرت) خلیفہ رابع کی کام کرنے کی زبردست صلاحیت مزید کھل کر سامنے آئی۔ ربوہ میں کم و بیش ایک ہزار خطوط روزانہ موصول ہوتے تھے۔ اب وہ خطوط لندن آنے لگے۔ دفتری عملہ حسب سابق ان خطوں کی مضمون وار فہرست مرتب کر کے اور نمبر لگا کر ملاحظے کے لئے پیش کرنے لگا۔ کچھ خط تو دعائیہ ہوتے ہیں جن میں کسی مقصد کے حصول کے لئے دعا کی درخواست کی جاتی ہے۔ اگرچہ ایسے خطوط کا تو ایک حد تک مستقل عمومی جواب بھی ہو سکتا ہے لیکن ہر جواب پر آپ خود دستخط فرماتے ہیں۔ اگر ان خطوں میں کوئی خاص بات ہو تو آپ کے علم میں ضرور لائی جاتی ہے مگر فائلوں کو آپ ہر روز خود ملاحظہ کرتے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں:۔

> "دوروں کے دوران قسما قسم کے لوگوں سے میری ملاقات ہوتی ہے۔ بعد ازاں وہ مجھے خط لکھتے ہیں۔ جب وہ کسی ملاقات کے حوالے سے کوئی بات تحریر کرتے ہیں تو خط پڑھتے ہی لکھنے والے کا چہرہ میرے سامنے آجاتا ہے۔ بعض اوقات ان خطوط میں بعض واقعات کا اشارۃً ذکر بھی ہوتا ہے لیکن دفتر کا عملہ اسے سمجھ نہیں سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ میں ہر خط کو ایک نظر دیکھ لیتا ہوں۔ اب مجھے اتنی مشق ہو گئی ہے کہ اہم

مقامات پر آکر میری نظر خود بخود ٹھہر جاتی ہے اور کوئی
ضروری امر نظروں سے اوجھل نہیں ہونے پاتا"۔

باقی ڈاک مختلف محکموں کے ناظمین کے حوالے کردی جاتی ہے تاکہ وہ اپنی آراء اور خطوط کے خلاصوں کو فیصلے کے لئے (حضرت) خلیفہ رابع کی خدمت میں پیش کرسکیں۔ دنیا بھر میں پھیلے ہوئے احمدی ایسے خطوط بھی لکھتے رہتے ہیں اور درخواست کرتے رہتے ہیں۔ کہ (حضرت) خلیفہ رابع اپنے دست مبارک سے خط کا جواب تحریر فرمائیں خواہ جواب ایک جملے کا ہی کیوں نہ ہو۔ ان کی دلی تمنا ہوتی ہے کہ وہ اس تحریر کو خاندان بھر کے لئے باعث برکت سمجھ کر ہمیشہ کے لئے محفوظ کرلیں۔

آپ ایسے خطوط کا ان لوگوں کے حسب منشاء التزام سے جواب دینے کی کوشش فرماتے ہیں۔ پھر وہ خطوط ہیں جن میں ذاتی امداد کی درخواست کی جاتی ہے۔ ان کا جواب خاصا مشکل اور وقت طلب ہوتا ہے۔ آپ فرماتے ہیں :-

"بعض خطوط تو جذبات سے اتنے لبریز ہوتے ہیں کہ ان کا زبانی جواب لکھوانا تقریباً ناممکن ہوجاتا ہے۔ ایسی صورت میں شدت جذبات سے مغلوب ہوکر میں اکیلا ایک الگ کمرے میں جا بیٹھتا ہوں اور کمرہ بند کرکے اپنے ہاتھ سے جواب لکھنے لگتا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ لکھنے والوں نے کس اپنائیت سے یہ خطوط لکھے ہیں۔ لہٰذا میں یہ بھی جانتا ہوں کہ ان کی خواہشات کے مطابق ان خطوں کے جواب بھی اپنے ہاتھ سے لکھ کردوں۔

کام کی رفتار کو تیز تر کرنے کے لئے ابتداء میں ٹیپ

ریکارڈر کے استعمال کا تجربہ بھی کیا گیا لیکن جلد ہی اسے ترک کر دیا گیا۔

دراصل مائکروفون تو ایک بے جان آلہ ہے۔ اس سے زندہ اور جیتا جاگتا تعلق قائم کرنا میرے بس کی بات نہیں۔ کوشش کے باوجود یہ احساس برقرار رہتا ہے کہ میں ایک جیتے جاگتے انسان کی بجائے ایک مشین سے بات کر رہا ہوں۔ ٹیپ ریکارڈر کا استعمال تو میں اب بھی کبھی کبھی کرتا ہوں لیکن عام طور پر صرف سفر میں اور وہ بھی جب بذریعہ کار سفر کر رہا ہوتا ہوں کیونکہ اس حالت میں ہاتھ سے لکھنے کا کام عملاً ناممکن ہو جاتا ہے۔ خط کا پورا جواب تو میں پھر بھی ریکارڈ نہیں کرواتا بس ہدایات دیتا جاتا ہوں کہ فلاں معاملے کو اس طرح نمٹایا جائے۔ میں سمجھتا ہوں کہ میرے مطالعے کی رفتار بھی پہلے سے بڑھ گئی ہے"۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ آپ کو بیک وقت تین تین کام کرنے پر بھی قدرت حاصل ہو گئی ہے۔ آپ فرماتے ہیں:۔

"ہوتا یوں ہے کہ میں دستخط کے لئے ساری ڈاک اپنے کمرے میں لے جاتا ہوں۔ وہاں اللہ کا نام لے کر ایک دو کی بجائے تین تین کام بیک وقت شروع کر دیتا ہوں۔ احمدی احباب مجھے خط ہی نہیں کیسٹس بھی بھیجتے رہتے ہیں جن پر انہوں نے اپنے خیالات کے علاوہ نظمیں بھی ریکارڈ کی ہوتی ہیں۔ اگر کوئی شخص اتنی محنت کرتا ہے تو میرا جی چاہتا ہے

کہ اس کی مرسلہ کیسٹ سنوں۔ چنانچہ ادھر میں خطوط کا مطالعہ کر کے جوابات پر دستخط کر رہا ہوتا ہوں اور ادھر کیسٹس لگا دیتا ہوں۔ اگر ٹیلیویژن پر کوئی اہم پروگرام آ رہا ہو جسے میں دیکھنا چاہوں تو ٹیلیویژن چلا دیتا ہوں۔ اگر پروگرام کا کوئی حصہ میری توجہ کھینچ لے جسے بغور دیکھنا ضروری ہو تو کیسٹ پلیئر کو بند کر دیتا ہوں لیکن میرا قلم نہیں رکتا۔ میں بدستور دستخط کرتا رہتا ہوں۔ یہ کام تو بہرحال بلا توقف جاری رہتا ہے۔ میں جب خط پر نظر دوڑاتا ہوں تو سارے خط کا مضمون اور مفہوم ایک ہی نظر میں ابھر کر سامنے آ جاتا ہے۔ اس کے بعد میں جواب پر دستخط کر دیتا ہوں۔ اسی طرح وقت صرف بچتا ہی نہیں بلکہ اس کا نہایت مفید اور دلچسپ استعمال بھی ہو جاتا ہے۔

دنیا کے گوشے گوشے سے جماعت کے افراد انواع واقسام کی کتب بھی بھیجتے رہتے ہیں۔ یہ مذہبی کتب بھی ہوتی ہیں اور دوسرے مضامین پر مشتمل کتب بھی۔ ارسال کرنے والوں کو بعض کتب پسند آتی ہیں اور وہ سوچتے ہیں کہ شائد مجھے بھی پسند آئیں۔ بسا اوقات یہ کتب واقعات عالم، سیاست اور مقامی حالات کے تجزیوں پر مشتمل ہوتی ہیں۔ ربوہ کے تجربے کو مدنظر رکھ کر ہم نے یہاں لندن میں بھی ماہرین کی ایک پہلی سی مطالعاتی ٹیم تیار کر لی ہے۔ یہ لوگ اپنی اپنی جگہ اپنے مخصوص عملی میدان میں سند کا درجہ رکھتے ہیں۔ کم ازکم

میں توان کی رائے کو وقیع اور مستند خیال کرتا ہوں۔ یہ لوگ میرے لئے مختلف کتب کا مطالعہ کرتے رہتے ہیں۔ دوران مطالعہ وہ زیر نظر کتب پر قابل ذکر اور اہم مقامات پر نشان لگا دیتے ہیں۔ اس طرح میں ہر ہفتے بہت سی کتب کا بالواسطہ مطالعہ کرلیتا ہوں اور میرے ذہن میں مختلف ممالک کے متعلق تازہ ترین معلومات کا ایک بیش بہا ذخیرہ جمع ہو جاتا ہے۔ اگر کسی خاص امر کے بارے میں مجھے ذاتی طور پر علم ہو تو میں متعلقہ مصنف کی معلومات اور رائے کا تنقیدی نظر سے جائزہ لینے کی کوشش کرتا ہوں۔ چنانچہ اگر کسی واقعہ یا شخصیت کے متعلق مصنف کی معلومات، طرز فکر اور رائے کو اپنی ذاتی معلومات اور سوچ اور رائے کے مطابق محسوس کروں تو میں مناسب سمجھتا ہوں کہ دیگر امور کے بارے میں بھی اس مصنف کے جائزوں اور خیالات کو عام طور پر درست اور وقیع خیال کروں"۔

☆ ☆ ☆

24

دو برطانوی سیاست دانوں میں کشمکش

جب (حضرت) خلیفہ رابع کے لندن میں قائم کردہ دفاتر نے خوش اسلوبی سے کام کرنا شروع کردیا تو آپ نے اپنی توجہ اولاً یورپ اور افریقہ کے ممالک کی طرف مبذول فرمائی۔

برطانیہ تشریف لانے کے بعد آپ نے یہ تمام عرصہ ارادۃً خاموشی سے گزارا تھا۔اب وقت آگیا تھا کہ آپ اپنے تبلیغی دوروں کو از سرنو شروع کرتے۔چنانچہ آپ نے فروری ۱۹۸۵ء میں سب سے پہلے ہالینڈ کے دورے پر جانے کا فیصلہ کیا۔ آپ یکم مئی ۱۹۸۴ء کو برطانیہ پہنچے تھے اور یہاں آئے ہوئے اب دس مہینے گذر چکے تھے۔

لیکن امرائے جماعت اور دیگر احباب نے مشورہ دیا کہ موجودہ حالات میں پھونک پھونک کر قدم رکھنے کی ضرورت ہے۔کسی بھی ایسے فیصلے کے وقت انتہائی حزم واحتیاط سے کام لینا ہوگا۔انہوں نے عرض کی کہ آپ برطانیہ میں ایک زائر کی

حیثیت سے مقیم ہیں۔ آپ کا ویزا ابھی زائرین ہی کا ویزا ہے۔ اگر اسی وقت آپ برطانیہ سے باہر تشریف لے گئے تو عین ممکن ہے کہ واپسی پر دوبارہ داخلے کی اجازت نہ ملے۔۔ جس قسم کے ویزے کی درخواست ہوم آفس (وزارت داخلہ) کے زیر غور ہے' اس پر بھی ابھی کوئی فیصلہ نہیں ہوا' نہ ہی کسی قسم کی اطلاع موصول ہوئی ہے۔

تفصیل اس کی یہ ہے کہ اگست ۱۹۸۴ء میں (حضرت) خلیفہ رابع نے خواہش کی تھی کہ ان کو بطور منسٹر آف ریلیجن یعنی مذہب کے مبلغ اور نمائندے کی حیثیت سے جزائر برطانیہ میں قیام کی اجازت دی جائے۔ آپ کی اس درخواست کو مسٹر ڈیوڈ میلور (Mr. DAVID MELLOR) کی تائید حاصل تھی۔ مسٹر ڈیوڈ میلور ایک معزز رکن پارلیمنٹ تھے۔ آپ پٹنی کے حلقے سے جہاں مسجد فضل لندن واقع ہے' منتخب ہوئے تھے۔ قدامت پسند پارٹی میں ان کا اچھا خاصا اثر ورسوخ تھا اور وہ مستقبل قریب میں کابینہ کے ممبر یعنی سینیر وزیر بننے والے تھے۔ مسٹر ڈیوڈ میلور نے (حضرت) خلیفہ رابع کی تائید کرتے ہوئے کہا تھا کہ انکی رائے میں "آپ ایک انتہائی دیانت دار' بااخلاق' معزز..... اور عالمی شہرت کی مالک مشہور ہستی ہیں"

اس درخواست کے جواب میں اب تک سوائے معمول کی رسید کے کہ "درخواست وصول پائی" حکومت کی طرف سے کسی قسم کے رد عمل کا اظہار نہیں ہوا تھا اور سرکاری سطح پر مکمل خاموشی طاری تھی اگرچہ اس میں بھی شک نہیں کہ پس پردہ بہت کچھ ہو رہا تھا۔

یہ درخواست کہ (حضرت) خلیفہ رابع کو بارہ ماہ کے لئے بطور نمائندہ مذہب برطانیہ میں رہائش کی اجازت دی جائے' بڑی سوچ سمجھ اور غور و غوض کے بعد

دی گئی تھی۔ اگر آپ ایک پناہ گزین کی حیثیت سے درخواست دیتے تو برطانوی حکومت کے لئے ایک پریشان کن صورت حال پیدا ہو جاتی۔ بے شک یہ بات تو ثابت شدہ تھی کہ آپ کو اپنے مذہبی عقائد کی بنا پر ظلم و ستم کا نشانہ بنایا جا رہا تھا لیکن ظاہر ہے کہ اس صورت میں جنرل ضیاء اور اس کی حکومت کی طرف سے شور و غوغا اور احتجاج کا ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوتا۔ ایک ممکنہ نتیجہ یہ بھی نکلتا کہ پاکستانی احمدیوں پر عرصہ حیات مزید تنگ کر دیا جاتا اور ظلم و ستم کی مہم تیز تر کر دی جاتی۔ اس لئے (حضرت) خلیفہ رابع ایک عرصہ پہلے دل ہی دل میں فیصلہ کر چکے تھے کہ وہ پناہ گزین کی حیثیت سے کبھی پناہ کی درخواست نہیں کریں گے۔

برطانوی امیگریشن قوانین کے سیکشن ۳۱ کے تحت برطانیہ میں قیام کے لئے درخواست دینے سے اتنا تو ہوا کہ شور و غوغا اور جھگڑے کی صورت حال پیدا نہ ہوئی لیکن ادھر پاکستان کے ملاں عوام الناس کو یہ کہہ کر بھڑکا رہے تھے۔ کہ (حضرت) خلیفہ رابع ایک شخص مسمی اسلم قریشی کے قتل کے ذمہ دار ہیں اور جنرل ضیاء سے بار بار مطالبہ کر رہے تھے کہ اس جرم کی بناء پر (حضرت) خلیفہ رابع کو وطن واپس بلایا جائے اگرچہ مبینہ مقتول کی لاش برآمد نہیں کی جاسکتی تھی۔ لیکن بنیاد پرستوں اور کٹھ ملاؤں کی زبان کون پکڑ سکتا ہے۔ وہ مسلسل شور مچائے جا رہے تھے کہ (حضرت) خلیفہ رابع نے ہی اسلم قریشی کو قتل کیا ہے۔

جیسا کہ اوپر ذکر آچکا ہے برطانیہ میں امیگریشن اور متعلقہ امور، وزارت داخلہ ہی کی زیر نگرانی طے پاتے ہیں چنانچہ اس مرتبہ بھی وزارت داخلہ کی طرف سے وزارت خارجہ اور دولت مشترکہ کی وزارت سے رائے طلب کی گئی۔ اسی طرح لندن اور اسلام آباد میں برطانوی سفارت خانوں کے درمیان سوال و جواب اور جواب الجواب کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا۔ برطانوی سفیر مقیم

پاکستان نے کہا کہ میرے نزدیک (حضرت) خلیفہ رابع کو برطانیہ میں قیام کی اجازت نہ دینے کی کوئی معقول وجہ نظر نہیں آتی۔ ہاں البتہ میں یہ ضرور سمجھتا ہوں کہ اگر (حضرت) خلیفہ رابع نے احمدیوں پر ہونے والے ظلم و ستم کا یہاں چرچا شروع کر دیا تو ضیاء الحق کی طرف سے حکومت برطانیہ کو شدید دباؤ کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس کا مطالبہ ہو گا کہ یا تو (حضرت) خلیفہ رابع کی زبان بندی کی جائے یا انہیں واپس پاکستان پہنچا دیا جائے۔

جنوری ۱۹۸۵ء کا مہینہ آن پہنچا لیکن برطانوی ہوم آفس نے کسی قسم کا جواب دینا مناسب نہ سمجھا۔ بالآخر (حضرت) خلیفہ رابع نے واشگاف الفاظ میں بتا دیا کہ ویزا ملے نہ ملے وہ اگلے ماہ یقینی طور پر ہالینڈ کے دورے پر روانہ ہو جائیں گے۔

لیکن شکر ہے کہ چند دنوں کے بعد ویزا بھی مل گیا۔

جب آپ ایمسٹرڈم پہنچے تو اخباری نمائندوں اور اخبار نویسوں نے جیسا کہ پہلے سے اندیشہ تھا، پاکستان میں موجود صورت حال کے بارے میں کھل کر سوالات کئے۔ جواباً آپ نے صرف اتنا فرمایا کہ پاکستان میں صورت حال بہت "نازک" ہے۔

اس پر جنرل ضیاء الحق غصے سے لال پیلا ہو گیا۔ پہلا کام تو اس نے یہ کیا کہ اسلام آباد میں برطانوی سفیر کو بلا کر اسے دھمکی دی کہ اگر (حضرت) خلیفہ رابع کے وطیرے میں تبدیلی نہ آئی تو پاکستان اور برطانیہ کے تعلقات خراب ہو سکتے ہیں اور اگر انہیں اسی طرح دوسرے ممالک میں سفر کی کھلی اجازت دے دی گئی تو وہ جس ملک میں بھی جائیں گے وہاں پاکستان کی حکومت پر نکتہ چینی کریں گے۔ پاکستان کے لئے یہ بات بڑی پریشان کن ہو گی۔ کیونکہ (حضرت) خلیفہ رابع فصیح

البیان ہیں اور بڑے مؤثر اور دلنشین انداز میں گفتگو کرنے کے ماہر ہیں۔
پاکستان میں مقیم برطانوی سفیر کے اندیشے درست ثابت ہوئے۔ اس نے کہا "وہی ہوا نا! جس کا ڈر تھا اور جس کے متعلق میں قبل از وقت خبردار کر چکا تھا"۔
اس نے ضیاء کے احتجاج کو سر جیفری ہاؤ (SIR GEOFFREY HOWE) تک جو برطانیہ کے وزیر خارجہ تھے، پہنچا دیا۔ سر ہاؤ نے بہ زعم خود ایک فیصلہ کن قدم اٹھایا۔ یہ کوئی فوری اقدام نہ تھا۔ ویسے بھی سر جیفری اپنے فیصلوں کے حوالے سے کسی قابل فخر شہرت کے مالک نہیں تھے، لیکن انہوں نے اس موقع پر ڈرتے ڈرتے اور سوچ بچار کے بعد اگر کوئی غیر معمولی عجلت دکھائی بھی تو بد قسمتی سے اس کی وجہ سے انہیں مبارکباد کا مستحق قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اپریل ۱۹۸۵ء میں سر جیفری نے ہوم سیکرٹری مسٹر لی اون برٹن (Mr. LEON BRITTAN) کو ایک مراسلہ بھیجا جس میں انہوں نے لکھا کہ آپ نے (حضرت) خلیفہ رابع کو مذہبی راہنما کی حیثیت سے برطانیہ میں بارہ ماہ تک قیام کی اجازت دے کر مجھے پریشان کر دیا ہے۔ اس قسم کی درخواست برطانیہ میں آنے سے پہلے دی جانی چاہئے تھی نہ کہ بعد میں، جیسا کہ موجودہ صورت حال میں ہوا ہے۔
انہوں نے ازمنہ وسطیٰ کے ایک نیم کلیسیائی برخود غلط لیکن روایتی اور سکہ بند انگریز کی طرح مزید لکھا کہ میرے خیال میں قاعدہ نمبر ۳۱ (جس کے ماتحت یہ اجازت دی گئی ہے) کا استعمال تو صرف اس صورت میں جائز ہے جب ریاست ہائے متحدہ امریکہ سے کوئی پادری کسی اور پادری کی جگہ لینے کے لئے عارضی طور پر جزائر برطانیہ میں قیام کرنا چاہے۔ لہٰذا اس قاعدے کا اطلاق کسی ایسے مسلمان مذہبی راہنما پر ہرگز نہیں ہو سکتا جو برصغیر سے آیا ہو۔ اس لئے میں بہت فکر مند ہوں۔ آپ نے (حضرت) خلیفہ رابع کو برطانیہ میں قیام کی خصوصی اجازت تو دے

دی ہے لیکن اس ممکنہ خفت اور شرمندگی کا ذرہ بھر خیال نہیں کیا جو برطانیہ میں ان کی مسلسل موجودگی کی وجہ سے ہمیں ہوگی- علاوہ ازیں اس بات کا بھی خطرہ ہے کہ (حضرت) خلیفہ رابع کی موجودگی سے شہ پاکر کلیسیا سے اختلاف رکھنے والے عناصر جو پہلے ہی علمِ بغاوت بلند کرنے کے لئے پر تول رہے ہیں اور شیر نہ ہو جائیں- اس طرح (حضرت) خلیفہ رابع کا لندن میں قیام دو ممالک یعنی پاکستان اور برطانیہ کے باہمی تعلقات میں کشیدگی کا باعث نہ بن جائے-

سر جیفری ہاؤ نے بڑی دیدہ دلیری اور ڈھٹائی سے وزیر داخلہ سے لفظاً مطالبہ کیا کہ وہ دو ٹوک الفاظ میں (حضرت) خلیفہ رابع کو بتادیں کہ انہیں صرف بارہ ماہ کے لئے برطانیہ میں قیام کی اجازت دی گئی ہے- نیز یہ کہ اگر وہ اجازت نامے کی تجدید کے لئے درخواست دیں تو فیصلہ کرتے وقت پوری سوچ سمجھ اور احتیاط سے کام لیا جائے-

ظاہر ہے وزیر خارجہ کی یہ مداخلت اور وہ بھی ایک ایسے معاملے میں جس کا تعلق صرف اور صرف وزارت داخلہ سے تھا سراسر بے جا تھی اور ہوم آفس کے لئے خاصی پریشانی اور شرمندگی کا باعث بن رہی تھی- وزیر داخلہ کے مشیروں کا موقف بڑا معقول اور واضح تھا- ان کا کہنا تھا کہ وزارت خارجہ اور برطانوی سفیر مقیم اسلام آباد سے مشورے کے بعد ہی (حضرت) خلیفہ رابع کو برطانیہ میں قیام کی اجازت دی گئی تھی- مُشتے بعد از جنگ کے مترادف اب یہ بے وقت کا شور تھا- حقیقت یہ تھی کہ اگست ۱۹۸۴ء میں درخواست کے موصول ہوتے ہی وزارت خارجہ کو اعتماد میں لے لیا گیا تھا- پورے دس مہینے کی لمبی خاموشی کے بعد اب سر جیفری کو اچانک یاد آگیا کہ (حضرت) خلیفہ رابع کو قیام کی اجازت دینے کے نتائج کیا ہوں گے اور جنرل ضیاء کا ردعمل کیا ہو گا-

لیکن اب تیر کمان سے نکل چکا تھا اور فیصلہ کیا جا چکا تھا۔

اصل بات یہ ہے کہ سر جیفری نے لب کشائی کی زحمت اس وقت گوارا کی تھی جب (حضرت) خلیفہ رابع نے ہالینڈ میں اخبار نویسوں کے سامنے مندرجہ بالا بیان دیا تھا جس پر جنرل ضیاء نے سیخ پا ہو کر برطانوی سفیر مقیم پاکستان کے سامنے دہائی دی تھی۔ اس کا برطانوی وزارت داخلہ کے مشیروں نے یہ جواب دیا تھا کہ (حضرت) خلیفہ رابع کوئی معمولی مذہبی راہنما نہیں۔ وہ عالمی جماعت احمدیہ کے سربراہ اور امام ہیں۔ دنیا بھر میں پھیلے ہوئے احمدی مسلمانوں کے تبلیغی مراکز میں مبلغین کی تقرریاں آپ ہی کرتے ہیں۔ لہٰذا کوئی وجہ نہیں کہ وہ لندن مشن کے لئے از خود اپنی تقرری نہ کر سکیں۔

وزارت داخلہ کے مشیروں نے یہ بھی کہا۔ اگر قیام کی مذکورہ اجازت نہ دی جاتی تو درخواست کنندہ کو اپیل کرنے کا حق حاصل تھا۔ وہ برطانیہ میں پناہ کے لئے بھی درخواست دے سکتے تھے لیکن اس صورت حال سے تو ہم بھی بچنا چاہتے تھے۔ پاکستان کے موجودہ سیاسی حالات کی وجہ سے غالب امکان بھی یہی تھا کہ (حضرت) خلیفہ رابع کی پناہ کی درخواست منظور ہو جاتی۔ لیکن اس کا مطلب یہ ہوتا گویا ہم پناہ کی منظوری دیکر جنرل ضیاء کی حکومت کو ہدف تنقید بنا رہے ہیں۔ اور اس کی تنقیص کر رہے ہیں۔ اس کے دو تلخ نتیجے نکلتے۔ اول یہ کہ پاکستان میں احمدیوں پر ڈھائے جانے والے ظلم و ستم کی رفتار میں مزید تیزی اور شدت آجاتی۔ دوسرے برطانیہ اور پاکستان کے باہمی تعلقات پر تباہ کن اثرات مترتب ہوتے۔

انہوں نے مزید کہا کہ احمدیوں سے جو سلوک اس وقت پاکستان میں روا رکھا جا رہا ہے۔ اگر اس کے خلاف (حضرت) خلیفہ رابع نے صدائے احتجاج بلند کی ہے تو حکومت پاکستان کو اس پر کسی قسم کی حیرت کا اظہار نہیں کرنا چاہئے اور

اس بات کا تو قطعاً کوئی ثبوت موجود نہیں جس سے یہ نتیجہ نکالا جاسکے کہ جماعت احمدیہ حکومت پاکستان کا تختہ الٹنے کے لئے کسی بھی طرح کی کوئی سازش یا کسی بھی قسم کے تشدد کی منصوبہ بندی' تیاری یا حوصلہ افزائی کر رہی ہے۔

اپنے مشیروں کی آراء کا سنجیدگی سے جائزہ لینے کے بعد مسٹر برٹن نے نہایت شستہ لیکن واضح الفاظ میں سر جیفری ہاؤ کو جواب دیا کہ وہ مذہب یا سیاست کی بنا پر ظلم وستم کا نشانہ بننے والوں کو پناہ دینے کی شریفانہ حکمت عملی سے کسی قیمت پر بھی دست بردار ہونے کے لئے تیار نہیں ہیں خواہ اس سلسلے میں پناہ کا لفظ استعمال کیا گیا ہو یا نہ کیا گیا ہو۔ انہوں نے سر جیفری ہاؤ کو بتایا کہ۔

> "آپ کو (حضرت) مرزا طاہر احمد کی اس ملک میں موجودگی سے جو تشویش لاحق ہو رہی ہے مجھے اس پر حیرت ضرور ہے کیونکہ میں نے تو اگست اور پھر ستمبر ۱۹۸۴ء میں آپ کی وزارت کو پورے اعتماد میں لے کر فیصلہ کیا تھا۔ اس وقت تو آپ نے کوئی اعتراض نہیں کیا تھا"

اس میں کوئی شک نہیں کہ پاکستان میں "مذہب کی بناء پر کھلے بندوں امتیازی سلوک" روا رکھا جا رہا ہے۔ اس لئے امام جماعت احمدیہ اگر حکومت پاکستان پر تنقید کریں تو اس پر متعجب ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ اگر وہ قانون کے دائرے کے اندر رہتے ہوئے حکومت پاکستان کی غلط کاریوں کا تذکرہ کریں تو ہم انہیں کیسے روک سکتے ہیں۔ ان کا عملی سیاست سے تو دور کا بھی تعلق نہیں۔ نہ تو وہ کوئی تخریب کار ہیں اور نہ ہی وہ حکومت پاکستان کا تختہ الٹنے کی تلقین کر رہے ہیں۔

اب یہ بات کھل کر سامنے آگئی کہ مسٹر برٹن نے سر جیفری ہاؤ کی اس دقیانوسی اور بے سروپا تجویز کو کوئی وقعت نہیں دی۔ کیونکہ قاعدہ نمبر ۳۱ کی

منظوری دیتے وقت برطانوی پارلیمنٹ کا ہرگز یہ مقصد نہیں تھا کہ اس قاعدے کا اطلاق صرف ان پادریوں پر ہو گا جو باہمی تبادلے کی کسی سکیم کے تحت امریکہ سے سر جیفری ہاؤ کے سرسبز اور پُر فضا حلقہ انتخاب میں سیر و سیاحت کے مزے لوٹنے آئے ہوں۔ اپنے مؤقف کی وضاحت کرتے ہوئے مسٹر برٹن کے لہجے میں کچھ تلخی بھی آ گئی۔ انہوں نے کہا:-

"نمائندگان مذہب، مبلغین، مذہب کے مختلف فرقوں سے تعلق رکھنے والے اور اسی نوع کے دیگر الفاظ سے کوئی ایک مذہب نہیں بلکہ تمام مذاہب مراد ہیں۔

ہوم آفس کے لئے یہ بات غیر معمولی نہیں کہ وہ کسی غیر ملکی کے برطانیہ میں داخلہ کے لئے یہ لازمی قرار دے کہ وہ اپنی روانگی سے قبل اپنے ملک کے برطانوی سفارت خانے کے ذریعہ درخواست دے جبکہ یہ امر یقینی ہو کہ اگر وہ قواعد کے مطابق درخواست دیتا تو اس کی درخواست ضرور منظور ہو جاتی۔ اس صورت میں یہ ضروری نہیں سمجھا جاتا کہ اس قاعدے پر لفظاً عمل کیا جائے۔ لہٰذا عموماً ایسی درخواستوں کو اس قاعدے سے مستثنیٰ قرار دے دیا جاتا ہے اور نہ ہی اس قاعدے کا یہ مقصد تھا کہ مذہب کے ان نمائندگان کی تعداد پر پابندی لگائی جائے۔ ظاہر ہے کہ آنے والے برصغیر پاک و ہند سے بھی آتے ہیں اور ان میں جماعت احمدیہ سے تعلق رکھنے والے نمائندگان مذہب بھی یقیناً شامل ہوتے ہیں

"یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ (حضرت) مرزا طاہر احمد کوئی معمولی امام یا مشنری نہیں ہیں۔ اور کچھ نہیں تو کم از کم وہ مذہب کے منسٹر یا نمائندہ ضرور ہیں اور اگر جماعت احمدیہ کی عالمگیر حیثیت کو پیش نظر رکھا جائے تو ہم کس منہ سے کہہ سکتے ہیں کہ (حضرت) مرزا طاہر احمد کی برطانیہ میں مصروفیات کی نوعیت مذہبی نہیں ہو گی؟"

برٹن نے سر جیفری ہاؤ کی اس تجویز کو ماننے سے بھی صاف انکار کر دیا کہ اگر

(حضرت) خلیفہ رابع خاموش رہنے کا وعدہ نہ کریں تو انہیں برطانیہ میں قیام کی اجازت نہ دی جائے۔ مسٹر برٹن نے کہا "ہم نے انہیں یہ تاثر تو نہیں دیا کہ وہ بالآخر یہاں ہمیشہ کے لئے آباد ہو جائیں البتہ انہیں یہ حق بہرحال حاصل ہے کہ آئندہ مارچ میں اپنے قیام کی مدت ختم ہونے پر وہ اس کی توسیع کے لئے درخواست کر سکیں اور اگر وہ چاہیں تو امیگریشن کے قواعد و ضوابط کے تحت مستقل قیام کی درخواست بھی کر سکتے ہیں۔

اور پھر بڑے ہی مہذب لیکن منجمد اور برفانی لہجے میں مزید کہا کہ

"اگر وہ ایسی درخواست کرنا پسند فرمائیں تو اسے یقیناً منظور بھی کر لیا جائے گا"۔

بایں ہمہ برطانیہ اور پاکستان کے بنیاد پرست مسلمانوں کی طرف سے مسلسل دباؤ میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ ان کا مطالبہ تھا کہ (حضرت) خلیفہ رابع کو جبراً پاکستان واپس بھجوایا جائے۔ برطانیہ سے تعلق رکھنے والی ایک عجیب و غریب تنظیم مسلم پیرنٹس ایسوسی ایشن نے ایک اور عجیب و غریب شکایت کی کہ چونکہ (حضرت) مرزا طاہر احمد نسلی تعلقات میں باہمی پیار اور محبت کا ماحول پیدا کر رہے ہیں اس لئے انہیں برطانیہ سے روانہ کر دینا چاہئے۔

واقعی یہ ایک ایسا "جرم" تھا جس کا بلا جھجک اعتراف کرتے ہوئے آپ یقیناً خوشی محسوس کرتے۔

وقت آنے پر (حضرت) خلیفہ رابع نے معمول کے مطابق ویزے کے لئے درخواست بھی دے دی۔ جس سے انہیں یہ حق حاصل ہو گیا کہ اگر وہ چاہیں تو مستقل طور پر برطانیہ میں قیام فرما سکتے ہیں اور سر جیفری ہاؤ کی کوشش کے باوجود یہ درخواست منظور کر لی گئی۔ اب (حضرت) خلیفہ رابع جس ملک کا بھی چاہتے سفر

کرسکتے تھے اور بغیر کسی دقت کے واپس برطانیہ میں آجاسکتے تھے۔ اب انہیں یہ حق بھی حاصل ہو گیا کہ قانون کی حدود میں رہتے ہوئے وہ جنرل ضیاء اور ان مظالم کے خلاف جو اس کے ہاتھوں جماعت احمدیہ پر ڈھائے جارہے تھے آواز بلند کرسکیں۔ وہ جنرل ضیاء کے خلاف مسلح بغاوت کا اعلان تو نہیں کرسکتے تھے البتہ یہ تو کہہ سکتے تھے کہ خدا (تعالیٰ) اسے اس کے مظالم کی سزا ضرور دیگا چنانچہ یہ بات آپ نے کہی اور ڈنکے کی چوٹ پر بڑی تحدی سے کہی۔

☆ ☆ ☆

25

دعوت الی اللہ

اپنے خطبات کے دوران (حضرت) خلیفہ رابع کی زبان پر ایک بار ایک ایسا جملہ جاری ہوا جو ان کے عملے کے ایک رکن کو بہت پسند آیا اس نے یہ جملہ چھپوا کر تقسیم کردیا۔ آج یہی جملہ دنیا بھر کی تمام احمدی مساجد اور مشنوں کے نوٹس بورڈوں پر آویزاں ہے۔ آپ نے فرمایا تھا:۔

"روزانہ بلاناغہ رات سونے سے پہلے اپنے احتساب کے عمل کو ایک فرض قرار دے لو اور تنہائی میں اپنی ان مساعی کی قدر و قیمت کا صحیح صحیح اندازہ لگانے کی کوشش کرو جو تم نے دن بھر میں اللہ تعالیٰ کا پیغام اوروں تک پہنچانے کے سلسلے میں کیں۔"

مقصد اس نصیحت کا یہ تھا کہ اپنی اپنی جگہ ہر شخص اپنے طور پر اس نصیحت پر خاموشی سے عمل پیرا ہو جائے۔ یہی وہ نصیحت تھی جس پر عمل پیرا ہونے کے لئے

(حضرت) خلیفہ رابع خود بھی عمر بھر کوشاں رہے۔
لیکن کبھی کبھار ان کے متبعین نے خاموشی کے رخ پر سے پردہ اٹھاتے ہوئے آپ کے عہد خلافت کے کارہائے نمایاں کو کھل کر بیان کرنے کی کوشش بھی کی۔ ایک ایسے ہی موقع پر سیرالیون کی کابینہ کے ایک رکن وزیر نے برطانیہ میں منعقد ہونے والی ایک کانفرنس میں جماعت احمدیہ کی کامیابیوں اور کامرانیوں کا سر عام یوں ذکر کیا۔

"میرا ملک سیرالیون ایک چھوٹا سا ملک ہے جس کی آبادی صرف چالیس لاکھ نفوس پر مشتمل ہے۔ ہم متعدد مسائل سے دوچار ہیں جن میں سے بہت سے مسائل وہاں کی مذہبی تنظیموں کے پیدا کردہ ہیں لیکن جماعت احمدیہ کا دامن بالکل بے داغ ہے اور اس کا اس قسم کے مسائل سے دور کا تعلق بھی نہیں۔ تعلیمی اداروں ہی کو لے لیجئے۔ جماعت کے زیر انتظام چلنے والے ادارے ایک ممتاز حیثیت کے مالک ہیں۔ ان کی قابل رشک شہرت ہی کا نتیجہ ہے کہ ہر سال ان میں داخلہ لینے والے امیدواروں میں بڑا سخت مقابلہ ہوتا ہے اور پھر قابل ذکر بات یہ ہے کہ جماعت احمدیہ سیرالیون میں بالکل بے غرض اور بے لوث خدمات بجالا رہی ہے۔ ان کی خدمت خلق کی مساعی کے ساتھ کسی قسم کے سیاسی یا اقتصادی مقاصد وابستہ نہیں ہیں"۔

اس سلسلے میں انہوں نے اعداد و شمار پیش کرتے ہوئے کہا:۔

"اس وقت جماعت کے زیر اہتمام نوے پرائمری سکول

ہیں- بیس ثانوی اور دو عربی سکھانے والے سکول- تین ہسپتال اور ایک اخبار کامیابی سے چل رہے ہیں- ۱۶۹ جماعتیں ہیں اور تقریباً ۴۵۰ مساجد- ۱۴ تبلیغی مراکز اور ایک جامعۃ المبشرین ہے- غیر ممالک سے آنے والے بارہ مشنری کام کررہے ہیں جبکہ بارہ مشنری مقامی ہیں اور سیرالیون کے رہنے والے ہیں- مشرقی اور مغربی افریقہ کے ممالک کو جماعت احمدیہ کی طرف سے دی جانے والی حیرت انگیز امداد پر غور تو کریں- ۱۹۸۲ء سے لے کر ۱۹۹۱ء تک کے مختصر عرصے میں صرف گھانا میں آٹھ پرائمری اور ۵۴ نرسری سکول جاری ہو چکے تھے- اسی طرح لائبیریا میں بھی چھ اور زائرے میں چار پرائمری اور ایک ثانوی سکول کا اجرا ہو چکا تھا"۔

گیمبیا کے ایک وزیر کے بقول وہاں ہر چار زیر تعلیم طلباء و طالبات میں سے ایک طالب علم جماعت احمدیہ کے زیر انتظام چلنے والے سکولوں میں تعلیم پا رہا تھا- افریقہ میں مجموعی طور پر جماعت احمدیہ اس وقت ۲۸ ہسپتالوں- ۳۷ ثانوی سکولوں- ۴۴ جونیئر سیکنڈری سکولوں اور ۲۰۴ پرائمری سکولوں کا خرچ برداشت کر رہی ہے-

۱۹۲۱ء میں جماعت احمدیہ کے پہلے مشنری نے گھانا کی سرزمین پر قدم رکھا تھا- ۱۹۸۰ء کی مردم شماری کے مطابق یہاں کی کل ایک کروڑ تیس لاکھ آبادی کے آٹھ فیصد لوگوں نے بتایا کہ ہم احمدی مسلمان ہیں- گھانا میں جماعت احمدیہ کی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے وہاں کے اٹارنی جنرل نے مندرجہ ذیل الفاظ میں خراج

تحسین پیش کیا:

"ہمارے ہاں جماعت احمدیہ ایک انتہائی مفید پروگرام پر مرحلہ وار عمل کر رہی ہے۔ ۱۰۲ پرائمری، پانچ ثانوی مدارس، ایک ٹریننگ کالج اور پانچ ہسپتال جماعت کی انتھک قربانیوں کے مرہون منت ہیں۔ ہمارے نوجوان طلباء کو اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے وظائف دیئے جا رہے ہیں اور ابھی پچھلے دنوں جماعت احمدیہ گھانا کے مشن نے ایک قابل قدر زرعی پروگرام کا آغاز کیا ہے"۔

پہلے تو وہ فرط جذبات سے مغلوب ہو کر کے پھر پُر زور انداز میں کہنے لگے۔

"لیکن آپ نے سب سے گراں قدر خدمت جو ہمارے ملک کی کی ہے وہ مثالی نوجوان طلباء ہیں جو آپ کے تعلیمی ادارے پیدا کر رہے ہیں۔ یہ نوجوان سچائی، دیانت، منکسر المزاجی، ایثار اور قربانی کی اعلیٰ صفات سے متصف ہو کر ان اداروں سے فارغ التحصیل ہوتے ہیں اور بآسانی پہچانے جاسکتے ہیں۔

بہت سے ایسے مقامی احمدی حضرات بھی ہیں جو اعلیٰ سرکاری عہدوں پر فائز ہیں جو سول سروس میں بھی ہیں، تعلیمی اداروں میں بھی ہیں، تجارتی حلقوں اور زندگی کے دیگر شعبوں میں بھی عزت اور نیک نامی کے ساتھ مصروف عمل ہیں اور قومی سطح پر بھی انکا نام عزت و احترام سے لیا جاتا ہے"۔

گھانا کے اٹارنی جنرل نے جماعت احمدیہ کی مشنری خدمات اور مقاصد کو چند لفظوں میں بیان کر کے دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔ مختصراً یہ کہ جماعت احمدیہ چاہتی ہے کہ براعظم افریقہ اس سے اس کی تعلیمی، طبی اور علمی خدمات کے ذریعے متعارف ہو۔

ظاہر ہے کہ اس کے ساتھ ساتھ تبلیغی سرگرمیوں کی رفتار میں بھی تیزی آگئی۔ جامعہ احمدیہ ربوہ پاکستان مبشرین کی تعلیم و تربیت کا مرکزی ادارہ ہے۔ اب جنرل ضیاء الحق کی نظر عنایت سے اس کے دروازے غیر ملکی طلباء پر بند کئے جا چکے تھے۔ اس کے نتیجے میں اس امر کا شدت سے احساس پیدا ہوا کہ اب مقامی سطح پر مختلف ممالک مثلاً سیرالیون، آئیوری کوسٹ، یوگنڈا اور تنزانیہ وغیرہ میں مبشرین کی ٹریننگ کے لئے تعلیمی ادارے کھولے جائیں۔ یہی صورتحال دیگر براعظموں کی تھی مثلاً یورپ میں صرف جرمنی میں ۱۹۸۲ء کے بعد پانچ مزید مشن ہاؤسوں نے کام شروع کر دیا۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں گیارہ نئے مشن ہاؤس کھل گئے اور مشن ہاؤسز کی مجموعی تعداد یہاں ۱۸ ہو گئی۔ دنیا بھر کے ایسے ممالک میں جہاں کوئی مسجد نہیں تھی یا جہاں مغرب سے مسلمانوں کی پسپائی کے بعد مساجد بند ہو چکی تھیں، گوئٹے مالا سے لے کر پولینڈ تک، سپین سے لے کر آئرلینڈ تک اور سکاٹ لینڈ سے لے کر سویڈن تک نئی مساجد بن چکی ہیں۔

پولی نیشیا میں صرف ایک مبلغ تھے۔ ٹوالو میں جہاں کبھی مسلمانوں کا وجود تک نہیں تھا، اب ۵۰۰ افراد حلقہ بگوش اسلام ہو چکے تھے۔ اسی طرح آسٹریلیا میں بھی ایک مشن تھا اور بقول ایک احمدی عہدے دار کے وہ وقت دور نہیں جب انڈونیشیا سے آنے والے مبلغین امریکہ کے مغربی ساحل سے آنے والے مبلغین سے آن ملیں گے اور مبلغین گروہ در گروہ چار دانگ عالم پر محیط ہو جائیں گے۔

(حضرت) خلیفہ رابع نے امیر ممالک کے احمدیوں سے اپیل کی کہ وہ دنیا کے غریب ممالک میں یا ان ممالک میں جہاں اب تک اسلام کی روشنی نہیں پہنچی، تبلیغی مساعی پر اٹھنے والے مالی اخراجات کی ذمہ داری سنبھال لیں۔ آپ نے عام احمدیوں کو بھی تحریک کی کہ وہ اپنی پسندیدہ زبانوں میں قرآن کریم کے تراجم کے لئے مالی قربانی پیش کریں۔

نوبل انعام یافتہ ڈاکٹر عبد السلام جنہوں نے تیسری دنیا کے سائنس دانوں کے لئے اٹلی میں ایک بین الاقوامی ریسرچ سنٹر قائم کیا ہے، نے قرآن کریم کے اطالوی زبان میں ترجمے کے جملہ اخراجات برداشت کئے۔ چوہدری شاہنواز صاحب جو ایک کامیاب صنعت کار۔ تاجر اور کئی ممالک میں ریستورانوں کے مالک تھے، نے روسی زبان میں ترجمے کا خرچ دیا۔ جناب ایم ایم احمد نے جن کا قبل ازیں عالمی بنک سے تعلق تھا اور ان کے دیگر افراد خاندان نے قرآن کریم کے کردش زبان میں ترجمہ کا بیڑا اٹھایا۔ امیر ممالک کے احمدیہ مشنوں نے اپنے ہمسایہ ممالک کی مدد کے لئے کمر ہمت کس لی حتیٰ کہ گھانا جو خود تیسری دنیا کا ایک ملک ہے، نے ہمسایہ افریقی ممالک میں تبلیغی مساعی کی ذمہ داری لی اور کینیڈا کی احمدی جماعتوں نے جنوبی امریکہ کے چھ ممالک میں تبلیغ کا خرچ ادا کرنے کی پیشکش کی۔ کینیڈا کے رضاکار مبلغین نے چھٹیوں میں ان مشنوں میں بلا معاوضہ تبلیغی خدمات بجالانے کا عہد کیا۔

کینیڈا ہی کے ایک احمدی جناب محمد الیاس نے (جنہوں نے تیل کی صنعت میں دولت کمائی تھی) پیشکش کی کہ وہ کینیڈا کے سارے تبلیغی منصوبے کا خرچ اکیلے برداشت کریں گے۔ لیکن (حضرت) خلیفہ رابع نے فرمایا کہ وہ اس کی بجائے چھ اور ملک منتخب کرلیں۔ گوئٹے مالا بھی ان کے چھ منتخب ممالک میں شامل تھا۔ جب

وہاں مسجد کی تعمیر مکمل ہو گئی اور ایک باقاعدہ مشنری کا تقرر بھی عمل میں آگیا تو (حضرت) خلیفہ رابع سے درخواست کی گئی کہ آپ عمارت کا افتتاح فرمائیں۔

بدقسمتی سے اس وقت تک وہاں کے رہنے والے کسی بھی شخص کو اسلام قبول کرنے کی توفیق نہیں ملی تھی اور نہ ہی سوائے گنتی کے چند لوگوں کے کسی کو پتہ تھا کہ مسجد بنی بھی ہے یا نہیں، نہ ہی کوئی یہ جانتا تھا کہ جماعت احمدیہ ہے کیا اور احمدیت کہتے کسے ہیں؟

لیکن جب (حضرت) خلیفہ رابع گوئٹے مالا پہنچے تو گوئٹے مالا کے رہنے والوں نے ان آنے والے مہمانوں میں دلچسپی لینی شروع کی۔ افتتاحی تقریب میں ملک کے نائب صدر اور وزیروں نے شمولیت کی۔ ٹیلیویژن اور اخبارات کے نمائندے بھی پہنچ گئے۔ صدر مملکت نے (حضرت) خلیفہ رابع کو بتایا کہ جب تک وہ گوئٹے مالا میں مقیم رہیں گے صدر مملکت کا خاص حفاظتی دستہ ان کی حفاظت کی ذمہ داری ادا کرے گا۔ شروع شروع میں اس حفاظتی دستے کا انداز روایتی اور پروٹوکول کے عین مطابق تھا بلکہ ایک حد تک مشینی تھا۔ لیکن آہستہ آہستہ برف پگھلنے لگی حتیٰ کہ (حضرت) خلیفہ رابع کی گوئٹے مالا سے روانگی سے دو دن قبل دستے کے افسر اعلیٰ نے درخواست کی کہ میں آپ سے علیحدگی میں ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔ آپ فرماتے ہیں۔ اس نے مجھے بتایا کہ میں آپ کے ساتھ نماز میں شامل ہونے کی اجازت چاہتا ہوں۔ ظاہر ہے کہ میں نے بڑی خوشی سے اجازت دے دی۔ بعد میں اس نے بتایا کہ وہ نماز سے بے حد متاثر ہوا ہے اور قرآن کریم کی قرأت کے انداز نے تو اسے ہلا کر رکھ دیا ہے۔

پھر وہ کہنے لگا کہ میں نے اپنی بیوی کو بتایا کہ اگر تم جاننا چاہتی ہو کہ روحانی تجربہ کیا ہوتا ہے تو آؤ ان مسلمانوں کو نماز ادا کرتے دیکھو۔ اس کے بعد حفاظتی دستے

اور اس کے افسر اعلیٰ نے ایک مجلس سوال و جواب کا اہتمام کیا اور لوگ بڑے شوق سے اس میں شامل ہوئے۔

(حضرت) خلیفہ رابع گوئٹے مالا سے روانہ ہونے لگے تو حفاظتی دستے کے افسر اعلیٰ نے عرض کی "کہ جہاں تک میرا تعلق ہے میں تو مسلمان ہو چکا ہوں" وہیں گوئٹے مالا کے ایک مشہور اخبار نویس نے بھی جو ہوائی اڈے پر صرف اس شوق میں آگئے تھے کہ انہوں نے پہلے کسی مسلمان کو دیکھا نہیں تھا' فیصلہ کیا کہ وہ مسلمان ہونا چاہتے ہیں اور جماعت احمدیہ میں شمولیت کے متمنی ہیں۔

روانگی سے ایک رات قبل کابینہ کے ایک سینئر وزیر نے (حضرت) خلیفہ رابع سے ملاقات کی درخواست کی اور کہا کہ میرے سبھی ساتھی وزیر آپ سے اپنی اپنی ملاقات کا تذکرہ کر رہے ہیں۔ میں بھی آپ سے ملاقات کا خواہشمند ہوں۔

(حضرت) خلیفہ رابع کی شبانہ روز مصروفیات میں سے صرف نصف شب سے پہلے ایک گھنٹہ خالی تھا۔ وزیر موصوف نے کہا۔ میں عین وقت پر حاضر ہو جاؤں گا۔ آپ نے فرمایا:۔

> "یہ ملاقات بہت دلچسپ رہی۔ میں نے انہیں بتایا کہ ایک وزیر کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک انسان کی حیثیت سے آپ کی یاد میرے دل کو گرماتی رہے گی۔ جب ہم جدا ہوئے تو ہم ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے کے دوست بن چکے تھے"۔

آپ سے ملنے والے آپ کی سادگی اور کسر نفسی سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے۔ آپ اپنی خداداد بصیرت سے لوگوں کی شخصیت کو بھی ایک نظر میں بھانپ لیتے ہیں۔ آپ کے ماننے والے انہیں حضور کہہ کر پکارتے ہیں۔ جو لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ ہم آپ کو کس طرح مخاطب کریں تو آپ جواب دیتے ہیں کہ بالکل

اسی طرح جس طرح آپ کسی اور کو مخاطب کرتے ہیں۔

جب آپ کسی ملک کے دورے پر جاتے ہیں تو اخبارات ٹیلیویژن اور ریڈیو کو جماعتی طور پر آپ کی آمد کی اطلاع کردی جاتی ہے، لیکن اب کی بار جب آپ نے آئیوری کوسٹ کے دورے کا فیصلہ کیا تو فرمایا کہ چونکہ آئیوری کوسٹ کے صدر مملکت ایک مشہور و معروف عیسائی ہیں اس لئے میں نہیں چاہتا کہ میرے دورے کی تشہیر کی جائے۔ ایسا نہ ہو وہ اس وجہ سے کسی مخمصے میں پڑ جائیں۔

چنانچہ صدر مملکت کو جب پہلی بار اخبارات اور ریڈیو کے ذریعہ سے آئیوری کوسٹ میں آپ کی موجودگی کا علم ہوا تو انہوں نے فوراً ہی کہلا بھیجا کہ وہ ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی سرکاری کاروں اور حفاظتی دستے کو آپ کی خدمت پر مامور کر دیا گیا۔

امیر جماعت ہائے احمدیہ جرمنی بیان کرتے ہیں۔

> "مجھے خوب یاد ہے کہ حضور مسلسل بارہ گھنٹے سے سوال وجواب کی مجالس اور تبلیغ میں مصروف تھے۔ میں نے ایک علیحدہ کمرے میں ان کے لئے کھانے کا بندوبست کیا تا کہ آپ تنہائی میں سکون سے کھانا تناول فرماسکیں۔ لیکن پہلے تو آپ نے مجھے فرمایا:۔ آئیں کھانے میں میرے ساتھ شامل ہوں۔ اس کے بعد میرے تین ننھے منے بچے بھی آدھمکے اور حضور کے ایک ایک لقمے کا بغور جائزہ لینے لگے۔ میں پریشان ہو کر معافی مانگنے لگا اور بچوں کو بھی سختی سے منع کیا کہ وہ حضور کی کہنیوں اور بازوؤں سے نہ چمٹیں۔ لیکن حضور نے فرمایا۔ بچوں کو نہ ٹوکیں اور فکر نہ کریں۔ بچے تو میرے دل کی

راحت ہیں۔ مجھے بچوں سے بے حد محبت ہے۔ ان کی
موجودگی میں مجھے دلی سکون اور بڑے ہی سکھ اور مسرت کا
احساس ہوتا ہے۔

دو جرمن اصحاب (حضرت) خلیفہ رابع سے ملاقات کے
خواہش مند تھے اور بیعت کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ میں نے
ملاقات کی اجازت لی۔ ملاقات ہوئی۔ ان دو میں سے ایک کے
متعلق میرا خیال تھا کہ وہ اسلام کے متعلق اپنے ساتھی کی
نسبت زیادہ اخلاص اور سنجیدگی سے سوچ رہے ہیں، لیکن
عجیب بات یہ ہوئی کہ ملاقات کے دوران (حضرت) خلیفہ
رابع کی توجہ زیادہ تر دوسرے صاحب کی طرف رہی' بالآخر
ہوا یہ کہ قبولیت اسلام کی توفیق بھی اسی دوست کو حاصل
ہوئی"۔

جماعت کو افریقی ممالک میں خدمت کا ایک صلہ تو یہ ملا کہ ان لوگوں کے دل
ممنونیت اور تشکر کے جذبات سے بھر گئے اور ایک نتیجہ یہ بھی نکلا کہ جب حکومت
پاکستان نے جماعت احمدیہ کے خلاف اپنی ظالمانہ پالیسیوں پر عمل شروع کیا تو
افریقی ممالک نے اس ظلم و ستم کے خلاف پُرزور صدائے احتجاج بلند کی۔ مثال
کے طور پر مغربی افریقہ کے ملک گیمبیا ہی کو لے لیجئے۔ یہاں کے دارالسلطنت میں
O. A. U. (افریقی اتحاد کی تنظیم) کے ذیلی ادارے
(HUMAN RIGHTS COMMISSION) بنیادی انسانی حقوق کے
کمیشن کے صدر دفاتر قائم ہیں۔ یہاں کی حکومت کے ایک سینئر وزیر نے یہ بیان
دیا:۔

"ہم ہر فرد کی آزادی خصوصاً مذہبی آزادی پر پختہ ایمان رکھتے ہیں۔ ہم جماعت احمدیہ کی اس جدوجہد کی پوری قوت اور اتفاق رائے سے تائید کرتے ہیں جو وہ اپنے جائز حقوق کے حصول کے لئے کر رہی ہے اور یقین رکھتے ہیں کہ احمدیوں کو ساری دنیا میں جہاں چاہیں اپنے مذہبی فرائض کی ادائیگی کا پورا حق حاصل ہے۔

کیا یہ اسلام پر ایک خوفناک طنز نہیں کہ دنیائے اسلام کے لیڈر عیسائیوں اور بدھ مت والوں سے تو کیا یہودیوں تک سے بات چیت میں مضائقہ نہیں سمجھتے لیکن بات چیت اگر نہیں کی جاسکتی تو صرف احمدی مسلمانوں سے۔ کتنے افسوس کا مقام ہے کہ ایک مسلمان فرقے کو اس طرح ظلم و ستم کا نشانہ بنایا جا رہا ہو۔

اس کے باوجود احمدیوں کے صبر و تحمل کی داد دینی پڑتی ہے۔ کاش باقی مذاہب کے لوگ بھی ان کے اس قابل رشک نمونے پر عمل پیرا ہونے کی کوشش کرتے۔ جماعت کے بزرگوں نے بالعموم اور نوجوانوں نے بالخصوص یعنی نئی نسل نے جس پر مستقبل کی ذمہ داریوں کا بوجھ پڑنے والا ہے ضبط و تحمل، ذمہ داری اور اخلاص کا وہ نمونہ پیش کیا ہے جسے دیکھ کر بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ وہ صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی خاطر انتہائی صبر اور ایثار کے ساتھ بغیر کسی غرض کے یہ قربانیاں دے رہے ہیں"۔

(حضرت) خلیفہ رابع کے متعلق انہوں نے کہا:-

"کسی بھی مذہب یا روحانی سلسلے کی سچائی پرکھنے کا ایک معیار یہ بھی ہے کہ اس کی امامت کی سچائی کے معیار کو دیکھا جائے۔ باوجودیکہ جماعت احمدیہ پر عرصہ حیات تنگ کر دیا گیا۔ احمدیوں کو بے دریغ قتل کیا گیا۔ ان کے گھر جلائے گئے اور ان کے خلاف ہر قسم کے ظلم و ستم کو روا رکھا گیا لیکن امام جماعت احمدیہ نے ہمیشہ ہی عفو، درگذر اور صبر و تحمل کا درس دیا۔ دراصل یہی تو وہ صفات حسنہ ہیں جنہیں اسلام کا سنگ بنیاد کہا جاسکتا ہے۔ امام جماعت احمدیہ ہی اس وقت بنی نوع انسان کی ارفع ذہنی، عقلی اور روحانی صلاحیتوں اور اقدار کی صحیح نمائندگی کر رہے ہیں اور آج ساری دنیا کی امیدیں ان کی ذات ہی سے وابستہ ہیں"۔

(حضرت) خلیفہ رابع نے بار بار تکرار کے ساتھ زور دیکر اس حقیقت کا اعلان کیا کہ اسلام کی عمارت تو قرآن کریم کی بنیادوں پر قائم ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔ قرآن کریم کو نکال کر زندگی میں کچھ بھی باقی نہیں رہتا۔ قرآن کریم ہی تو وہ قانون اور دستور العمل پیش کرتا ہے جو انسانی فطرت کے عین مطابق ہے اور جس کی روشنی میں انسان کامیاب زندگی گزار سکتا ہے۔ قرآن کریم میں آج ہی کے لئے نہیں کل کے لئے بھی پوری ہدایت اور راہنمائی موجود ہے۔

آپ فرماتے ہیں:

"میری بہترین اور لذیز ترین خوشیوں میں سے ایک خوشی مجھے اس وقت حاصل ہوتی ہے جب کوئی بچی یا بچہ قرآن کریم

ناظرہ ختم کرتا ہے۔ جونہی بچہ قرآن کریم کی آخری آیت کی تلاوت ختم کرتا ہے تو میں بچے کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیتا ہوں۔ بچے کا ہاتھ بھی قرآن کریم پر رکھا ہوتا ہے۔ دعائے ختم القرآن کے بعد میں نہایت سادہ زبان میں اس کا ترجمہ کرتا ہوں جسے بچہ بھی ساتھ ساتھ دہراتا چلا جاتا ہے۔ دعائے ختم القرآن اور اس کا ترجمہ درج ذیل ہے:-

اَللّٰهُمَّ اٰنِسْ وَحْشَتِيْ فِيْ قَبْرِيْ. اَللّٰهُمَّ ارْحَمْنِيْ بِالْقُرْاٰنِ الْعَظِيْمِ وَاجْعَلْهُ لِيْ اِمَامًا وَّنُوْرًا وَّهُدًى وَّرَحْمَةً. اَللّٰهُمَّ ذَكِّرْنِيْ مِنْهُ مَا نَسِيْتُ وَعَلِّمْنِيْ مِنْهُ مَا جَهِلْتُ وَارْزُقْنِيْ تِلَاوَتَهٗ اٰنَآءَ الَّيْلِ وَاٰنَآءَ النَّهَارِ وَاجْعَلْهُ لِيْ حُجَّةً يَّا رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ۔

ترجمہ:- اے اللہ! قبر میں میری وحشت کو دور فرما اور اے خدا! مجھ پر قرآن عظیم کی برکت سے رحم فرما اور اسے میرے لئے نور، رحمت اور امام بنا: اے خدا! جو کچھ میں قرآن مجید میں سے بھول چکا ہوں وہ مجھے یاد دلا دے اور جو مجھے نہیں آتا وہ مجھے سکھا دے اور دن رات مجھے اس کی تلاوت کی توفیق فرما اور اے رب العالمین! اسے میرے لئے حجت کے طور پر بنا دے۔

☆ ☆ ☆

26

قبولیت دعا

(حضرت) خلیفہ رابع قبولیت دعا پر کامل یقین رکھتے ہیں۔ آپ کی دعائیں بچپن میں بھی قبول ہوتی تھیں اور جوانی میں بھی اور جب آپ خلافت کے روحانی منصب پر فائز ہوئے تو پھر تو دعاؤں کی قبولیت کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا۔ آپ کے نزدیک اس کی ایک خاص وجہ ہے۔ آپ کا کہنا ہے کہ قبولیت دعا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک انعام تو ہے لیکن یہ انعام آپ کی اپنی ذات سے مختص نہیں اور نہ ہی اس وجہ سے ہے کہ آپ اوروں کی نسبت زیادہ نیک ہیں۔ فرماتے ہیں:-

"میں نے اس مسئلے کا نہایت سنجیدگی اور ٹھنڈے دل سے تفصیلی تجزیہ کیا ہے اور میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں اور علی وجہ البصیرت اس یقین پر قائم ہوں کہ قبولیت دعا ایک انعام تو ہے لیکن اللہ (تعالیٰ) یہ انعام اس لئے عطا کرتا ہے کہ خلافت

اور منصب خلافت کے لئے ایک ناقابل شکست اور غیر متزلزل احترام اور عظمت دلوں میں قائم ہو جائے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ آسمان پر جو ارادہ فرماتا ہے وہ زمین پر قدم بقدم تکمیل کے مراحل طے کرتا چلا جاتا ہے۔

ثانیاً۔ قبولیت دعا کا اس غم اور دکھ سے بھی بہت گہرا تعلق ہے جو آپ خدمت خلق کی خاطر اٹھاتے ہیں۔ اگر آپ کا یہ غم اور حزن محض اپنی یا اپنے خاندان کی خاطر ہے تو دعا کی قوت اور شدت میں کچھ نہ کچھ کمی ضرور آجاتی ہے۔ کیونکہ اس عمل میں تھوڑا بہت خود غرضی کا شائبہ بھی پایا جاتا ہے۔ البتہ یہ ایک مختلف صورت ہوگی اگر آپ انتہائی سوز و گداز اور عجز و نیاز کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے حضور گر جائیں اور اس سے رحم کے طالب ہوں۔

پس اگر دوسروں کے لئے آپ کی تڑپ اور غم کا دائرہ محدود ہو جائے تو دعا میں بھی وہ شدت اور زور نہیں رہے گا۔ لیکن اگر بنی نوع انسان کے لئے آپ کے غم کا دائرہ وسیع ہو جائے اور آپ دل کی گہرائیوں سے لوگوں کے دکھ درد میں شریک ہوں تو آپ کی دعاؤں میں ایک خاص کیفیت پیدا ہو جائے گی۔ یہی وجہ ہے دل سے نکلی ہوئی ایسی دعائیں اللہ تعالیٰ سنتا ہے اور انہیں شرف قبولیت بخشتا ہے۔

اگر میں افریقہ میں رہنے والوں کی حالت زار پر پریشان اور جماعت احمدیہ کے افراد پر توڑے جانے والے مظالم دیکھ

کر بے چین ہو جاتا ہوں۔ اگر اوروں کے دکھ مجھے ایک درد
ناک کرب اور اذیت میں مبتلا کر دیتے ہیں تو قبولیت کی ایک
ایسی گھڑی بھی آتی ہے جب میرا خالق میری فریاد کو سنتا اور
مدد کے لئے اترتا ہے۔ یہی وہ کیفیت ہے۔ جو ہر مرد و زن میں
پیدا ہونی چاہئے۔ وہ اوروں کے غم میں شریک ہوں اور
انتہائی عاجزی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو مدد کے لئے پکاریں۔

بچپن میں بھی ہمیں یہی تعلیم دی گئی تھی کہ ہم دعا کی
عادت ڈالیں۔ دعا تو ہمیشہ سے میری روح کی غذا رہی ہے۔

قرآن (کریم) کی حسین ترین آیات میں سے ایک آیت
یہ بھی ہے جس میں اللہ تعالیٰ اپنے بندے سے کہتا ہے کہ ’تو
مجھے پکار۔ میں جواب دوں گا‘ ۔”

(حضرت) خلیفہ رابع کا دعا کے متعلق معمول یہ ہے کہ آپ اپنے خاندان اور
جماعت کے افراد کو دعا کی تحریک کرتے رہتے ہیں۔ دعائیں قبول ہوتی ہیں تو دل کی
تقویت اور ایمان کی تازگی کا باعث بنتی ہیں۔ اپنے بچپن کی یادیں تازہ کرتے
ہوئے فرماتے ہیں۔

”ہم لوگ بڑے ہی خوش قسمت تھے۔ میں اور میرے
ہم عصر جس ماحول میں پلے بڑھے وہ بڑا ہی پاکیزہ اور روح
پرور ماحول تھا۔ (حضرت) مسیح موعود (علیہ السلام) کے رفیق
اور تربیت یافتہ ساتھی بہت بڑی تعداد میں قادیان میں زندہ
سلامت موجود تھے۔ وہ عبادت الٰہی کے نشے میں سرشار،
تعلق باللہ کے چلتے پھرتے نمونے تھے۔

ان کی قوت قدسی کی تاثیر سے روحوں کی کایا پلٹ جاتی تھی۔ وہ لوگ امانت، دیانت، اخلاص، سادگی اور سچائی میں اپنی مثال آپ تھے، علم و فضل میں یکتا اور یگانہ روزگار، لیکن اتنے ہی بے نفس، منکسرالمزاج اور غریب الطبع۔ بچوں کی بات بھی اس توجہ سے سنتے جیسے ہم ان کے ہم عمر ہوں۔ وقار عمل میں بلا تکلف ہمارے ساتھ شامل ہوتے۔ بوجھ اٹھاتے اور یہ احساس تک نہ پیدا ہونے دیتے کہ وہ بڑے ہیں اور ہم چھوٹے یا یہ کہ محنت مشقت کا کام ان کے شایان شان نہیں۔

ان بزرگوں کی موجودگی کا ایک روحانی پہلو یہ بھی تھا کہ احباب جماعت ان کی خدمت میں حاضر ہو کر دعائے خاص کے لئے درخواست کیا کرتے تھے۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ یہ لوگ روحانیت کے بلند مقام پر فائز ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کی دعائیں سنتا اور انہیں شرف قبولیت بخشتا ہے۔

ان کو ہونے والے الہامات اور کشوف کی کثرت کا یہ عالم تھا کہ شاید اس وقت یا اس کے بعد کے خلفاء کو بھی اتنے الہامات نہ ہوئے ہوں۔ لیکن دیکھو تو یوں لگتا ہے جیسے کوئی سادہ سے عام سے آدمی ہوں جو قادیان کی گلیوں میں چل پھر رہے ہوں اور ایک عام محنت کش کی طرح اپنے خون پسینے سے رزق حلال کے حصول کی کوشش میں مصروف ہوں۔

ان کے دروازے ہر کس و ناکس کے لئے ہر وقت کھلے رہتے تھے۔ اگر کبھی ان کی خدمت میں دعائے خاص کے لئے

درخواست کرنے کا موقع ملتا تو ہو سکتا تھا کہ اگلے دن ہی آپ کو بتاتے! "میں نے بڑی عاجزی اور تضرع سے اللہ تعالیٰ کے حضور دعا کی۔ یہ اس کا احسان ہے کہ آئندہ ہونے والی صورت حال کی تفصیل اس نے مجھے بتا دی ہے"۔ پھر واقعات ان کی بتائی ہوئی ترتیب سے وقوع پذیر ہوتے چلے جاتے۔

اس طرح ایک زندہ حقیقی اور جیتے جاگتے روحانی کیف اور لذت سے سرشار ماحول میں ہمارے شب و روز بسر ہو رہے تھے۔ ان بزرگوں کو دیکھ کر احمدیت کی سچائی اور حقانیت کھل کر سامنے آجاتی تھی اور یہ تو ہمارا روزانہ کا معمول تھا اور ہماری خوش قسمتی تھی کہ ہم ان کی روحانیت اور تعلق باللہ کے ارفع مقام کو بچشم خود مشاہدہ کرنے کی سعادت حاصل کر رہے تھے اور یہی وہ زندہ حقیقت ہے اور مشاہدہ اور تجربہ ہے جس کے متعلق میں تلقین کرتا رہتا ہوں اور بے قرار ہوں کہ تمام احمدی اس تجربے میں سے گزرنے کی صلاحیت اپنے اندر پیدا کریں اور توقع رکھتا ہوں کہ وہ صدق دل سے اس انعام اور کیفیت کی نہ صرف خود حفاظت کرتے رہیں گے بلکہ اس مقدس امانت کو آنے والی نسلوں تک پہنچانے کی کامیاب جدوجہد بھی کرتے چلے جائیں گے۔ کیونکہ قرآن کریم کہتا ہے اور بائبل اس کی تصدیق کرتی ہے کہ خدا تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا۔ اسے بنایا اور سنوارا اور زندگی عطا کی۔ لیکن اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اس کے بعد اس

نے انسان میں اپنی پہچان اور معرفت کی روح بھی پھونک دی"۔

فرمایا:-

"دعا کے فوائد تو بے شمار ہیں لیکن اس کی خصوصی افادیت یہ ہے کہ دعا اللہ تعالیٰ سے تعلق قائم کرنے میں مدد دیتی ہے۔نیکی کی دوست اور بدی کی دشمن ہے"۔

آپ نے (حضرت) مسیح موعود (علیہ السلام) کا حوالہ دیتے ہوئے فرمایا:-

"آپ نے اس امر پر حیرت کا اظہار کیا اور ناپسند فرمایا ہے کہ تقدیر کا عذر سامنے رکھ کر اپنی بے عملی اور بے حسی کا جواز پیش کرنے کی کوشش کی جائے۔ دعا کرنا یا نہ کرنا ایسا ہی ہے جیسے بیماری میں دوا کا استعمال یا عدم استعمال۔

(حضرت) مسیح موعود (علیہ السلام) نے فرمایا۔ کہ کیا اس کا خدانخواستہ یہ مطلب ہو گا کہ اللہ (تعالیٰ) نے بعض ادویات میں تو اتنی زبردست خاصیتیں اور تاثیریں رکھ دیں لیکن دعا کو تاثیر سے خالی رکھا اور اب وہ اپنی پیدا کی ہوئی مخلوق کی دعائیں سنی ان سنی کر دیتا ہے؟ اگر ایسا ہے تو کیا اس سے امر الٰہی میں تناقض واقع نہیں ہو جائے گا کہ ادویات پر تو اس کا تصرف ہو اور دعا کی قبولیت اس کے اختیار سے باہر ہو؟

آپ نے (حضرت) مسیح موعود (علیہ السلام) کے ملفوظات کا حوالہ دیتے ہوئے مزید فرمایا:-

"اللہ دعائیں تو یقیناً سنتا اور قبول فرماتا ہے لیکن قبولیت

دعا کی بھی کچھ شرائط ہیں۔ دعا کے لئے تو جہاد کرنا پڑتا ہے۔ صرف عاجزی اور انکساری کافی نہیں۔ نیکی، پاکیزگی، سچائی، یقین کامل، عشق، لگن اور مکمل توجہ سبھی ضروری ہیں۔ ان صفات کے حصول کے لئے بھی دعا ہی مؤثر ہتھیار ہے اور یاد رکھیں کہ کسی دعا کرنے والے کی دعا اس الٰہی منصوبے کے خلاف بھی شرف قبولیت حاصل نہیں کر سکتی جس کو اللہ تعالیٰ کی مشیت نے اس شخص کی دنیوی اور اخروی فلاح و بہبود کے لئے پسند فرمایا ہو"۔

فرمایا:۔

"بہت سے لوگ مجھے خط لکھتے ہیں اور دعا کی درخواست کرتے ہیں۔ ان میں وہ لوگ بھی ہیں جو احمدی نہیں ہیں اور معاشرے کے مختلف طبقوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ کچھ عیسائی ہیں اور کچھ ہندو اور سکھ۔ سبھی مجھے خط لکھتے ہیں اور کہتے ہیں آپ ہمارے لئے دعا کریں۔ ہمیں یقین ہے کہ اللہ (تعالیٰ) آپ کی دعائیں قبول فرماتا ہے۔ قبولیت دعا کے سلسلے میں مجھے تو کسی قسم کی لفظی تصدیق کی ضرورت نہیں۔ جب دعا کرتا ہوں تو میرا دل فوراً گواہی دیتا ہے کہ یہ دعا قبول ہو گئی ہے"۔

کیا آپ اس کیفیت کی کچھ تفصیل بتا سکیں گے؟

"مختلف کیفیات ہیں۔ ہر تجربہ ایک الگ کیفیت کا حامل ہوتا ہے۔ جب محسوس کرتا ہوں کہ میری دعا قبول ہو گئی ہے تو اس قبولیت کا عملی اظہار جس تفصیل سے ہوتا ہے، اسے

محض اتفاق یا حادثہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ پورے وثوق سے یہ بات دل میں گڑ جاتی ہے کہ یہ احساس کسی خواہش پر نہیں بلکہ ایک ٹھوس سچائی اور حقیقت پر مبنی ہے۔

اسی طرح کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ دعا کرتے وقت اگرچہ الہاماً تو نہیں بتایا جاتا کہ میری دعا قبول ہو گئی لیکن قرآن کریم کی کوئی آیت اچانک میرے دل پر نازل ہو جاتی ہے جس کا بہت گہرا ربط اس مسئلے سے ہوتا ہے جس کے حل کے لئے میں دعا کر رہا ہوں' تو میں سمجھ لیتا ہوں کہ یہ ایک پیغام ہے اور اس امر کی علامت ہے کہ میری دعا قبول ہو گئی ہے۔

کچھ لوگ مجھے لکھتے ہیں کہ بقول ان کے دعا کرتے وقت انہیں بھی اس قسم کے پیغام کا تجربہ تو ہوا لیکن نتیجہ کچھ بھی نہیں نکلا۔ بات یہ ہے کہ میرا تجربہ ان سے بالکل مختلف ہے۔ میں جب دعا کرتا ہوں تو واقعات ایک ترتیب اور تسلسل سے نمودار ہونا شروع ہو جاتے ہیں جنہیں کسی صورت میں بھی محض اتفاق نہیں قرار دیا جا سکتا۔ یہاں تک کہ کسی ملحد یا منکر کے لئے بھی انکار کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ میں آپ کو ایک چھوٹی سی مثال دیتا ہوں:۔

یہ واقعہ اس وقت پیش آیا جب میں اپنی بیگم اور بچوں کے ہمراہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں سفر کر رہا تھا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ ایک نووارد کی حیثیت سے بعض شہروں میں

کہیں راستہ نہ بھول جاؤں۔

اس امکان کے پیش نظر میں دعا میں لگ گیا۔ اچانک ذہن میں قرآن کریم کی ایک آیت کوند گئی۔ مجھے اطمینان ہو گیا کہ اب نہ تو راستہ بھولوں گا اور نہ ہی بھوک پیاس کی وجہ سے کسی قسم کی پریشانی لاحق ہو گی۔

آدھی رات کے بعد کوئی ڈیڑھ بجے کے قریب ہم شکاگو پہنچ گئے۔ شکاگو ایک وسیع و عریض شہر ہے اور میلوں تک پھیلا ہوا ہے۔ عین ممکن ہے کہ ایک سرے سے دوسرے سرے تک اس کی لمبائی ۹۶ میل سے قریب رہی ہو۔ ہو سکتا ہے یہ اندازہ درست نہ ہو لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ شہر کے ایک سرے سے دوسرے تک فاصلے بہت طویل ہیں۔ اتفاق کی بات ہے میرے پاس شہر کا نقشہ بھی نہیں تھا۔ میں نے اپنی بیگم اور بچوں سے کہا کہ وہ کار ہی میں اطمینان سے سو جائیں۔ میں خود گاڑی چلا رہا تھا۔ پہلے چند مرتبہ سیدھے ہاتھ مڑا اور چند مرتبہ الٹے ہاتھ اور خاصی دیر تک گاڑی چلاتا چلا گیا۔ میں نے ایک پٹرول پمپ پر گاڑی روکی اور وہاں سے مسجد احمدیہ میں فون کیا۔ پتہ چلا کہ مسجد احمدیہ دو ایک گلیوں پر قریب ہی ہے۔

اس سے ملتا جلتا واقعہ ناروے میں بھی پیش آیا۔ ہم نے ایک راہ چلتے شخص سے انگریزی زبان میں یہ پوچھا کہ کیا آپ جانتے ہیں کہ ہمارے میزبان کہاں رہتے ہیں۔ اس نے بڑے

اطمینان سے جواب دیا۔ہاں۔بے شک وہ تو میرے پڑوسی ہیں اور ساتھ والے مکان میں رہتے ہیں۔

ہالینڈ میں بھی ایسا ہی تجربہ ہوا۔ہم نے وہاں کچھ بچوں سے پوچھا "بچو کیا بتا سکتے ہو کہ مسجد احمدیہ کہاں ہے؟" وہ بولے" مسجد احمدیہ؟ واہ یہ کوئی بات ہے۔مسجد تو قریب ہی ہے۔آیئے ہمارے ساتھ آیئے"۔

ایسے واقعات بار بار اور ایک تسلسل اور تواتر کے ساتھ ہوئے اور اس انداز سے ہوئے ہیں کہ میرے لئے یہ کہنا ناممکن ہو گیا کہ میں انہیں محض اتفاق یا حادثہ کہہ کر ٹال دوں۔

مجھے دنیا کے کونے کونے سے ٹیلی فون آتے رہتے ہیں۔ مختلف طبقوں سے تعلق رکھنے والے طرح طرح کے لوگ اپنے لئے یا کسی رشتہ دار کے لئے دعا کے لئے کہتے ہیں۔عموماً کسی مریض کی صحت یابی کے لئے دعا کی درخواست کی جاتی ہے۔دعا کے بعد میرا معمول یہ ہے کہ میں بلا استثناء ایک مختصر خط کے ذریعے جواب بھجواتا ہوں کہ میں نے دعا کی ہے اور امید رکھتا ہوں کہ اللہ (تعالیٰ) دعا کو قبول فرمالے گا۔لیکن میری تحریر نقل کرتے وقت کبھی کبھی دفتر سے غلطی بھی ہو جاتی ہے اور وہ اس کی بجائے خط میں لکھ دیتا ہے کہ میں نے دعا کی اور اللہ تعالیٰ اسے قبول فرمالے گا۔

اور ہوتا عملاً یہ ہے کہ ایسے تمام مواقع پر اللہ واقعی دعا کو قبول فرمالیتا ہے۔اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ ایک اتفاقیہ

غلطی نہیں تھی بلکہ اس میں ایک وراءالوراہستی کا ارادہ کام کر رہا تھا۔ یہ ایک الٰہی تصرف تھا۔ اللہ تعالیٰ نے میری دعا قبول فرمائی تھی اور دعا کا جواب بھی فوراً ہی دے دیا تھا۔ ایک دو نہیں ایسے بہت سے واقعات ہوتے رہتے ہیں۔ دعا کے نتیجے میں بیمار مائیں اور مریض بچے معجزانہ طور پر صحت یاب ہو جاتے ہیں۔ ڈاکٹر انہیں لاعلاج قرار دے چکے ہوتے ہیں۔ گویا یہ لوگ ایک طرح سے موت کے منہ سے واپس آجاتے ہیں۔

ایسا نہیں کہ میں اور باقی احمدی صرف ایسے موقعوں پر ہی اللہ (تعالیٰ) کے حضور دست بدعا ہوتے ہوں۔ ہم تو دن میں کئی بار اللہ تعالیٰ کے حضور دست دعا دراز کرتے ہیں۔ دن میں صرف پانچ مرتبہ ہی نہیں بار بار تنہائیوں میں تضرع اور دل کی گہرائیوں سے اس سے مدد اور راہنمائی کی بھیک مانگتے ہیں کہ اے خدا ہمیں صراط مستقیم پر چلنے کی توفیق عطا فرما۔ ہم ہر موقع اور ضرورت کے وقت استعانت کے لئے اس کا در کھٹکھٹاتے ہیں۔ بنی نوع انسان کے بہتر مستقبل کے لئے بھی دعائیں کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ خشک سالی کے دنوں میں اس کے حضور بارش کے لئے بھی عرض کرتے ہیں۔

دن ہو یا رات دعا تو ہماری روح کی غذا ہے۔ جس طرح زندگی کے لئے جسم کو آکسیجن کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح روح بھی دعا کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔

مجھے یاد ہے گھانا میں ایک چیف کو میرے ہاتھ پر قبول حق کی توفیق ملی۔ اس سے پہلے وہ مذہباً عیسائی تھے۔ نرینہ اولاد کی حسرت دل میں لئے پھرتے تھے۔ دو مرتبہ ان کی اہلیہ کا حمل ضائع ہو چکا تھا اور اب وہ مایوس ہو چکے تھے۔ انہوں نے مجھے دعا کے لئے کہا۔ کہنے لگے کہ دعا کریں کہ خدا تعالیٰ مجھے بیٹا دے اور میری اہلیہ بھی صحت و عافیت اور خیریت سے رہے۔

میں نے چیف اور اس کی بیگم کے لئے بڑی تضرع اور درد سے دعا کی اور انہیں لکھا کہ اللہ تعالیٰ میری اور ان کی دعاؤں کو ضرور شرف قبولیت بخشے گا۔ کچھ مدت کے بعد ان کی طرف سے اطلاع ملی کہ خدا تعالیٰ نے دعائیں سن لی ہیں اور انہیں ایک صحت مند بیٹے سے نوازا ہے"۔

آپ نے فرمایا:۔

"خدا (تعالیٰ) کی یہ سنت ہے کہ وہ قوانین قدرت ہی کے ذریعے معجزات اور خوارق کا اظہار فرماتا ہے۔ وہ قادر مطلق ہے۔ اسے اپنی مشیت اور فیصلوں کے اظہار کے لئے مافوق الفطرت ذرائع کا سہارا لینے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہی تو ہے جو قوانین قدرت کا خالق ہے۔ اس لئے قوانین قدرت ہی کے توسط سے اس کی قدرت کاملہ کا اظہار بھی ہوتا ہے"۔

جب آپ سے دریافت کیا گیا کہ دعا کی قبولیت کے انداز اور اقسام کیا کیا ہیں؟ تو آپ نے فرمایا:۔

"(حضرت) مسیح موعود (علیہ السلام) فرماتے ہیں:۔

قبولیت دعا کی دو قسمیں ہیں۔ ایک کا مقصد تو دعا کرنے والے کی آزمائش ہے۔ اس صورت میں تو ایک گنہگار کی دعائیں بھی قبول کی جاتی ہیں اور دوسری قسم قبولیت دعا کی وہ ہے جس سے دعا کرنے والوں کے روحانی درجات کی سربلندی اور سرفرازی مقصود ہوتی ہے۔ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جنہیں اللہ (تعالیٰ) خاص طور پر چن لیتا ہے اور اپنے خاص انعامات سے نوازتا ہے۔

کبھی کبھی اس لئے بھی دعا قبول کی جاتی ہے تاکہ پتہ چل سکے اور ثابت ہو جائے کہ دعا کرنے والے کو خدا (تعالیٰ) کی خاص تائید اور نصرت حاصل ہے اور منکروں کا منہ بند ہو جائے۔ ہندوستان کی رہنے والی ایک نواحمدی خاتون کی مثال ہی لے لیجئے جسے سانپ نے ڈس لیا تھا۔ اسے ہسپتال لے جایا گیا جہاں ڈاکٹروں کے نزدیک اس کی موت یقینی تھی۔ یہ اس کی زندگی کے آخری دو گھنٹے تھے جو ایک ایک کرکے گزر رہے تھے۔ اس کے غیر از جماعت رشتہ دار پھولے نہ سماتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ یہ ایک طرح کی سزا تھی جو اس خاتون کو احمدی ہونے کی وجہ سے ملی تھی۔

اِدھر تو یہ حالت تھی اُدھر وہاں کے احمدی دعاؤں میں لگ گئے۔ دو گھنٹے گزر گئے لیکن مریضہ ابھی تک زندہ تھی۔ ڈاکٹروں نے کہا اس کے بچنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بس چند منٹ اِدھر اُدھر کی بات ہے۔ غروب آفتاب سے پہلے پہلے

مریضہ یقیناً فوت ہو جائے گی۔ ہم یونہی نہیں کہہ رہے ہیں۔ تجربے کی روشنی میں کہہ رہے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ مرض کے اس نازک مرحلے پر آج تک کوئی مریض زندہ نہیں بچ سکا۔ اس کے برعکس یہ کہ چوبیس گھنٹے گزر گئے لیکن مریضہ زندہ رہی اور تین دن کے بعد اس نے آنکھیں کھول دیں اور نو دن بعد ہسپتال سے فارغ ہو کر بخیریت گھر واپس پہنچ گئی۔ ڈاکٹر حیران تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ ان کے مشاہدے میں یہ پہلا واقعہ ہے کہ اس قسم کا ڈسا ہوا مریض صحت یاب ہو گیا ہو"۔

(حضرت) خلیفہ رابع فرماتے ہیں:۔

"میں سمجھتا ہوں کہ یہ معجزہ دو وجہ سے ہوا۔ سب سے پہلے تو وہاں کی جماعت کی دلی دعائیں تھیں۔ دوسرے مخالفین کے طعنے۔ احمدیت سے نفرت کی وجہ سے ان لوگوں کا یہ خیال تھا کہ اس خاتون کو سانپ نے نہیں ڈسا تھا بلکہ دراصل اللہ تعالیٰ نے اسے احمدیت قبول کرنے کے جرم کی سزا دی تھی۔ اس معجزانہ شفا سے یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ اپنے شور و غوغا سے یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی تقدیر اور رضا کو جھٹلا رہے تھے۔

ایسا ہی ایک واقعہ کھاریاں (پاکستان) میں بھی پیش آیا۔ جماعت احمدیہ کھاریاں نے میٹھے پانی کی تلاش میں بڑی دعاؤں اور متعلقہ انجینئروں کے مشورے کے بعد ایک جگہ پانی کی تلاش میں ٹیوب ویل کی کھدائی شروع کی لیکن ۲۰۰ فٹ کی

گہرائی تک بھی پانی نہ ملا۔ اس سے پہلے بھی آبی تلاش کے ماہرین کی نگرانی میں سرکاری سطح پر چار کوششیں ہو چکی تھیں اور ہر بار ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا تھا۔ یا تو پانی ملا ہی نہیں تھا یا اگر کہیں ملا بھی تھا تو کھاری۔

یوں لگتا تھا جیسے جماعت احمدیہ کی کوشش بھی سابقہ سرکاری کوششوں کی طرح ناکام ثابت ہو گی۔ چنانچہ جب ۲۰۰ فٹ کی گہرائی پر بھی پانی نہ ملا تو مخالفین نے آوازے کسنے شروع کر دیے اور کہا کہ خدا تعالیٰ نے احمدیوں کو خوب سزا دی ہے۔

لیکن جب ۲۲۰ فٹ کی گہرائی پر پہنچے تو دوست، دشمن سبھی حیران رہ گئے۔ احمدیوں کو صاف شفاف اور میٹھے پانی کے وسیع ذخائر مل گئے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی عاجزانہ دعائیں سن لی تھیں"۔

اگر انکسار قبولیت دعا کی شرائط میں سے ایک شرط ہے تو اتنا تو ان کے دشمن بھی تسلیم کرنے پر مجبور ہیں کہ (حضرت) خلیفہ رابع ایک سادگی پسند اور منکسر المزاج انسان ہیں۔ آپ کی رہائش سادہ، خوراک سادہ، آپ کے شب و روز سادہ اور آپ کی زندگی دولت کی نمود و نمائش اور اس کے تکلفات کے خرخشوں سے یکسر پاک اور بے داغ ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے آپ دل و جان سے اپنے آپ کو اللہ (تعالیٰ) کے حضور پیش کر چکے ہوں۔ اب وہ ہیں اور جماعت احمدیہ کے مشن اور مقاصد کا حصول اور ان کی تکمیل کی لگن اور پیہم کوشش۔

اسی طرح اگر قبولیت دعا کی شرائط میں سے ایک شرط یہ بھی ہے کہ دوسروں

کے دکھ درد کو اپنا دکھ درد بنالیا جائے تو بلا خوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ آپ دنیا بھر کے بیماروں، مجبوروں، مظلوموں اور بھوک پیاس کے ہاتھوں لاچار لوگوں کے کرب کو ذاتی طور پر محسوس کرتے ہیں اور تنہائیوں میں ان کے لئے اللہ تعالیٰ کے حضور متضرعانہ دعائیں کرتے ہیں۔ آپ خود فرماتے ہیں کہ بعض لوگوں کے دکھ درد جو خوفناک حد تک ناقابل برداشت ہوتے ہیں میں نے ان کو اپنا دکھ بنالیا ہے۔

بعض افریقی ممالک کی غربت اور حالت زار کا ذکر کرتے ہوئے تو آپ کو اپنے جذبات پر قابو نہیں رہتا۔ آواز گلوگیر ہو جاتی ہے۔ الفاظ حلق میں پھنس کر رہ جاتے ہیں اور طبیعت سنبھلنے تک بولتے بولتے چپ ہو جاتے ہیں۔ ادھر سامعین کا رو رو کر برا حال ہو جاتا ہے۔ آپ دکھی انسانوں کے دکھ کا نقشہ ہی اس دکھ اور درد سے کھینچتے ہیں کہ سننے والا بے قرار ہو جاتا ہے۔

یہ لوگ جن کا ذکر آپ فرماتے ہیں ضروری نہیں کہ وہ قریب کے ممالک سے تعلق رکھتے ہوں بلکہ عین ممکن ہے کہ ان کا تعلق ایسے دور دراز کے ممالک سے ہو جن کا نام بھی سامعین نے شاید ہی سنا ہو اور نہ ہی وہاں کبھی گئے ہوں لیکن یہ آپ کی خطابت کی سچائی ہے کہ سننے والے دلی طور پر محسوس کرنے لگتے ہیں کہ ان مجبوروں کو دعا اور دوا دونوں کی کتنی ضرورت ہے اور ان کی حالت زار اس امر کی متقاضی ہے کہ ان کے دکھ اور کرب کو کم کرنے کے لئے ڈاکٹروں، اساتذہ، انجینئروں اور ہر طرح کی مالی امداد فوراً ان تک پہنچائی جائے۔ جب آپ پاکستان میں رہنے والے احمدیوں پر ڈھائے جانے والے مظالم کا ذکر فرماتے ہیں تو شدت جذبات سے آپ بے تاب ہو جاتے ہیں۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ آنکھیں آنسوؤں سے (جنہیں آپ چھپانے کی کوشش کر رہے ہوتے ہیں) ڈبڈبا جاتی ہیں۔ ایک احمدی نے مجھے بتایا کہ مظلوم خواہ کوئی بھی ہو، کہیں بھی ہو، اس کا دکھ ہمیشہ

آپ کا اپنا دکھ بن جاتا ہے۔ جہاں تک دنیا بھر کی غریب، مسکین، بے کس، بیمار اور دکھی انسانیت کی خاطر قبولیت دعا کا تعلق ہے (حضرت) خلیفہ رابع اس یقین پر قائم ہیں کہ ایسی دعا ضرور قبول ہوتی ہے اور اس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔

☆ ☆ ☆

27

اللہ تعالیٰ کے حضور فریاد

جنرل ضیاء کے نافذ کردہ آرڈیننس نمبر ۲۰ کے ذریعے احمدیوں کو اپنے مذہب پر عمل پیرا ہونے کے حق سے محروم کردیا گیا۔ اس طرح اس نے مذہبی منافرت اور لاقانونیت کو ایک ناجائز اور جعلی قانونی جواز فراہم کردیا اور مذہبی اختلافات کے شعلوں کو ہوا دے کر کچھ اس طرح بھڑکایا کہ مشتعل ہجوم لوٹ مار اور قتل وغارت کے نشے میں دھت گلی کوچوں میں نکل آئے۔ احمدیہ مساجد کی بے حرمتی کی گئی اور انہیں توڑ پھوڑ کر رکھ دیا گیا۔ قبروں پر نصب کتبوں پر کندہ کلمات مثلاً رضی اللہ عنہ (اللہ اس سے راضی ہو) علیہ السلام (اس پر سلامتی ہو) کو کھرچ کھرچ کر مٹادیا۔ ان پر رنگ پھیردیا یا ہتھوڑے مار مار کر کتبوں کو ہی توڑ ڈالا۔

جہاں کسی احمدی عمارت پر ''مسجد'' کا لفظ لکھا ہوا نظر آیا اسے کالک پھیر کر مٹا دیا گیا۔ قبرستان سے احمدیوں کی قبریں اکھاڑ دی گئیں اور نعشوں کو باہر پھینک دیا گیا کیونکہ احمدیوں کی نعشیں وہاں مدفون مسلمانوں کے آرام اور چین میں خلل

انداز ہو رہی تھیں۔

حکومتی سطح پر تشدد اور ایذا رسانی کا بازار گرم تھا۔ البتہ اکا دکا واقعات ایسے بھی ہوئے جہاں پولیس اور وکلاء نے بے گناہ شہریوں پر ڈھائے جانے والے ان مظالم پر دل ہی دل میں شرمندگی محسوس کی۔ اس نئے فرمان کے تحت چار سال کے اندر ہزار سے زائد احمدیوں کو "بسم اللہ" یا "السلام علیکم" کہنے یا اسی قسم کے "جرائم" میں ملوث قرار دے کر گرفتار کر لیا گیا۔ چار احمدیوں کو پچیس پچیس سال کی قید بامشقت اور چار کو پھانسی کی سزا سنائی گئی۔

اقوام متحدہ کے کمشن برائے بنیادی انسانی حقوق نے اعلان کیا کہ :۔

"پاکستان کا آرڈی نینس نمبر ۲۰ شخصی آزادی اور جان و مال کے تحفظ کے ان مسلّمہ بنیادی انسانی حقوق سے متصادم ہے اور ان کی خلاف ورزی کرتا ہے جن کے تحت من مانی سزاؤں اور بلا جواز گرفتاریوں اور نظر بندیوں کے خلاف تحفظ فراہم کیا گیا ہے اور فکر' اظہار فکر' ضمیر اور مذہب کی آزادی کی ضمانت دی گئی ہے اور مذہبی اقلیتوں کو اپنے عقیدے کے اظہار و بیان اور اس کے مطابق زندگی گزارنے کے حق کو تسلیم کیا گیا ہے"۔

کمیشن نے انسانی حقوق کی بین الاقوامی کانفرنس کے فیصلے کا حوالہ دے کر مزید کہا کہ :۔

"اس آرڈی نینس کی وجہ سے مذہبی تفریق کی بناء پر کی جانے والی بنیادی انسانی حقوق کی بے دریغ خلاف ورزیوں نے انسانی ضمیر کو مجروح اور آزادی' انصاف اور امن عالم کی

بنیادوں کو ہلا کر رکھ دیا ہے"۔

اور حکومت پاکستان سے مطالبہ کیا کہ "آرڈیننس نمبر ۲۰ کو منسوخ اور حکومت پاکستان کے دائرہ اختیار کے اندر جملہ انسانی حقوق اور بنیادی آزادی کو بحال کیا جائے"۔

دیگر بین الاقوامی تنظیموں مثلاً ایمنسٹی انٹرنیشنل اور انٹرنیشنل کمیشن آف جیورسٹس (INTERNATIONAL COMMISSION OF JURISTS) نے بھی اس انصاف دشمن قانون کے خلاف اپنے غم وغصے کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ یہ نیا قانون آزادی ضمیر اور آزادی مذہب کے بنیادی حقوق کی نفی کرتا ہے۔ لہٰذا اسے فی الفور منسوخ کیا جائے۔

اس آرڈیننس کی وجہ سے احمدیوں کو محض "السلام علیکم" کہنے کی پاداش میں جیلوں میں ٹھونس دیا گیا۔ کلمہ (طیبہ) یعنی "لاالہ الااللہ محمد رسول اللہ" کا بیج لگانے پر گرفتار کرلیا گیا۔ ان کا جرم یہ تھا کہ انہوں نے اپنے عقیدے کا اقرار کیا تھا۔ بارہ بارہ سال کی عمر کے بچوں پر مقدمات قائم کردیئے گئے۔ جرم ان کا یہ تھا کہ انہوں نے اپنی درخواستوں میں مذہب کے خانے میں اقرار کیا تھا کہ وہ مسلمان ہیں۔

بری، بحری اور ہوائی افواج اور دیگر سرکاری دفاتر اور محکموں غرض کہ جگہ جگہ احمدیوں سے انتہائی تفریق روا رکھی جانے لگی۔ سرکاری ملازمتوں کے دروازے ان پر بند کردیئے گئے اور جو پہلے سے ملازمت میں تھے ان کی محکمانہ ترقی کے امکانات ختم ہو گئے۔

اس کی نمایاں مثال تو خود ڈاکٹر عبدالسلام ہیں جنہیں پانچ سال بعد ۱۹۷۹ء میں فزکس کا نوبل پرائز ملنے والا تھا۔ ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کے والد ماجد محکمہ تعلیم میں ایک ہیڈ کلرک تھے۔ عبدالسلام سکول کے زمانے سے ہی اپنی غیر معمولی ذہانت

کی وجہ سے ایک امتیازی شان اور شہرت کے مالک تھے۔ پہلے سکول اور پھر یونیورسٹی کی سطح پر جماعت کی طرف سے وظیفے کے حقدار قرار دیئے گئے۔ صرف چودہ سال کی عمر میں میٹریکولیشن کا امتحان دیا اور پنجاب یونیورسٹی کے ریکارڈ توڑ دیئے۔ یونیورسٹی کے امتحانات میں بھی ہر مضمون میں نئے ریکارڈ قائم کئے اور مجموعی طور پر تقریباً سو فیصد مارکس لئے یعنی کل مارکس میں سے صرف سات مارکس کم۔ پنجاب یونیورسٹی کے بعد کیمرج یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ یہاں بھی ان کی کامیابیوں کا سلسلہ برقرار رہا۔ ریاضی کا کورس تین سال کی بجائے دو سال میں پہلی سی شان کے ساتھ مکمل کرلیا۔ اب ایک سال باقی تھا۔ اس ایک سال میں طبیعات (فزکس) کی تعلیم مکمل کرلی اور ناممکن کو ممکن کردکھایا اور اس محدود عرصے میں ریاضی اور طبعیات دونوں کے آنرز میں ڈبل فرسٹ کلاس حاصل کی۔

اب تک تو عبدالسلام اپنے آپ کو ریاضی دان ہی سمجھتے رہے تھے لیکن اب انہوں نے طبعیات میں تخصص حاصل کرنے کا فیصلہ کیا اور حیرت انگیز کارنامہ سرانجام دیا یعنی تین سال کی بجائے صرف پانچ ماہ کے قلیل عرصے میں اپنی تحقیق اور مقالہ مکمل کرلیا اور پی ایچ ڈی کی سند فضیلت کے مستحق قرار پائے اور علم طبعیات کی اس بیش بہا خدمت پر آپ کو سونے کا تمغہ دیا گیا۔ اگرچہ اپنا تحقیقی مقالہ رسمی طور پر پیش کرنے کے لئے آپ کو تین سال تک انتظار کرنا پڑا کیونکہ یونیورسٹی کے قواعد کے مطابق ایسا تحقیقی مقالہ تین سال سے پہلے پیش نہیں کیا جا سکتا۔

۱۹۵۱ء میں آپ واپس پاکستان تشریف لے آئے۔ گورنمنٹ کالج لاہور میں بطور لیکچرار آپ کا تقرر ہو گیا اور ستم ظریفی یہ ہوئی کہ محض انڈر گریجویٹ طلبا کی تدریس آپ کے سپرد کی گئی۔ علاوہ ازیں آپ کو ایک ذمہ داری یہ بھی سونپی گئی

کہ آپ طلباء کی کھیلوں کی نگرانی بھی کیا کریں!

گورنمنٹ کالج لاہور میں تین سال تک تدریس کے فرائض سرانجام دینے کے بعد ڈاکٹر عبدالسلام واپس کیمرج یونیورسٹی چلے گئے جہاں آپ کا تقرر بطور لیکچرار عمل میں آگیا تھا۔ جلد ہی آپ کو لندن یونیورسٹی کے مشہور و معروف امپیریل کالج آف سائنس میں نظری طبعیات کا پروفیسر مقرر کردیا گیا۔ یہیں آپ نے اپنی وہ تحقیق بھی مکمل کی جس کی بناء پر آپ کو نوبل انعام کا مستحق قرار دیا گیا۔ اس کے بعد تو دنیا بھر سے آپ پر انعامات اور اعزازات کی بارش شروع ہوگئی۔ یاد رہے کہ ان میں ایک اعزاز اور انعام بھی ایسا نہیں تھا جس کا کھیلوں کی دنیا سے دور کا بھی تعلق ہو!

جب آپ نجی دورے پر پاکستان واپس آئے تو جنرل ضیاء الحق نے آپ کا ایک ایسے عظیم پاکستانی کی حیثیت سے استقبال کیا جس کی وجہ سے دنیا بھر میں پاکستان کا وقار بلند ہوگیا تھا۔ جنرل ضیاء نے سرکاری کاروں اور پولیس کے حفاظتی دستے کی پیشکش بھی کی مبادا کوئی انتہاپسند مذہبی جنونی ڈاکٹر سلام پر حملہ کردے۔ نیز پاکستانی پاسپورٹ بھی پیش کیا جس میں ڈاکٹر سلام کو مسلمان ظاہر کیا گیا تھا۔ اس طرح جنرل ضیاء نے اپنے ہی جاری کردہ مذہبی تفریق پر مبنی قواعد و ضوابط سے بڑی آسانی سے انحراف بھی کرلیا۔

ڈاکٹر سلام نے پاسپورٹ تو لے لیا لیکن سرکاری کاروں اور حفاظتی دستے کی پیش کش شکریے کے ساتھ مسترد کردی۔ کہنے لگے میرے جان و مال کی فکر نہ کریں جو گزرے گی بھگت لوں گا۔

دنیا جہان کا دستور ہے کہ پاسپورٹ میں اور تفاصیل ہوں یا نہ ہوں جن کے نام پاسپورٹ جاری کیا جاتا ہے اس کے مذہب کے بارے میں کوئی خانہ نہیں ہوتا

لیکن جماعت احمدیہ پر عرصہ حیات مزید تنگ کرنے کے لئے جنرل ضیاء الحق نے یہ حکم بھی دیا کہ مذہب کی تفصیل بھی دی جائے تا کہ جو احمدی جماعت احمدیہ پر توڑے جانے والے ظلم و ستم کی تاب نہ لا سکیں وہ اعلان کر دیں کہ ہم احمدی نہیں ہیں۔ ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ اب پاسپورٹوں کے ذریعے سرکردہ احمدیوں کی فہرستیں تیار کرنے میں بڑی آسانی پیدا ہو گئی۔ جو جماعت دشمن تنظیموں کو حسب ضرورت مہیا کی جا سکتی تھیں۔

نئے قواعد کے ماتحت پاسپورٹ کے اجراء سے پہلے ہر مسلمان کہلانے والے درخواست گزار کے لئے لازمی قرار دے دیا گیا کہ وہ اپنی درخواست کے ہمراہ ایک حلفی اقرار نامہ بھی شامل کرے جس کے الفاظ درج ذیل ہیں:۔

"میں صدق دل سے اعلان کرتا ہوں کہ:۔

۱۔ میں مسلمان ہوں اور محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو غیر مشروط اور کامل طور پر خاتم النّبیین مانتا ہوں۔

۲۔ میں کسی ایسے شخص کو جو محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے بعد کسی بھی معنے اور مفہوم میں نبی ہونے کا مدعی ہو نہ نبی تسلیم کرتا ہوں اور نہ ہی اسے مذہبی مصلح مانتا ہوں۔

۳۔ میں مرزا غلام احمد قادیانی کو جھوٹا نبی سمجھتا ہوں اور اسی طرح اس کے ماننے والوں کو خواہ لاہوری جماعت سے تعلق رکھتے ہوں یا قادیانی جماعت سے، غیر مسلم خیال کرتا ہوں۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر کوئی احمدی ملک سے باہر جانا چاہے اور پاسپورٹ کے لئے درخواست دے تو یا تو وہ اپنے مذہب اور عقیدے سے دست بردار ہو جائے یا ملک سے باہر سفر کرنے کا ارادہ ہی ترک کر دے اور اپنی پاسپورٹ کی درخواست واپس لے لے۔

ایذارسانیاں تسلسل کے ساتھ جاری تھیں۔ ستم پر ستم ڈھائے جارہے تھے۔ احمدیہ مساجد میں لاؤڈ سپیکروں کا استعمال ممنوع قرار دے دیا گیا تھا اور خطیب مجبور ہو گئے تھے کہ وہ خطبہ دیتے وقت مقتدیوں میں سے ایسے لوگوں کی ڈیوٹیاں لگائیں کہ جب خطیب ایک فقرہ بولے تو یہ لوگ اس فقرے کو بآواز بلند دہرائیں اور کوشش کریں کہ خطبے کا یہ ایک فقرہ مسجد میں موجود تمام نمازیوں تک پہنچ جائے۔ پھر خطیب دوسرا فقرہ بولے اور وہ بھی حسب سابق دہرایا جائے۔ پھر تیسرا اور چوتھا فقرہ۔ علی ہذالقیاس۔

جنرل ضیاء جماعت کو ستانے اور تنگ کرنے پر ادھار کھائے بیٹھا تھا۔ وہ جماعت کو نقصان پہنچانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا تھا۔ جب کراچی میں لسانی اور نسلی فسادات ہوئے تو جنرل ضیاء الحق نے آنکھیں مٹکا مٹکا کر اشاروں کنایوں سے یہ عندیہ دینے کی کوشش کی جیسے ان فسادات میں احمدیوں کا ہاتھ ہو اور اعلان کیا کہ حکومت پتہ لگانے کی کوشش کر رہی ہے کہ "قادیانی کس حد تک ان فسادات میں ملوث ہیں"۔

اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ سادہ لوح عوام نے جو حقائق سے سراسر بے خبر تھے، جنرل ضیاء کی ہاں میں ہاں ملائی اور دیکھتے ہی دیکھتے احمدیوں پر ان کے گلی محلے کے لوگوں کی طرف سے تشدد کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔ دیہات میں احمدیوں کے مویشیوں کو مار مار کر گھائل کر دیا گیا۔ ان کی ٹانگیں توڑ دی گئیں۔ لیکن یہ سب کچھ ہونے کے باوجود جنرل ضیاء کو اپنے بدارادوں کی تکمیل میں سو فی صد کامیابی پھر بھی حاصل نہ ہو سکی اور وہ پاکستان کی پوری آبادی کو انگیخت کرنے اور اسے اپنے آلہ کار کے طور پر استعمال کرنے میں پورے طور پر پھر بھی کامیاب نہ

ہو سکا۔احمدیوں کے خلاف ترک موالات کی تحریک چلائی گئی۔احمدی تاجروں اور دوکانداروں کا بائیکاٹ کیا گیا لیکن یہ حربہ بھی ناکام رہا۔وجہ اس کی یہ ہوئی کہ اپنی امانت اور دیانت کی وجہ سے احمدی تاجروں کی کاروباری حلقوں میں ایک خاص ساکھ اور شہرت تھی' جو اس موقع پر جنرل ضیاء الحق کے بد ارادوں کی راہ میں دیوار بن کر حائل ہو گئی۔

جہاں تک پیشہ ور احمدیوں کا تعلق تھا تو عوام کی ترجیحات تو بالکل واضح تھیں۔ ان کے نزدیک اولیت تو صرف اور صرف قابلیت اور مہارت کو حاصل تھی نہ کہ مذہبی عقائد کو اور اس صورت حال سے تو جنرل ضیاء بھی مستثنیٰ نہیں تھا۔چنانچہ اسے آنکھ کا عارضہ لاحق ہوا تو اس نے اصرار کیا کہ اس کا علاج صرف اور صرف ڈاکٹر نسیم احمد ہی کریں گے۔ڈاکٹر صاحب موصوف آرمی میڈیکل سروس میں بریگیڈیر کے عہدے پر فائز تھے اور ایک معروف احمدی ہیں۔

اور جب جنرل ضیاء کا پراسٹیٹ کا آپریشن ہونے لگا تو ایک بار پھر اس نے کوشش کی کہ اس کا آپریشن صرف اور صرف جنرل محمود الحسن ہی کریں۔جنرل محمود الحسن بھی ایک مشہور و معروف احمدی سرجن ہیں۔

جنرل ضیاء الحق نے جنرل محمود الحسن کو مخاطب کر کے کہا:۔

"آپ واحد سرجن ہیں جن پر میں اس بیماری کی حالت میں اعتماد کر سکتا ہوں"۔

اس موقعہ پر نوجوان احمدیوں نے مزاحیہ انداز میں تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ:۔

"جنرل محمود الحسن صاحب کے نشتر کی ہلکی سی چوک بھی ہماری بہت سی مشکلات کے حل کا باعث بن سکتی تھی"۔

یہ توذاتی مفاد کی بات تھی۔ جہاں تک تصویر کے اصل اور پبلک رخ کا تعلق ہے، جنرل ضیاء نے جماعت کو تباہ کرنے میں کوئی کسر اٹھانہ رکھی۔ وہ حسب سابق اپنی جماعت دشمن سرگرمیوں اور جماعت کی کھال کھینچنے میں دلیر سے دلیر تر ہوتا چلا گیا چنانچہ لندن میں ہونے والی ایک بین الاقوامی کانفرنس کے موقع پر اس نے مندرجہ ذیل پیغام بھیجا۔

> "پچھلے چند سالوں میں بالخصوص پاکستان نے احمدیوں کے خلاف کچھ انتظامی اور قانونی قدم اٹھائے ہیں تاکہ نہ تو وہ اپنے آپ کو مسلمان کہلا سکیں اور نہ ہی اسلامی رسومات اور عبادات بجالا سکیں۔ ہم اپنی کوشش جاری رکھیں گے یہاں تک کہ احمدیت کا سرطان بیخ و بن سے اکھاڑ کر پھینک دیا جائے گا"۔

اس نے جماعت احمدیہ کے خلاف مذہبی تعصب اور منافرت کی آگ کو ہوا دینے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا اور طرح طرح کے حربوں سے احمدیت کو تباہ و برباد کرنے کی کوشش کی۔ اس اشتعال انگیزی کے خلاف احمدیوں نے انتہائی صبر و تحمل سے کام لیا اور کسی بھی قسم کی انتقامی کارروائی سے گریز کیا۔ احمدیوں کی عبادت گاہیں اب بیوت کہلانے لگیں کیونکہ قانوناً اب انہیں مسجد نہیں کہا جا سکتا تھا۔ جب احمدیہ مساجد نذر آتش کردی گئیں تو احمدیوں نے اپنے گھروں میں باجماعت نماز ادا کرنی شروع کردی۔

(حضرت) خلیفہ رابع نے جماعت کو تسلی دی اور فرمایا کہ سب احمدی صبر سے کام لیں اور فکر نہ کریں۔ جنرل ضیاء الحق نے مخالفت کی جو آگ بھڑکائی ہے بالآخر وہ خود اس میں بھسم ہو کر رہ جائے گا۔

عالمی رائے عامہ اب کلیتہً جنرل ضیاء الحق کے خلاف ہو چکی تھی- خود پاکستان میں وہ اپنا اعتبار کھو چکا تھا- عوام چاہتے تھے کہ کسی طرح اس سے گلو خلاصی ہو- لیکن بے بس تھے- انہیں سمجھ نہیں آتی تھی کہ اس سے کس طرح چھٹکارا حاصل کریں- ادھر امریکہ اور سوویت یونین کے بگڑتے ہوئے تعلقات کی وجہ سے جنرل ضیاء کو خاص اہمیت حاصل ہو گئی تھی- روس نے افغانستان پر حملہ کر دیا تھا اور افغانستان میں بر سرپیکار مجاہدین کو مغربی ممالک کی امداد پاکستان ہی کے راستے پہنچائی جا رہی تھی- اس لئے ان ممالک نے بھی چپ سادھ لی تھی- نتیجتاً احمدیوں پر مظالم کے پہاڑ ٹوٹتے رہے اور پاکستان کے بے بس عوام خاموش تماشائی بنے دور سے اس اذیت ناک منظر کا نظارہ کرتے رہے- وہ خود بھی تو ایک جابر حکومت کے جبر کی چکی میں پس رہے تھے- بولتے تو کیسے اور صدائے احتجاج بلند کرتے تو کیوں کر-

اس نازک مرحلے پر (حضرت) خلیفہ رابع اللہ تعالیٰ سے راہنمائی اور روشنی کی دعا ہی کر سکتے تھے- چنانچہ آپ نے دعا مانگی کہ اے خدا! تو ہی بتا کہ میں پاکستان کے مظلوم احمدیوں کی بہتر طور سے کس طرح مدد کر سکتا ہوں- تو ہی بتا خاموش رہوں یا بولوں- آپ فرماتے ہیں:-

> "میں جانتا تھا کہ اگر جنرل ضیاء الحق جماعت پر ڈھائے جانے والے مظالم سے باز نہ آیا تو مجھ پر یہ فرض منصبی عائد ہے کہ میں اسے خدا (تعالیٰ) کے غضب سے ڈراؤں جو اس پر نازل ہونے والا تھا- لہٰذا میں نے ان مظالم کے خلاف کھل کر صدائے احتجاج بلند کی جو بے گناہ اور معصوم احمدیوں پر ڈھائے جا رہے تھے- میں نے اسے بتایا کہ خدا (تعالیٰ) تو محبت

ہی محبت ہے۔ وہ رحیم و کریم ہے۔ اگر اب بھی ان مظالم سے
ہاتھ روک لو تو سابقہ ظلم و ستم کے باوجود وہ تمہیں معاف
کر سکتا ہے"۔

لیکن ضیاء الحق کے غیض و غضب اور تشدد میں کمی آنی تھی نہ آئی۔ جوں جوں اس کے ظلم و ستم میں تیزی آتی گئی۔ (حضرت) خلیفہ رابع کے خطبات کی صدائے احتجاج بھی بلند سے بلند تر ہوتی گئی۔ راتوں پر راتیں اور مہینوں پر مہینے گزرتے رہے اور (حضرت) خلیفہ رابع اللہ (تعالیٰ) کے حضور گریہ زاری اور دعاؤں میں لگے رہے کہ "اے خدا ان مظلوم احمدیوں کی مدد کے لئے آ" آپ روزانہ قرآن کی تلاوت کرتے اور خدا (تعالیٰ) سے راہنمائی طلب کرتے۔

بالآخر وہ ساعت سعید بھی آن پہنچی جب خدا تعالیٰ نے آپ پر الہاماً انکشاف فرمایا کہ انہیں کون سا راستہ اختیار کرنا چاہئے۔ لوگوں کا ایک جم غفیر (حضرت) امام جماعت احمدیہ کا منتظر تھا کہ وہ اپنی رہائش گاہ سے جو دفاتر اور لندن مسجد کے ملحقہ ہال کے اوپر واقع تھی۔ کب باہر تشریف لاتے ہیں اور کب چند قدم کے فاصلے پر واقع مسجد میں داخل ہوتے ہیں۔ یوں لگتا تھا جیسے ان لوگوں کو بھی کچھ یقین سا ہو چکا ہو کہ کوئی اہم اور عظیم الشان واقعہ ہونے والا ہے۔

یہ جمعہ کا دن تھا اور جون ۱۹۸۸ء کی تین تاریخ۔ لندن مسجد نسبتاً ایک مختصر سی عمارت ہے۔ اس کا طول ۴۳ فٹ اور عرض ۲۶ فٹ۔ اس میں صرف دو سو نمازیوں کے لئے نماز ادا کرنے کی گنجائش ہے۔ جس قطعہ اراضی پر یہ مسجد بنی ہوئی ہے اس کا رقبہ ایک ایکٹر کے لگ بھگ ہے۔ مسجد ساؤتھ فیلڈز کے مضافات میں گریسن ہال روڈ پر واقع ہے۔ اس علاقے کے متعلق وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ یہاں امیر بستے ہیں یا غریب، متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والے یہاں

رہائش رکھتے ہیں یا مزدور لوگ۔ دراصل یہاں سبھی قسم کے لوگ آباد ہیں۔ یہ
علاقہ سب کا ہے۔

مسجد کے سامنے سڑک کے پار متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والوں کے ذاتی
مکانات ہیں، جن کے ساتھ خوبصورت باغیچے ہیں اور جن کی خوب شوق سے دیکھ
بھال کی جاتی ہے۔ مسجد کی جانب اسی سڑک پر کونسل کے بلند و بالا رہائشی بلاک
ہیں۔ ذرا ہٹ کر پٹنی کی سایہ دار سڑکیں آجاتی ہیں جہاں دو رویہ سایہ دار
درختوں کی قطاروں میں متمول طبقے کی رہائش گاہیں ہیں۔ اگر اس سے ذرا ہٹ کر
مخالف سمت میں جائیں تو واجبی قسم کے معمولی مکانات کی بھی کمی نہیں۔

۱۹۲۴ء میں جب یہ مسجد بنائی گئی تو ان دنوں لندن میں مقیم احمدیوں کے لئے
اس میں کافی سے زیادہ گنجائش تھی۔ جنگ عظیم دوم کے بعد جمعہ کے موقع پر بھی
بسا اوقات پانچ دس نمازی ہی ہوا کرتے تھے۔

لیکن آج مسجد کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ نمازیوں کا کھوے سے کھوا چھل رہا
تھا۔ مسجد کا راستہ کھلا چھوڑ دیا گیا تھا جس میں حفاظتی عملے کے افراد جگہ جگہ متعین
تھے۔ باہر دفاتر کے کمرے، ہال اور مسجد کا وسیع صحن سبھی نمازیوں سے پُر تھے۔
ڈیڑھ بجے بعد دوپہر (حضرت) خلیفہ رابع حسب معمول تیز تیز اور لمبے قدم
اٹھاتے ہوئے مسجد میں داخل ہوئے۔ آپ نے تشہد اور تعوذ کے بعد پہلے سورہ
فاتحہ کی تلاوت فرمائی جو قرآن (مجید) کی پہلی سورت ہے۔ پھر آپ نے قرآن
(کریم) کی تیسری سورت کی آیت نمبر ۶۲ کی تلاوت کی، جس کا ترجمہ یہ ہے:۔

"اب جو (شخص) تیرے پاس علم (الٰہی) آچکنے کے بعد تجھ
سے اس کے متعلق کج بحثی کرے تو تُو اسے کہدے کہ آؤ ہم
اپنے بیٹوں کو بلائیں اور تم اپنے بیٹوں کو۔ اور ہم اپنی

عورتوں کو اور تم اپنی عورتوں کو اور ہم اپنے نفوس کو اور تم اپنے نفوس کو۔ پھر گڑگڑا کر دعا کریں اور جھوٹوں پر لعنت ڈالیں" (۶۲ : ۳)

آپ نے پہلے اس آیت کا شان نزول بیان کیا کہ ایک مرتبہ نجران کے عیسائیوں کا ایک وفد (آنحضرت) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے ملاقات کے لئے آیا اور الوہیت مسیح کے موضوع پر مباحثہ کرنا چاہا۔ یہ مباحثہ دیر تک جاری رہا اور عیسائی وفد اپنے دلائل کی تکرار پر تکرار کرتا چلا گیا۔

بالآخر (آنحضرت) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کھڑے ہوئے اور فرمایا کہ معقول دلائل کا چونکہ کوئی نتیجہ بر آمد نہیں ہو سکا اس لئے مباحثے کو مزید طول دینے کا کچھ فائدہ نہیں۔ اب مباہلہ کا طریق باقی رہ گیا ہے۔ اب اللہ تعالیٰ فیصلہ کرے گا کہ کون سچا ہے اور کون افترا سے کام لے رہا ہے۔ یہ سچ اور جھوٹ کے درمیان فیصلہ ہے جو موت کی شکل میں بھی ہو سکتا ہے۔ یہ الٰہی فیصلہ ہو گا جو آسمان سے نازل ہو گا۔ آپ نے فرمایا کہ مباہلہ ایک طرح کا دعاؤں کا مقابلہ یا روحانی کُشتی ہے اور اس کا محض اختلاف رائے یا غلط عقائد سے کوئی تعلق نہیں۔ اسلام تو عیسائیوں، یہودیوں اور دیگر مذاہب کے پیروکاروں کے حقوق کے احترام اور تحفظ کی ضمانت دیتا ہے۔ مباہلہ صرف ان لوگوں کے لئے ہے جو دانستہ جھوٹ بول رہے ہوں، کذب و افترا پر بضد ہوں۔

مباہلہ ہمیشہ دو فریقوں کے مابین ہوتا ہے۔ ان میں سے ایک فریق سچائی اور مامور من اللہ کا نمائندہ ہونے کا دعویٰ کرتا ہے اور دوسرا اس دعوے کی تکذیب کرتا ہے۔ دونوں فریق مباہلے کے میدان میں سر دھڑ کی بازی لگا کر اترتے ہیں۔

آپ نے مزید فرمایا:۔

"ضیاء الحق خدا (تعالیٰ) کے فرستادہ مسیح موعود (علیہ السلام) کی مسلسل تکذیب کرتا چلا جارہا ہے اور ان کے ماننے والوں کو تشدد کا نشانہ بنارہا ہے"۔

فرمایا:۔

"میں نے ان ظالموں کو بار بار ان کے ظلم و ستم اور ان کی غلط کاریوں پر متنبہ کیا ہے۔ میں نے کتنی بار ان کے سامنے موسیٰ (علیہ السلام) کے بارے میں قرآن کریم کی اس آیت کا حوالہ دیا ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے کہ وہ جھوٹے مدعی نبوت کو آپ سزادے گا لیکن اگر وہ مدعی جھوٹا نہیں سچا ہے اور تم نے جان بوجھ کر اس پر تشدد کیا ہے' تو یاد رکھو خدا (تعالیٰ) کے غضب سے بچ نہیں سکو گے۔

پاکستان میں جس سوچے سمجھے ہوئے منصوبے کے تحت اور جس دیدہ دلیری سے احمدیوں پر تشدد کیا جارہا ہے' اس کا ذمہ دار جنرل ضیاء الحق ہے۔ اخبارات میں مسیح موعود علیہ السلام کے متعلق نہایت غلیظ اور توہین آمیز کارٹون چھاپے جارہے ہیں اور جماعت احمدیہ کے بارے میں کذب و افترا اور بے بنیاد الزامات کی شرمناک مہم چلائی جارہی ہے۔"

آپ نے چند ایک الزامات کا حوالہ دیتے ہوئے فرمایا:۔

"مثال کے طور پر کہا جارہا ہے کہ احمدی اسرائیلی فوج میں شامل ہو کر جنگی فرائض سرانجام دے رہے ہیں۔ احمدی پاکستان کو تباہ کرنے کے منصوبے بنارہے ہیں۔ تمام احمدی

بھارت کے جاسوس ہیں۔ مسلمانوں میں تفرقہ ڈالنے کے لئے
جماعت احمدیہ کو انگریزوں نے قائم کیا اور آج کل عیسائیوں
کی بین الاقوامی تنظیمیں جماعت کی مالی مدد کر رہی ہیں۔ مسیح
موعود (علیہ السلام) چور تھے۔ افیمی تھے۔ ان کا دعویٰ تھا کہ وہ
ابن اللہ ہیں بلکہ در حقیقت خدا ہیں۔ لگے ہاتھوں یہ الزام بھی
لگایا گیا کہ ان کے نزدیک عیسیٰ (علیہ السلام) شرابی تھے۔ کہاں
تک بیان کیا جائے۔ جھوٹے الزامات اور اتہامات کا یہ سلسلہ
بے حد طویل اور لامتناہی ہے"۔

فرمایا:-

"ان تمام الزامات کے جواب میں مَیں اتنا کہنے پر اکتفا
کروں گا کہ "لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكَاذِبِيْنَ" یعنی جھوٹوں پر
خدا کی لعنت ہو۔

اگر تم میں مباہلے کا چیلنج قبول کرنے کی جرأت ہے تو آؤ
اور انتظار کرو کہ تمہارے عبرت ناک انجام کے متعلق
خدائی فیصلہ کیا شکل اختیار کرتا ہے"۔

مزید فرمایا:-

"میں تو چاہتا ہوں کہ تم لوگ جو جھوٹ کی غلاظت پر منہ
مار رہے ہو، اس سے باز آجاؤ اور مباہلے کا چیلنج قبول کرنے
میں عجلت سے کام نہ لو۔ ہم نے یہ چیلنج دے دیا ہے اور دنیا بھر
میں اس کا اعلان کر دیا ہے۔ میرا مشورہ تمہیں یہ ہے کہ
خدا تعالیٰ کے غضب سے ڈرو اور اس چیلنج کو قبول کرنے کی

غلطی نہ کرو۔ نجران کے عیسائیوں کی سی دانش مندی کا ثبوت دو، جنہوں نے آنحضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا مباہلے کا چیلنج قبول کرنے سے گریز کیا تھا۔ لیکن یاد رکھو اگر تم اس چیلنج کے بعد مباہلے کے میدان میں اتر آئے تو یقینی امر ہے اور اس میں کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ الٰہی فیصلہ پوری شان و شوکت کے ساتھ صادر ہوگا اور الٰہی منشا پورا ہو کر رہے گا"۔

آپ نے فرمایا تھا کہ میں فوراً ہی مباہلے کا اعلان کروں گا پھر بھی آپ نے پورے ایک ہفتہ تک توقف فرمایا اور انتظار کیا۔ اگلے جمعہ کے دن یعنی ۱۰ جون کو لندن مسجد میں پہلے سے بڑھ کر نمازیوں کا ہجوم تھا۔ پاکستان میں احمدیوں پر ڈھائے جانے والے مظالم کا سلسلہ بدستور جاری تھا اور اس کے رکنے کے کوئی آثار دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ نت نئے مظالم اور ایذارسانیوں کی خبریں آرہی تھیں۔ اس حالت زار اور بے بسی کے عالم میں تمام احمدی بانی سلسلہ احمدیہ (حضرت) مسیح موعود (علیہ السلام) کی بارگاہ الٰہی میں کی گئی اس فریاد کو دہرا رہے تھے۔ جب آپ پر بھی اسی قسم کے ستم روا رکھے جا رہے تھے۔ آپ نے فرمایا تھا۔

"حیلے سب جاتے رہے اک حضرت تواب ہے۔"

اپنے خطبے میں (حضرت) خلیفہ رابع نے چند ایک اور بے بنیاد اور کذب و افترا پر مبنی الزامات کا ذکر کیا جو ضیاء الحق اور اس کے حاشیہ برداروں کی طرف سے جماعت احمدیہ پر لگائے جا رہے تھے۔ مثلاً یہ کہ احمدیوں نے پاکستان کے ایٹمی راز چُرا کر اسرائیل کے پاس فروخت کر دیئے ہیں۔ یہ کہ روسی ایجنٹ ربوہ میں احمدیوں کو تخریب کاری کی تربیت دے رہے ہیں۔ یہ کہ ربوہ میں ۷۰ صندوقوں

میں بند رائفلوں اور دیگر ہتھیاروں کا ذخیرہ موجود ہے۔ یہ کہ پانچ سو مذہبی راہنماؤں کے قتل کا منصوبہ بنایا گیا ہے اور یہ کہ راولپنڈی میں فوجی اسلحہ خانہ میں ہونے والے دھماکوں کی ذمہ داری احمدیوں پر عائد ہوتی ہے۔

فرمایا:-

"ہمارے پاس اب اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں رہا کہ ہم انہیں مباہلہ کی دعوت دیں اور اس مقدمے کو اللہ تعالیٰ کی عدالت میں لے جائیں جو قرآن کریم کے الفاظ میں علیم ہے۔ خبیر ہے۔ قادر ہے اور قدیر ہے"۔

پھر آپ نے قرآن کریم کی سورہ آل عمران کی آیت نمبر ۶۲ کی تلاوت کی۔

"آؤ ہم اپنے بیٹوں کو بلائیں اور تم اپنے بیٹوں کو اور ہم اپنی عورتوں کو اور تم اپنی عورتوں کو اور ہم اپنے نفوس کو اور تم اپنے نفوس کو۔ پھر گڑگڑا کر دعا کریں اور جھوٹوں پر لعنت ڈالیں"۔(۶۲-۳)

آپ نے مباہلہ کی اس آیت کو دہرایا اور اللہ تعالیٰ کے حضور دعا کی کہ:-

"اے قادر و توانا، عالم الغیب والشہادہ خدا! ہم تیری جبروت اور تیری عظمت اور تیرے وقار اور تیرے جلال کی قسم کھا کر اور تیری غیرت کا حوالہ دے کر تجھ سے یہ استدعا کرتے ہیں کہ ہم میں سے جو فریق بھی ان دعاوی میں سچا ہے، جن کا ذکر اوپر گذر چکا ہے اس پر دونوں جہان کی رحمتیں نازل فرما۔ اس کی ساری مصیبتیں دور کر۔ اس کی سچائی کو ساری دنیا پر روشن کردے۔ اس کو برکت دے اور اس کے معاشرہ سے

ہر فساد اور ہر شر کو دور کردے اور اس کی طرف منسوب ہونے والے ہر بڑے اور چھوٹے مرد و عورت کو نیک چلنی اور پاکبازی عطا کر اور سچا تقویٰ نصیب فرما۔ اس سے اپنی قربت اور پیار کے نشان پہلے سے بڑھ کر ظاہر فرما تاکہ دنیا خوب دیکھ لے کہ تو ان کے ساتھ ہے اور ان کی حمایت اور ان کی پشت پناہی میں کھڑا ہے اور ان کے اعمال' ان کی خصلتوں اور اٹھنے اور بیٹھنے اور اسلوب زندگی سے خوب اچھی طرح جان لے کہ یہ اللہ والوں کی جماعت ہے اور اللہ کے دشمنوں اور شیطانوں کی جماعت نہیں ہے۔

اور اے خدا! تیرے نزدیک ہم میں سے جو فریق جھوٹا اور مفتری ہے اس پر ایک سال کے اندر اپنا غضب نازل فرما اور اسے ذلت اور نکبت کی مار دے کر اپنے عذاب اور قہری تجلیوں کا نشانہ بنا اور اس طور سے ان کو اپنے عذاب کی چکی میں پیس اور مصیبتیں ان پر ڈال اور بلاؤں پر بلائیں ڈال تا دنیا خوب اچھی طرح دیکھ لے کہ ان آفات میں کسی بندے کی شرارت اور دشمنی اور بغض کا دخل نہیں بلکہ محض خدا کی غیرت اور قدرت کا ہاتھ ہے جو یہ سب عجائب کام دکھلا رہا ہے۔ تو اس رنگ میں جھوٹے گروہ کو سزا دے کہ اس سزا میں مباہلہ میں شریک کسی فریق کے مکر و فریب کا کوئی دخل نہ ہو اور وہ محض تیرے غضب اور تیری عقوبت کی جلوہ گری ہو تاکہ سچے اور جھوٹے میں خوب تمیز ہو جائے اور حق اور

باطل کے درمیان فرق ظاہر ہو اور ظالم اور مظلوم کی راہیں جدا جدا کر کے دکھائی جائیں اور ہر وہ شخص جو تقویٰ کا بیج اپنے سینہ میں رکھتا ہے اور ہر وہ آنکھ جو اخلاص کے ساتھ حق کی متلاشی ہے اس پر معاملہ مشتبہ نہ رہے اور ہر اہل بصیرت پر خوب کھل جائے کہ سچائی کس کے ساتھ ہے اور حق کس کی حمایت میں کھڑا ہے۔ (آمین یارب العالمین)

مباہلہ کا چیلنج دیا جا چکا تھا۔

28

آسمانی فیصلہ

(حضرت) خلیفہ رابع کا یہ تاریخی اور تاریخ ساز خطبہ ریکارڈ کر لیا گیا اور اس کی نقول چوبیس گھنٹوں کے اندر اندر دنیا بھر کی جماعت ہائے احمدیہ تک پہنچ گئیں۔ ملک ملک کی مقامی زبانوں میں اس کے تراجم کو بھی ریکارڈ کیا گیا اور ان کی نقول بھی وسیع پیمانے پر تقسیم کر دی گئیں۔ ادھر مباہلہ کے چیلنج کا اعلان ہو رہا تھا ادھر (حضرت) خلیفہ رابع نے ایک بار پھر جنرل ضیاء الحق سے اپیل کی کہ وہ باز آجائے اور احمدیوں پر کئے جانے والے تشدد سے ہاتھ کھینچ لے۔ آپ نے فرمایا:۔

"اگر تمہارے دل میں خدا خوفی کی کوئی رمق موجود ہے اور اگر اپنی دنیوی وجاہت کی وجہ سے اپنی غلطیوں کا اعتراف کرتے ہوئے ہچکچاتے ہو تو کم از کم اتنا تو کرو کہ اس ظلم و ستم سے باز آجاؤ اور احمدیوں پر کئے جانے والے تشدد سے ہاتھ کھینچ لو اور خاموشی اختیار کر لو۔ ہم فرض کر لیں گے کہ تم نے

مباہلے کا چیلنج قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے اور ہم خدا تعالیٰ سے دعا کریں گے کہ وہ تمہیں اپنے غضب کی آگ سے بچالے"۔

لیکن افسوس کہ اس پر بھی اس کی ایذا رسانیاں بند نہ ہوئیں۔
(حضرت) خلیفہ رابع نے ایک بار پھر خبردار کیا اور ایک اور موقع دیتے ہوئے فرمایا:-

"ہم نہیں چاہتے کہ ایسے ملک کا سربراہ جس سے ہمارا تعلق ہے اللہ تعالیٰ کے غضب کی زد میں آجائے۔ اگر ملک کی بدقسمتی سے ایسا ہو گیا تو بات یہاں تک محدود نہیں رہے گی بلکہ اس کے بعد خدا تعالیٰ کے غضب کے قہری نشانوں کا ایک لمبا سلسلہ شروع ہو جائے گا"۔

بعض لوگوں کی رائے تھی کہ مباہلہ کی شرائط پوری نہیں ہوئیں۔ اس لئے عملاً مباہلہ ناممکن ہے اور غیر مؤثر ہے کیونکہ ضیاء الحق نے علی الاعلان اس چیلنج کو قبول نہیں کیا جبکہ مباہلہ دور جدید کے ذرائع ابلاغ یعنی آڈیو ویڈیو کیسٹس وغیرہ کے ذریعے عمل میں نہیں لایا جاسکتا۔

(حضرت) خلیفہ رابع نے اس نقطہ نظر کو مسترد کرتے ہوئے فرمایا:-

"ضروری نہیں کہ ایسا شخص چیلنج قبول کرنے کا اعلان بھی کرے۔ اس ظلم و ستم پر اصرار ہی اس امر کا اعلان ہے کہ اس نے چیلنج قبول کر لیا ہے۔ اب وقت ہی فیصلہ کرے گا۔ ظالم خدا تعالیٰ کے سامنے کہاں تک اپنے کبر و غرور اور ہٹ دھرمی پر قائم رہتا ہے"۔

فرمایا:-

"خدا تعالیٰ خوب جانتا ہے کہ فریق ثانی کی خاموشی کا کیا مطلب ہے"۔

مباہلہ کا فریق ثانی صرف جنرل ضیاء الحق ہی نہیں تھا بلکہ وہ لوگ بھی تھے جو احمدیوں پر کئے جانے والے تشدد میں عملاً اس کا ہاتھ بٹا رہے تھے۔

مباہلہ کے پمفلٹ اور اشتہار شاہکوٹ بھی پہنچے۔ یہ پاکستان میں ضلع شیخوپورہ کا ایک چھوٹا سا قصبہ ہے۔ یہاں ایک صاحب عاشق حسین رہتے تھے۔ پیشہ کے لحاظ سے زرگر تھے۔ احمدیوں پر توڑے جانے والے مظالم کے روح رواں تھے اور بلوائیوں کو احمدیوں پر خشت باری کے لئے منظم کرنے اور اکسانے میں ہمیشہ پیش پیش رہتے تھے۔ مباہلہ کے پمفلٹ پہنچتے ہی عاشق حسین نے ایک بہت بڑا جلوس منظم کیا اور اعلان کیا کہ اس بار احمدیوں کو صرف اینٹ پتھر کا نشانہ ہی نہیں بنایا جائے بلکہ ان کے نام نہاد مباہلہ کا بھی فیصلہ کردیا جائے گا۔ ان کی دکانیں اور مکانات لوٹ لئے جائیں گے اور انہیں نذر آتش کردیا جائے گا۔ ان کے مال مویشی ہلاک کردیئے جائیں گے اور ضلع شیخوپورہ کی حدود میں رہنے والا ہر احمدی یا تو موت کے گھاٹ اتار دیا جائے گا یا وہ یہاں سے فرار کا راستہ اختیار کرنے پر مجبور ہو جائے گا۔ دونوں صورتوں میں فیصلہ کرنے میں آسانی ہو جائے گی کہ مباہلہ کے بعد خدا تعالیٰ کس فریق کے ساتھ ہے۔

جب ہجوم پوری طرح مشتعل ہو گیا تو عاشق حسین چاقو اور چھریاں لینے کے لئے اپنی دوکان میں داخل ہوا۔ اس نے بجلی کا پنکھا چلانا چاہا جو روزانہ اس کے زیر استعمال رہتا تھا۔ اس نے بجلی کے بٹن کو ہاتھ لگایا ہی تھا کہ وہ ایک جھٹکے سے فرش پر دھڑام سے گر گیا۔ برقی رو نے اس کا کام تمام کردیا تھا۔ ہجوم جو احمدیوں پر حملے کے لئے پر تول رہا تھا ٹھٹھک کر رہ گیا۔ وہی ہجوم جو احمدیوں کے قتل و غارت کے لئے

نکلا اب ایک ماتمی جلوس بن چکا تھا جو اپنے لیڈر کی نعش اٹھائے احمدیوں کے گھروں کی بجائے کہیں اور جا رہا تھا۔

برطانیہ میں رہنے والے جماعت احمدیہ کے ایک مشہور مخالف نے مباہلہ کا چیلنج قبول کرلیا لیکن جلد ہی وہ بھی کار کے ایک حادثے میں ہلاک ہوگیا۔ جب سوگوار لوگ تعزیت کے لئے ان کے مکان میں جمع ہوئے تو مکان کی چھت اچانک دھڑام سے بیٹھ گئی اور نہ خانے پر جا گری اور بہت سے لوگ زخمی ہوگئے۔

ایک اُور مسلمان عالم دین نے کہا کہ وہ مباہلہ کے چیلنج کو قبول کرے گا لیکن اپنی دھواں دھار تقریر میں اس نے مباہلہ کی قبولیت تو درکنار اس کا نام تک نہیں لیا۔ اس نے کہا وہ تبادلہ خیالات یا مناظرہ کرنا چاہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ تبادلہ خیالات مباہلہ تو نہیں ہے۔ نہ اس کا یہ مقصد ہے کہ فیصلہ خدا تعالیٰ پر چھوڑ دیا جائے اور اس سے دعا کی جائے کہ وہ جھوٹے پر اپنی لعنت نازل فرمائے۔

بعض دیگر مولویوں نے ایک سے بڑھ کر ایک انوکھے مقابلے کی تجاویز پیش کیں۔ مثلاً یہ کہ فریقین مقررہ جگہ پر دریا میں چھلانگ لگا دیں یا آگ میں کود جائیں یا کسی بلند و بالا عمارت سے زمین پر چھلانگ لگا دیں لیکن اس کے ساتھ ایک شرط یہ بھی تھی کہ اس مقررہ مقام کی نشان دہی مولوی صاحبان ہی اپنی مرضی سے کریں گے اور (حضرت) خلیفہ رابع کے لئے وہاں بذات خود حاضر ہونا ضروری ہوگا۔ ورنہ وہ یکطرفہ فتح کا اعلان کردیں گے۔ بعض اور لوگوں نے مقابلہ کے جوابی چیلنج تو جاری کئے لیکن جماعت احمدیہ کو ارسال نہیں کئے۔ اور بعض نے چیلنج قبول کرنے کا اعلان تو کیا لیکن خدا تعالیٰ سے یہ دعا نہیں مانگی کہ اے خدا! فریقین میں سے جو بھی جھوٹا ہے اس پر تیری لعنت ہو بلکہ کہا تو اتنا کہا کہ صرف احمدیوں پر خدا کی لعنت ہو۔ جنرل ضیاء الحق خاموش تھا۔

۱۲ اگست کے خطبہ جمعہ میں (حضرت) خلیفہ رابع نے اعلان کیا کہ جنرل ضیاء الحق نے لفظاً، معناً، عملاً کسی شکل میں بھی احمدیوں پر کئے جانے والے مظالم پر پشیمانی کا اظہار نہیں کیا۔ اب معاملہ اللہ (تعالیٰ) کے سپرد ہے۔ ہم اس کی فعلی شہادت کے منتظر ہیں۔ آپ نے واشگاف الفاظ میں اعلان کیا:-

"اب جنرل ضیاء الحق اللہ تعالیٰ کی گرفت اور اس کے عذاب سے بچ کر نہیں جا سکتا"۔

اب واپسی کے سب راستے بند ہو چکے تھے۔

پانچ دن اور گزر گئے۔ اگست کی سترہ تاریخ تھی۔ لندن مسجد کے سابق امام جناب بی اے رفیق نے صبح ہی صبح ایک مکتوب (حضرت) خلیفہ رابع کی خدمت میں بھیجا جس میں انہوں نے اپنے خواب کی تفصیل بیان کی تھی جو انہوں نے اسی رات دیکھا تھا۔ خواب میں انہوں نے دیکھا تھا کہ وہ جنرل ضیاء الحق سے ملے ہیں اور اس سے کہتے ہیں کہ (حضرت) خلیفہ رابع آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچانا چاہتے۔ اس پر جنرل ضیاء الحق اپنا ہاتھ آگے بڑھا کر ان کی ٹھوڑی پکڑ کر بڑی درشتی سے ان کا رخ دوسری جانب دھکیلتا ہے۔ پھر جناب بی اے رفیق کی طرف انگلی سے اشارہ کرتا ہے اور بڑی ترش روئی سے اور ناک چڑھاتے ہوئے کہتا ہے:-

"میں اس کو یعنی (حضرت) خلیفہ رابع کو ایسا سبق سکھاؤں گا جسے وہ عمر بھر یاد رکھے گا"۔

(حضرت) خلیفہ رابع نے اس مکتوب کے جواب میں لکھا کہ معلوم ہوتا ہے کہ جنرل ضیاء الحق اصلاح کی طرف ہرگز مائل نہیں ہے۔ خدا تعالیٰ اس دشمن احمدیت کے منصوبوں کو خاک میں ملا دے اور اسے اپنے ارادوں میں ناکام

وعا مراد کرے۔

ابھی سترہ اگست ہے۔ چند گھنٹے اور گزر چکے ہیں۔ اچانک پاکستان کا آمر مطلق جنرل ضیاء الحق اپنے C.130 ہرکولیس ٹرانسپورٹ طیارے سمیت ایک دھماکے کے ساتھ پرزے پرزے ہو کر فضا میں بکھر گیا۔

پاکستان کے معیاری وقت کے مطابق صدارتی ہوائی جہاز سہ پہر تین بج کر چھیالیس منٹ پر پاکستان کے جنوب مشرق میں واقع بہاولپور کے ہوائی اڈے سے روانہ ہوا۔ وہ آج میجر جنرل محمود درانی کی درخواست پر صبح صبح بہاولپور پہنچے تھے۔ میجر جنرل محمود ان کے ملٹری سیکرٹری رہ چکے تھے اور اب بکتر بند فوج کے کمانڈر تھے۔ انہوں نے جنرل ضیاء الحق سے گذارش کی تھی کہ نئے اور جدید ساخت کے ایک امریکی ٹینک کی آزمائش کے وقت پاکستان کی بری افواج کے تمام کمانڈر موقع پر موجود ہوں گے۔ لیکن اگر آپ نہ آئے تو امریکہ اسے اپنی ہتک خیال کرے گا۔

ٹینک کا آزمائشی تجربہ سرے سے ناکام رہا۔ ٹینک کا نشانہ بالکل چوک گیا لیکن جنرل ضیاء الحق بڑے خوشگوار موڈ میں تھے۔ انہوں نے دوپہر کا کھانا آفیسرز میس میں کھایا۔ کھانے سے فارغ ہو کر وہ رن وے پر پہنچے جہاں ان کا ہوائی جہاز پاک ون (PAK ONE) انتہائی حفاظتی پہرے میں ان کا منتظر تھا۔ جنرل ضیاء الحق پہلے قبلہ رخ ہو کر جھکے۔ بہاولپور ہی میں رک جانے والے جرنیلوں سے ملے۔ ان سے فرداً فرداً معانقہ کیا۔ رخصت ہو کر سیڑھیاں طے کرتے ہوئے جہاز میں داخل ہوئے اور سفر پر روانہ ہو گئے۔

C.130 ایک ٹرانسپورٹ طیارہ ہے۔ ایک خاص قسم کا ایئر کنڈیشنڈ' سفری کمرہ جہاز کے اندر نصب کر دیا گیا تھا۔ اس کے اگلے حصے میں جو اہم ترین شخصیات کے لئے مخصوص تھا' جنرل ضیاء الحق بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے سامنے جنرل اختر

عبدالرحمان چیئرمین جوائنٹ چیف آف سٹاف تشریف فرما تھے جو جنرل ضیاء الحق کے بعد پاکستان کی مقتدر ترین شخصیت تھے۔ان کے ساتھ پاکستان میں مقیم امریکن سفیر آرنلڈ۔ایل۔ریفائل (Arnold L. Raphael) اور پاکستان میں امریکن ملٹری مشن کے سربراہ جنرل ہربرٹ۔ایم۔واسم (General Herbert Wassom) براجمان تھے۔ان کے بعد آٹھ پاکستانی جرنیل اپنی اپنی نشستوں پر متمکن تھے۔پہلے سیسنا (CESSNA) حفاظتی طیارے نے اردگرد کا جائزہ لیا۔یہ معمول کی احتیاطی پرواز اس وقت سے باقاعدہ کی جاری تھی جب چھ سال قبل جنرل ضیاء کے طیارے کو میزائل کے ذریعے مار گرانے کی کوشش کی گئی تھی۔ اس احتیاطی جائزے کے بعد کنٹرول ٹاور نے جہاز کو پرواز کی اجازت دے دی۔

طیارہ اڑا اور ذرا فضا میں بلند ہوا۔کنٹرول ٹاور نے جہاز کے کپتان سے دریافت کیا:۔

"جہاز کا محل وقوع بتائیں۔

جہاز کے کپتان نے جواب دیا:۔

یہ پاک ون (Pak One) ہے۔جواب کا انتظار کریں۔

لیکن اس کے بعد مکمل خاموشی چھا گئی۔طیارے سے رابطہ منقطع ہو گیا اور روانگی کے چند منٹ بعد صدارتی طیارہ لاپتہ ہو چکا تھا۔

چھ میل دور دریا کے کنارے کسان کھیتوں میں کام کر رہے تھے۔انہوں نے ایک ہوائی جہاز کو ہوا میں ڈگمگاتے ہوئے دیکھا جو لہروں کے نرغے میں پھنسی ہوئی سمندری کشتی کی طرح ہچکولے کھا رہا تھا۔تیسری قلابازی کھانے کے بعد طیارہ سیدھا زمین پر آرہا۔گرتے ہی ریتلی زمین میں دھنس گیا اور ایک دھماکے کے ساتھ شعلوں کی لپیٹ میں آگیا۔اکتیس کے اکتیس آدمی جو طیارے میں سفر کر رہے

تھے آن کی آن میں لقمہ اجل بن گئے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ سب زمین پر گرنے سے پہلے ہی سفر آخرت پر روانہ ہو چکے ہوں۔ حادثہ پرواز کے ٹھیک پانچ منٹ کے اندر تین بج کر اکیاون منٹ پر وقوع پذیر ہوا۔

(حضرت) خلیفہ رابع نے دوسرے دن اپنے خطبہ جمعہ میں فرمایا:۔

"خدا تعالیٰ نے فیصلہ فرمادیا"

آپ نے تو جنرل ضیاء الحق کو خدا تعالیٰ کے قہر اور غضب سے خبردار کردیا تھا لیکن ضیاء الحق نے اس تنبیہ کو درخور اعتنا نہ سمجھا۔ پس زمین و آسمان کے مالک کی قہری تجلی نے اس کے پرخچے اڑا دیئے اور ان جرنیلوں کو بھی تباہ و برباد کردیا جو اقتدار کے اس بے جا اور بے محابا استعمال میں اس کے دست و بازو تھے۔

(حضرت) خلیفہ رابع نے مزید فرمایا:۔

"بایں ہمہ کسی دشمن کی موت پر خوش بھی نہیں ہونا چاہئے"۔

چنانچہ آپ نے جنرل ضیاء الحق کی بیگم اور دیگر افراد خاندان کے نام دلی تعزیت کا پیغام بھیجا۔ آپ نے فرمایا:۔

> "اس میں شک نہیں کہ دنیا بھر کے احمدی اس سانحے پر خوش ہیں۔ اس لئے نہیں کہ کوئی مرگیا ہے بلکہ اس لئے کہ انہوں نے خدا تعالیٰ کی تائید اور سچائی کی فتح مبین کا نظارہ کیا ہے۔ یہ نصرت الٰہی کا ایک آسمانی نشان ہے جو ہمیں دیا گیا۔ آنے والے دنوں میں ہماری آئندہ نسلیں اس واقعہ کو فخر کے ساتھ یاد کیا کریں گی کہ خدا (تعالیٰ) کس طرح ان کے آباء واجداد کی مدد کے لئے آسمان سے زمین پر اتر آیا تھا"۔

بہت سے غیر از جماعت لوگوں نے بھی (حضرت) خلیفہ رابع کے اس بیان

سے اتفاق کیا۔ ان میں سے ایک محترمہ بے نظیر بھٹو ہیں جو ذوالفقار علی بھٹو سابق وزیر اعظم پاکستان کی بیٹی ہیں، مسٹر بھٹو کو جنرل ضیاء الحق نے پہلے فوجی انقلاب کے ذریعے اقتدار سے الگ کیا اور بعد ازاں تختہ دار پر لٹکا دیا۔ چنانچہ محترمہ بے نظیر بھٹو نے کہا:۔

"ضیاء الحق کی موت میں خدا (تعالیٰ) کا ہاتھ کام کرتا ہوا نظر آتا ہے"۔

فنانشل ٹائمز لندن کے وقائع نگار خصوصی کرسچین لیمب (CHRISTIAN LAMB) نے ضیاء الحق کی تدفین کی تفاصیل بیان کرتے ہوئے لکھا:۔

"آج سہ پہر کے وقت مطلع صاف ہے اور خوشگوار دھوپ نکلی ہوئی ہے۔ اسلام آباد کی سڑکوں پر تماشائیوں کا اژدہام ہے۔ جشن کا سا سماں ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے کوئی تہوار ہو اور ایسے ملک میں جہاں تفریح کے مواقع نہ ہونے کے برابر ہیں۔ لوگ چھٹی منانے کے لئے سڑکوں پر نکل آئے ہوں ...... جب تابوت کو جس میں نعش کی جگہ جنرل ضیاء الحق کے دانت بند تھے (کیونکہ اس کے جسم کا کوئی بھی حصہ تو باقی نہیں بچا تھا) قبر میں اتارا جا رہا تھا، اکیس توپوں کی سلامی دی گئی"۔

ایک احمدی نے کہا:۔

"وہی دانت جو کبھی مباہلہ کے چیلنج پر خندہ زن ہوا کرتے تھے چھ فٹ گہرے گڑھے میں دفن کر دیئے گئے"۔

جو ٹیم حادثے کی تحقیقات کر رہی تھی، اس نے سائنسی تجزیے کے بعد حادثے کے امکانی اسباب کو ایک ایک کر کے رد کر دیا مثلاً:۔

۱- جہاز پر کوئی دھماکہ خیز مادہ نہیں تھا کیونکہ تباہ شدہ جہاز کا ملبہ دور دور تک پھیلا ہوا نہیں تھا۔

۲- جہاز کسی آتشی میزائل کا ہدف بھی نہیں بنا ورنہ اس کے ایلومینیم کے خول پر اس کا نشان ہوتا۔

۳- حادثہ آگ لگنے سے بھی نہیں ہوا کیونکہ امریکن ملٹری مشن کے سربراہ جنرل ولیم کے پوسٹ مارٹم سے پتہ چلا کہ وہ حادثہ کے نتیجے میں جلنے سے نہیں بلکہ اس سے پہلے وفات پا چکے تھے۔

۴- نہ ہی انجنوں کی خرابی سے یہ حادثہ رونما ہوا کیوں کہ تفتیش سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ طیارہ جس وقت زمین پر ٹکرایا اس کے انجن پوری رفتار سے چل رہے تھے۔

۵- ایندھن میں بھی کسی قسم کی آلودگی نہیں پائی گئی۔

۶- جن کَل پُرزوں کی مدد سے جہاز کا کپتان جہاز اڑاتا ہے یعنی کنٹرول' اس میں بھی تخریب کاری کا کوئی نشان نہیں ملا بلکہ اس پاک ون ہرکولیس طیارے میں تو کنٹرول کے تین سسٹم تھے اور تفتیشی ٹیم کی رائے میں تینوں سیٹ درست حالت میں تھے۔

اب صرف یہی امکان رہ گیا تھا کہ پائلٹ یا شاید سبھی مسافر یکایک بے ہوش ہو گئے تھے۔

تحقیقاتی ٹیم یہ نہیں بتلا سکی کہ یہ حادثہ آخر ہوا کیسے؟
لیکن اتنا تو سب جانتے ہیں کہ یہ حادثہ کیوں ہوا؟

☆ ☆ ☆

29

"مقتول" کی واپسی

کہتے ہیں کہ وزیراعظم پاکستان ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف ایک سیاسی مخالف کے قتل کے الزام میں قائم کیا گیا مقدمہ اور اعلیٰ عدالتی کارروائی درحقیقت ایک سازش تھی۔ خدا جانے یہ بات کہاں تک درست ہے لیکن یہ بھی یقیناً صحیح ہے کہ جمہوری ممالک میں اس قسم کے الزام کی صورت میں سزا تو درکنار مقدمہ بھی نہیں چلایا جاتا۔ مسٹر بھٹو کے خلاف پیش کردہ شہادتیں بالکل بودی اور انتہائی کمزور تھیں۔ لیکن پاکستان ان دنوں کوئی جمہوری ملک نہیں تھا۔ وہاں ایک مطلق العنان آمر کی حکومت تھی۔ بہرحال مسٹر بھٹو کا مقدمہ پیش ہوا۔ دیکھا جائے تو اس کے حق میں یہی دلیل کافی تھی (اگرچہ اس کا علی الاعلان اظہار ممکن نہ تھا) کہ اقتدار میں رہنے کے لئے مسٹر بھٹو کو قتل ایسا بھونڈا اور گھٹیا حربہ استعمال کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی البتہ اگر یہ واقعی ایک سازش تھی تو اس کے بناؤ سنگھار اور اس کی نوک پلک درست کرنے میں بڑی ہی ذہانت اور چابک دستی سے کام لیا گیا

تھا۔ عام مقدمے کی بجائے قتل کے مقدمے سے بین الاقوامی رائے عامہ تو بالکل مفلوج ہو کر رہ گئی تھی۔ سیاسی قسم کے ظلم و تشدد اور ایذا رسانیوں کے خلاف تو بہرحال احتجاج کیا جا سکتا تھا۔ لیکن قتل سے متعلق ایک عام عدالتی کارروائی کے خلاف ایک قاتل کے حق میں آواز بلند کرنا خواہ ایسے مقدمے کے سیاسی محرکات کتنے ہی ننگے کیوں نہ ہوں' کوئی آسان کام نہ تھا۔ آہستہ آہستہ وہ لوگ بھی سٹیج سے غائب ہو گئے جو موقع کے اصل گواہ تھے اور مسٹر بھٹو کے مبینہ جرائم کے رخ سے پردہ اٹھا سکتے تھے۔ بالآخر ہوا یہ کہ مسٹر بھٹو کو پھانسی دے دی گئی اور جنرل ضیاء کو اطمینان ہو گیا کہ بھٹو کو شہید بنائے بغیر اس نے اپنے سیاسی مخالفین کو کچل کر رکھ دیا ہے۔

کیا یہ اس قسم کی سوچی سمجھی سازش تو نہیں تھی یا اس سے ملتا جلتا کھیل تو نہیں تھا جو (حضرت) خلیفہ رابع کے خلاف کھیلا جانے والا تھا اور جو ضیاء کی اپنی غلطی کی وجہ سے اپنے مزعومہ انجام کو نہ پہنچ سکا اور آپ کھلے بندوں قانون کی خلاف ورزی کے بغیر پاکستان کی سرزمین کو خیرباد کہنے میں کامیاب ہو گئے۔

جنرل ضیاء اپنے زعم میں جماعت احمدیہ کو تباہ و برباد کرنے پر ادھار کھائے بیٹھا تھا۔ یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی۔ اس کے نزدیک (حضرت) امام جماعت احمدیہ ہی اس کے سب سے بڑے اور خطرناک دشمن تھے۔ وہ انہیں اپنی اولین فرصت میں موت کے گھاٹ اتارنا چاہتا تھا۔ چنانچہ ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت پہلے اس نے (حضرت) خلیفہ رابع کی کردار کشی کی باقاعدہ مہم کا آغاز کیا جو آہستہ آہستہ ظاہری رکھ رکھاؤ کی سرحدیں پھلانگتی ہوئی' بغض و عناد اور بدنیتی پر مبنی مضحکہ خیز حد تک بے معنی اور خلاف عقل الزامات تک جا پہنچی۔ آپ کے متعلق در و بام سے یہ ڈھنڈورا پیٹا جانے لگا کہ آپ ایک انتہائی خطرناک انسان

ہیں۔ بلکہ پاکستانیوں کے جان ومال کے لئے بھی حتیٰ کہ خود اسلام بھی ان کے ہاتھوں معرض خطر میں ہے۔ بے دریغ اور نہایت ڈھٹائی سے ہر چھوٹے سے چھوٹا اور بڑے سے بڑا جھوٹ بولا گیا۔ بعض احمدی حضرات کے نزدیک اس دروغ گوئی اور کذب بیانی کا مقصد یہ تھا کہ پاکستانی عوام کو اس قدر ذہنی غسل دیا جائے کہ وہ جھوٹ کو سچ سمجھ کر قبول کرلیں۔ اور جب جنرل ضیاء الحق (حضرت) خلیفہ رابع کے خلاف انتہائی سخت قدم اٹھائے تو سادہ لوح عوام یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہو جائیں کہ یہ سب کچھ ان کے ملک کے اور اسلام کے تحفظ اور فائدے کی خاطر کیا جارہا ہے۔ جنرل ضیاء کے پاس اس کی ہاں میں ہاں ملانے والے حاشیہ برداروں کی کمی نہیں تھی۔ بنیاد پرست ملاّ اور اخبارات چیخ چیخ کر احمدیوں کے خلاف اشتعال دلا رہے تھے اور مذہبی تشدد اور جنون کی آگ بھڑکانے کے لئے بالکل وہی حربے استعمال کئے جارہے تھے اور اسی طرح مذہب کو بیچا جارہا تھا جس طرح مغرب کے بعض اخبارات اپنی اشاعت بڑھانے کے لئے فاشی کو بیچا کرتے ہیں۔

خلافت رابعہ کے انتخاب کے صرف چودہ دن بعد ہی کذب وافترا کی اس طوفانی مہم کا آغاز ہو گیا تھا جب مشہور اردو روزنامہ نوائے وقت نے یہ سوال پوچھا تھا کہ کیا ربوہ کے قصر خلافت کے تہ خانوں میں جوہری پلانٹ تیار کیا جارہا ہے! یہ ایک بڑا ہی مضحکہ خیز اور بیہودہ سوال تھا لیکن مثل مشہور ہے کہ جتنا بڑا جھوٹ ہو گا اتنی ہی آسانی سے کچھ لوگ اسے مان بھی لیں گے۔

ایک اور ہفت روزہ لنگر لنگوٹے کس کر اکھاڑے میں اتر آیا۔ اس نے اپنی دکان سجانے کے لئے ایک اور جھوٹ گھڑا اور بڑے طمطراق سے اعلان کیا کہ جب سے "مرزا طاہر احمد" خلیفہ بنے ہیں جماعت احمدیہ کی تبلیغی مساعی میں سرگرمی ہی نہیں آئی بلکہ تشدد اور تخریب کاری کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا ہے۔

بنیاد پرست ملاؤں کو تو خوب پتہ تھا کہ انہیں جنرل ضیاء کی پشت پناہی حاصل ہے بلکہ اسی کی شہ پر انہوں نے بیک زبان جماعت کے خلاف زہر افشانیوں کا ملک گیر سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ اشتعال انگیزیوں کی انتہا ہو گئی۔ کذب وافترا اور الزام تراشیوں کا ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ اس طوفان بد تمیزی میں عدالتی کارروائی کا کسے خوف تھا اور اگر کوئی احمدی انصاف کا دروازہ کھٹکھٹاتا بھی تو کس امید پر۔ جنرل ضیاء کے عہد حکومت میں کس عدالت کی مجال تھی اور کس میں اتنا دم خم تھا کہ مظلوم اور بے زبان احمدیوں کے حق میں انصاف اور سچائی کا کلمہ زبان پر لاتا۔

پھر یوں ہوا کہ سترہ فروری ۱۹۸۳ء کو ایک شخص اسلم قریشی، ایک مستری جو لفٹ اپریٹر تھا اچانک غائب ہو گیا اور جاتے وقت اپنے اہل خانہ سے کہہ گیا کہ وہ ساتھ کے گاؤں میں احمدیوں کے خلاف تقریر کرنے کے لئے جا رہا ہے۔ دو دن گذر گئے لیکن اسلم قریشی واپس نہ آیا۔ اس کے اہل خانہ کی طرف سے پولیس میں جو رپورٹ درج کروائی گئی وہ یہ تھی کہ ہمیں اندیشہ ہے کہ احمدیوں نے اسے اغوا کر کے قتل کر دیا ہے۔ وجہ اس الزام کی یہ تھی کہ اسلم قریشی کو احمدیوں سے خدا واسطے کا بیر تھا۔ تھا تو وہ لفٹ (LIFT) پر کام کرنے والا ایک عام اپریٹر لیکن جماعت احمدیہ سے عناد کی وجہ سے ملک بھر میں بدنام تھا یا یوں کہئے کہ مشہور تھا۔ کچھ سال قبل لفٹ پر ڈیوٹی کے دوران اس نے صدر پاکستان کے اقتصادی مشیر اور (حضرت) خلیفہ رابع کے عم زاد جناب ایم۔ ایم۔ احمد پر قاتلانہ حملہ بھی کیا تھا۔ اس جرم کی پاداش میں اسے چودہ سال قید بامشقت کی سزا بھی ہوئی تھی۔ یہ اور بات ہے کہ تین ہی سال بعد اسے پُر اسرار حالت میں رہا بھی کر دیا گیا تھا۔

اگرچہ وہ ایک معمولی لفٹ اپریٹر تھا اور یہی اس کی پہچان بھی تھی لیکن

اخبارات نے اب اسے مولانا کے خطاب سے نواز دیا تھا اور وہ اسلم قریشی کی بجائے مولانا اسلم قریشی کہلانے لگا تھا۔ یعنی راتوں رات وہ عالم دین بھی بن گیا تھا۔ چنانچہ اس کی مبینہ گمشدگی کی خبر کو خوب خوب اچھالا گیا۔ ملّاؤں اور اخبارات نے اسلم قریشی کے مبینہ قتل اور قاتل کے بارے میں خود ساختہ تفاصیل کو نام بنام مزے لے لے کر بیان کرنا شروع کر دیا۔ اس فرضی قتل کی وسیع پیمانے پر تشہیر کی گئی اور یہ الزام بار بار دہرایا گیا کہ "مولانا" اسلم قریشی کو ربوہ میں قصر خلافت کے تہہ خانے میں قتل کیا گیا ہے۔ اس کے ہاتھ پاؤں کاٹ دیئے گئے ہیں اور اس کا جوڑ جوڑ توڑ ڈالا گیا ہے۔ نیز یہ کہ یہ سب (حضرت) خلیفہ رابع کی زیر نگرانی ہوا ہے اور وہی اس قتل کے ذمہ دار ہیں۔

ہفت روزہ لولاک نے لکھا کہ:-

"جب سے مرزا طاہر احمد جماعت احمدیہ کے سربراہ منتخب ہوئے ہیں جماعت کی تبلیغی سرگرمیاں تیز ہو گئی ہیں اور ان میں تشدد اور جارحیت کا پہلو نمایاں ہو کر سامنے آ گیا ہے۔ ایک غیر احمدی استاد کو احمدی لڑکوں کے ہاتھوں مارا پیٹا گیا ہے ایک مسجد مسمار کر دی گئی ہے اور اسلم قریشی کو نہ صرف اغوا کیا گیا ہے بلکہ امکان ہے کہ اسے احمدیوں نے قتل کر دیا ہے؟"

(لولاک۔ فیصل آباد۔ شمارہ مارچ ۱۹۸۳ء)

بے بنیاد الزامات اور منافرت کی اس مہم کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ احمدیوں کے خلاف عام ہنگامے شروع ہو گئے۔ احمدیوں کے گھر، دکانیں اور مسجدیں لوٹ لی گئیں۔ انہیں ہر طرح کے تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ انہیں مارا پیٹا گیا۔ کچھ احمدی زخمی ہوئے کچھ ہلاک کر دیئے گئے۔ ملاؤں نے گلے پھاڑ پھاڑ کر احمدیوں کے خلاف جی بھر کے زہر اگلا۔ سادہ لوح عوام کو احمدیوں کے قتل عام پر اکسایا۔ انہیں واجب

القتل قرار دیا۔ بتدریج ان مطالبات اور اس کذب بیانی میں شدت آتی چلی گئی اور یہ مطالبہ زور پکڑتا چلا گیا کہ پولیس ربوہ پر چھاپہ مار کر مولانا اسلم قریشی کو برآمد کرے۔ (حضرت) خلیفہ رابع کو فوری طور پر گرفتار کر لیا جائے اور ان پر اتنا تشدد کیا جائے اور اتنی ایذائیں پہنچائی جائیں کہ وہ اقبال جرم کرنے پر مجبور ہو جائیں۔ ایک مشہور و معروف جماعت دشمن مولوی نے کہا کہ میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں۔ (حضرت) خلیفہ رابع ہی مولانا اسلم قریشی کے قتل عمد کے مرتکب ہوئے ہیں اور مجھے ان کے اس جرم میں ملوث ہونے پر اتنا یقین ہے کہ اگر میرا الزام غلط ثابت ہوا تو میں کسی بلند عمارت سے چھلانگ لگانے کے لئے تیار ہوں۔ غرض کہ جھوٹ اور تشدد کا بازار گرم ہو گیا یہاں تک کہ معصوم بچوں تک کو اس کارخیر میں ملوث کرنے سے بھی دریغ نہ کیا گیا۔ بچوں کے لئے تصویری اور مزاحیہ کتب میں اسلم قریشی کو اس حالت میں دکھایا گیا کہ وہ پابہ زنجیر احمدیوں کی قید میں ہے اور ایک چھاپہ مار مسلح پارٹی دروازے توڑ کر اسے رہا کرانے کے لئے اندر داخل ہو رہی ہے۔

جنرل ضیاء نے تعصب اور مذہبی جنون اور منافرت کی آگ کو ہوا دینے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔ ہر حربہ آزمایا اور پوری کوشش کی کہ اسلم قریشی کی مبینہ گمشدگی کا مسئلہ ٹھنڈا نہ ہونے پائے اور روزناموں کی شہ سرخیوں میں تسلسل کے ساتھ اس کا ذکر ہوتا رہے۔ اس نے اسلم قریشی کے اہل خانہ کو دس ہزار روپے کا چیک بھی بھجوا دیا۔ ساتھ خط میں لکھا کہ فکر نہ کریں مولانا کا معاملہ بدستور میری توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے۔ علاوہ ازیں اس نے اسلم قریشی کے کیس کی مکمل تیاری کے لئے پولیس کی ایک خصوصی تفتیشی ٹیم بھی ترتیب دی۔

یہ سارا کاروبار پُراسرار اور تعجب انگیز ہی نہیں معمول کی قانونی کارروائی

سے ہٹ ہٹ کر بھی تھا۔ عام طور پر ایسا ہوا نہیں کرتا۔ پاکستان کیا دنیا بھر کے ممالک میں ہر ماہ درجنوں لوگ چپکے سے لاپتہ ہو جاتے ہیں اور کسی کو بتانا تک ضروری نہیں سمجھتے کہ وہ کہاں ہیں اور کدھر جا رہے ہیں۔ صدران مملکت یوں بے تاب ہو کر ان کے لواحقین کی امداد کے لئے نہ تو بھاگے بھاگے پھرتے ہیں اور نہ ہی ان کی گمشدگی کی تفتیش کے لئے پولیس کی سپیشل ٹیمیں تشکیل دیا کرتے ہیں۔ بہرحال جنرل ضیاء الحق کی حرکات سے اتنا تو اندھوں کو بھی نظر آ رہا تھا کہ اب یہ ڈرامہ اختتام کو پہنچنے والا ہے اور جماعت احمدیہ کی تباہی و بربادی کو یقینی بنانے کے لئے ایک آخری اور مہلک وار کرنے کا وقت آن پہنچا ہے۔ یہاں تک کہ وہ جیل بھی تیار کر لی گئی تھی جس میں معروف احمدیوں کو رکھا جانا مقصود تھا۔ سرکاری کاغذات میں اسے فوجی کیمپ کا نام دیا گیا تھا۔

ایک معروف احمدی نے اس سازش کے مَالَہٗ وَمَاعَلَیْہ کا تجزیہ یوں کیا:

جنرل ضیاء کا منصوبہ یہ تھا کہ سب سے پہلے صدارتی فرمان کے ذریعے احمدیوں کا یہ حق ہی چھین لیا جائے گا کہ وہ اپنے آپ کو مسلمان کہہ سکیں۔ ان کی اذانیں بند کر دی جائیں گی۔ وہ مسجد کو مسجد نہیں کہہ سکیں گے۔ نہ اعلانیہ عبادت کر سکیں گے نہ السلام علیکم کہہ سکیں گے۔ حتیٰ کہ ان کا بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ لکھنا اور پڑھنا قانوناً قابل دست اندازی پولیس جرم قرار پا جائے گا۔ جواباً صدر پاکستان اپنے پالتو ملّاؤں کے ذریعے عوام کو سڑکوں پر لے آئیں گے اور ایک سوچی سمجھی سکیم کے مطابق لوٹ مار اور قتل و غارت کا بازار گرم کر دیا جائے گا۔ بالآخر امن و امان بحال کرنے کے لئے فوج اختیارات سنبھال لے گی۔ ربوہ کا محاصرہ کر لیا جائے گا اور سربر آوردہ احمدیوں کو پہلے سے تیار کردہ کیمپ میں نظربند کر دیا جائے گا۔ (حضرت) خلیفہ (رابع) کو گرفتار کر لیا جائے گا اور قتل عمد کے زیر

الزام آپ کا چالان کردیا جائے گا اور پھر پہلے سے تیار کردہ ثبوت بھی چھو منتر سے منظر عام پر آجائے گا۔ رسمی عدالتی کارروائی کے بعد فرد جرم عاید کردی جائے گی اور حسب سابق ذوالفقار علی بھٹو کی طرح جرم ثابت بھی کردیا جائے گا۔ دو ایک سال کے بعد جب بین الاقوامی رائے کی توجہ ہٹ چکی ہو گی تو جنرل ضیاء الحق ایک صبح اچانک حکم صادر کردے گا کہ آپ کو پھانسی دے دی جائے۔ یہی اس کا سکہ بند طریق واردات تھا جسے وہ پہلے بھی کامیابی سے بھٹو صاحب پر آزما چکا تھا۔ اس کے بعد نئے خلیفہ کے انتخاب کو حکماً روک دیا جائے گا اور جہاں تک اس کے منصوبے کا تعلق ہے جماعت احمدیہ کا بحیثیت جماعت خاتمہ ہو جائے گا۔

اس سازش کی ناکامی کی تین وجوہات تھیں۔

اول یہ کہ (حضرت) امام جماعت احمدیہ اس ظلم و ستم اور اشتعال کے باوجود حیرت انگیز طور پر پُرسکون رہے۔ آپ نے ضیاء الحق کے خلاف توقع جماعت کو تلقین فرمائی کہ وہ صبر سے کام لیں اور مزاحمت سے گریز کریں اور سڑکوں پر آنے کی بجائے اپنی فریاد سب سے بڑی اور آخری عدالت یعنی خدا (تعالیٰ) کی عدالت میں لے جائیں۔

دوم یہ کہ جنرل ضیاء الحق جماعت کے خلاف مخالفت کی آگ بھڑکانے میں کچھ زیادہ ہی مصروف رہا اور اس انتظار میں رہا کہ عوام کے غیض و غضب کا پارہ چڑھ جائے اور ہجوم مشتعل ہو کر اتنے بے قابو ہو جائیں کہ چشم زدن میں ایک ادنیٰ سے اشارے سے احمدیوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹ کر رکھ دیا جائے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ (حضرت) خلیفہ رابع پر اقدام قتل کا الزام لگا کر آپ کے خلاف پوری سرعت سے اور بروقت کارروائی نہ کرسکا۔ اگرچہ یہ بھی صحیح ہے کہ اس نے نپے تلے پروگرام کے مطابق جس دن آپ کی گرفتاری عمل میں لائی جانی

تھی، بالکل اسی دن ضیاء الحق کا شکار ہاتھ سے نکل گیا اور وہ ہاتھ ملتا رہ گیا اور (حضرت) خلیفہ رابع اسی صبح سرزمین پاکستان سے ہجرت کر گئے۔ اگر آپ ایک دن کے لئے رک جاتے اور آپ پر فوجداری جرم کے الزام میں کارروائی شروع کر دی جاتی تو اپنی پوری بریت کے بغیر خواہ اس کے نتائج کچھ ہی کیوں نہ ہوتے آپ پاکستان سے باہر جانے پر کبھی آمادہ نہ ہوتے۔

ایک تیسری اور اہم ترین وجہ یہ بھی تھی جس نے ضیاء الحق کے کئے کرائے پر پانی پھیر کر رکھ دیا اور اس کی سوچی سمجھی سکیم دھری کی دھری رہ گئی۔ یہ خدا (تعالیٰ) کی منصوبہ بندی ہی تھی جس کے مقابلے پر سارے انسانی منصوبے خاک میں مل گئے۔ یعنی اس نے اپنے ہاتھ سے (حضرت) خلیفہ رابع کی حفاظت فرمائی۔ یہ الٰہی تصرف نہیں تو اور کیا تھا کہ ضیاء الحق نے اپنے قلم سے عین اس وقت اتنی فاش اور مؤثر غلطی کی کہ جب آپ ہوائی جہاز پر سوار ہونے والے تھے اور آپ کے خلاف اس حکم نامے پر دستخط کئے جا رہے تھے جس کی رو سے آپ کو سرزمین پاکستان چھوڑنے کی اجازت منسوخ اور آپ کے باہر جانے کا ہر ممکنہ راستہ بند کیا جا رہا تھا لیکن ہوا یہ کہ آپ کھلے بندوں جہاز پر سوار ہوئے۔ کسے علم نہیں تھا کہ آپ ہی خلیفہ رابع ہیں۔ آپ کا پاسپورٹ پکار پکار کر کہہ رہا تھا کہ آپ ہی خلیفہ رابع ہیں۔ لیکن عین وقت پر ضیاء الحق کی آنکھوں پر پردہ پڑ گیا اور اس نے بقائمی ہوش و حواس اپنے ہاتھ سے اور اپنے قلم سے حکم نامے پر مرزا طاہر احمد کی بجائے مرزا ناصر احمد (مرحوم و مغفور) کا نام لکھ دیا اور (حضرت) مرزا طاہر احمد اللہ کی تائید اور نصرت کے ساتھ بلا روک ٹوک قانون کے دائرے میں رہتے ہوئے آرام اور سکون کے ساتھ جہاز پر سوار ہو گئے اور ایک آمر کے سارے منصوبے دھرے کے دھرے رہ گئے اور حکومت

کی ساری مشینری بے بس ہو گئی اور نامراد ہو کر دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔

ادھر اسلم قریشی جو اَب مولانا اور مذہبی راہنما بن چکا تھا اور جس کی گمشدگی کو (حضرت) خلیفہ رابع کے کھاتے میں ڈالا جا رہا تھا۔ پانچ سال کی طویل گمشدگی کے بعد جولائی ۱۹۸۸ء میں اچانک نمودار ہو گیا۔ اس کی واپسی کی کہانی بھی بڑی پُراسرار اور معنی خیز تھی۔ چنانچہ مبینہ مقتول مولانا کی زندہ اور صحیح سلامت واپسی کے بعد پہلے تو ایک پریس کانفرنس کا ڈرامہ کھیلا گیا جس میں انسپکٹر جنرل پولیس پنجاب نے اپنے دست مبارک سے اسلم قریشی کی نقاب کشائی کی اور اہل پاکستان نے حیرت زدہ آنکھوں سے دیکھا کہ دیرینہ مقتول آنجہانی اسلم قریشی زندہ سلامت موجود ہیں۔ اس نے کانفرنس میں موجود صحافیوں کے سامنے جو بیان دیا یا جو بیان اس سے دلایا گیا وہ یہ تھا۔

> "میں نے لاپتہ ہونے کا فیصلہ بعض "ذاتی" مجبوریوں کی وجہ سے کیا تھا۔ مجھے مالی اور خانگی پریشانیاں لاحق تھیں اور جماعت احمدیہ سے متعلق لٹریچر کے مطالعے سے بھی میں خاصا پریشان تھا۔ اس لئے میں نے فیصلہ کیا کہ مجھے کہیں چلے جانا چاہئے چنانچہ میں ایران چلا گیا۔ جاتے ہی فوج میں بھرتی ہو کر ایران عراق جنگ کے محاذ پر پہنچ کر لڑائی میں شامل ہو گیا۔ تاہم میں نے اپنے اہل خانہ کو اطلاع دے دی تھی کہ میں کہاں ہوں اور کیا کر رہا ہوں"۔

اسلم قریشی کے بیٹے نے جو پریس کانفرنس میں موجود تھا، تصدیق کی کہ ہمیں اپنے والد کی طرف سے خط موصول ہو گیا تھا لیکن ہمیں یقین نہیں آتا تھا کہ یہ خط ان کا ہے۔ اس لئے ہم نے خاموشی کو قرین مصلحت خیال کیا۔ لیکن زبان خلق کچھ

اور کہہ رہی تھی۔ پرائیویٹ مجالس میں چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں کہ اسلم قریشی کی برآمدگی اس لئے ہوئی ہے کہ اب اس کے لاپتہ رہنے کی ضرورت نہیں رہی تھی اور (حضرت) خلیفہ رابع ضیاء الحق کی گرفت سے بچ کر نکل گئے تھے۔ مقتول اسلم قریشی کی زندہ سلامت واپسی سے وہ لوگ اور اخبارات جو گلا پھاڑ پھاڑ کر اسلم قریشی کے قتل کا اعلان اور (حضرت) خلیفہ رابع کی گرفتاری کے مطالبات کیا کرتے تھے، شرم سے پانی پانی ہو گئے۔ ان میں وہ لوگ بھی شامل تھے جن کا دین ایمان ہی یہ تھا اور وہ اس کا بار بار اعلان بھی کرتے رہے تھے کہ اسلم قریشی کو (حضرت) خلیفہ رابع ہی نے قتل کروایا ہے اور اگر ان کا دعویٰ غلط ثابت ہوا تو وہ بلند و بالا عمارتوں سے چھلانگ لگا دیں گے۔ اب یہ لوگ یوں شرمندہ اور مہر بلب بیٹھے تھے، جیسے انہیں کوئی سانپ سونگھ گیا ہو۔ بلندیوں سے چھلانگ لگانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ مارے شرم کے نہ جانے کس طرح ابھی سطح زمین ہی پر رینگ رہے تھے۔ اخبارات کا بھی یہی حال تھا۔ زبانیں گنگ ہو کر رہ گئی تھیں۔ روزنامہ نیشن نے لکھا تو ہکلاتے ہوئے، بڑی سراسیمگی کے عالم میں اتنا لکھا کہ:۔

> "مولانا اسلم قریشی کو ملکی قوانین کی خلاف ورزی کرتے ہوئے پاسپورٹ کے بغیر پاکستان کی سرحد کو عبور نہیں کرنا چاہئے تھا"۔

یہ الفاظ ایک ایسے جرم کی پشت پر ہلکی سی تھپکی سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے تھے۔ جو نہ صرف اقبال جرم کر چکا تھا بلکہ اعلانیہ تسلیم بھی کر چکا تھا اور خوب جانتا تھا کہ اس کی گم شدگی کی وجہ سے سارا ملک خوفناک فسادات کی لپیٹ میں آ چکا تھا۔ پولیس نے فیصلہ کیا کہ اب اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں کہ اسلم قریشی

کو چند دنوں کے لئے پبلک کے سامنے آنے سے روک دیا جائے تا کہ اس کی واپسی کے نتیجے میں ہونے والا شور کچھ ٹھنڈا پڑ جائے۔ چنانچہ اسے نقض امن کے الزام میں گرفتار کر کے سات دن کے ریمانڈ پر حوالات میں بھیج دیا گیا۔ ایک ہفتے کے بعد وہی اسلم قریشی جب دوبارہ عدالت میں پیش ہوا تو اس مختصر عرصے میں اس کا بیان بدل چکا تھا۔ اب کی بار اس نے انکشاف کیا کہ۔

"مجھے احمدیوں نے اغوا کیا تھا اور میں ربوہ میں زیر حراست تھا۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ وہاں تہہ خانے میں بندوقوں کے انبار لگے ہوئے ہیں!"

اپنی خفت مٹانے کے لئے کٹھ ملاؤں کا اب بھی اصرار تھا کہ احمدیوں نے نہ صرف اسلم قریشی پر جسمانی تشدد کیا ہے بلکہ یہ سب کچھ پولیس کی ملی بھگت سے ممکن ہوا ہے۔ لیکن عام آدمی اس جھوٹ کے کاروبار سے اکتا چکا تھا اور وہ چاہتا تھا کہ اس مذاق کو ختم کر دیا جائے۔ بایں ہمہ اسلم قریشی کی جماعت دشمنی کا یہ آخری اظہار نہیں تھا۔ جلد ہی اس نے ایک مشہور و معروف احمدی سینیئر وکیل پر عین احاطہ عدالت میں پولیس کی موجودگی میں قاتلانہ حملہ کر کے اسے شدید زخمی کر دیا۔

نتیجتاً مولانا واپس جیل میں تشریف لے گئے۔

پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا۔

☆ ☆ ☆

30

ہومیو پیتھی

لندن مسجد سے ملحقہ (حضرت) خلیفہ رابع کے پرائیویٹ سیکرٹری کے دفتر میں دو فٹ گہری اور آٹھ فٹ لمبی ایک الماری ہے۔ کبھی اس میں سٹیشنری اور دفتر کی دیگر متفرقات بھری رہتی تھیں۔ آج اس میں ادویات کی سینکڑوں شیشیاں قرینے سے رکھی ہوئی ہیں۔ یہیں سے (حضرت) خلیفہ رابع کی تجویز کردہ ہومیو پیتھک دوائیں دنیا بھر کے مریضوں کے لئے بھجوائی جاتی ہیں۔

روزانہ سینکڑوں خطوط آتے ہیں۔ لوگ بذریعہ ڈاک اپنے اپنے مرض کی علامتیں لکھ کر دوائی کے لئے درخواست کرتے ہیں۔ ان میں اکثریت احمدیوں کی ہوتی ہے لیکن کچھ غیر از جماعت لوگ بھی آپ کی شہرت سن کر آپ کی خدمت میں لکھتے رہتے ہیں کہ ہمارے لئے بھی نسخہ تجویز کیا جائے۔

آپ مفت علاج کرتے ہیں اور ہومیو پیتھک طریقہ علاج کے قائل ہیں اور چاہتے ہیں کہ ہومیو پیتھی کے بارے میں لوگوں کی معلومات میں اضافہ ہو اور

زیادہ سے زیادہ لوگ اس طریقہ علاج سے فائدہ اٹھائیں۔ دفتر کی فائلیں ایسے خطوط سے بھری پڑی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ بے شمار لوگ آپ کے علاج سے صحت یاب ہوئے یا کم از کم ان کی بیماری میں افاقہ ہوا۔

ان کا ہومیوپیتھی کا شوق اتنا پرانا نہیں ہے۔ ہاں یہ صحیح ہے کہ طب آپ کا خاندانی شوق ہے۔ آپ کے پڑدادا (حضرت) مرزا غلام مرتضیٰ ایک حاذق طبیب تھے۔ قادیان اور ملحقہ دیہات کے لوگ بیمار ہوتے تو وہ آپ ہی کے پاس علاج کے لئے حاضر ہوتے۔ ان دنوں دور دور کوئی ڈاکٹر نہیں ہوتا تھا۔ پھر آپ قادیان کے رئیس بھی تو تھے۔ مصیبت کے وقت لوگ مدد کے لئے آپ ہی کے پاس آتے۔ آپ مفت علاج کرتے تھے۔ حضرت مرزا صاحب نے اپنے بیٹے مرزا غلام احمد کو جو بعد میں (حضرت) مسیح موعود (علیہ السلام) ہوئے مروجہ طب کی پوری تعلیم دی۔

آپ بھی ایک کامیاب معالج تھے اور بحیثیت طبیب بھی بڑی شہرت کے مالک تھے۔ آپ کے عظیم فرزند (حضرت) خلیفۃ المسیح الثانیؓ بھی طب میں بہت دلچسپی رکھتے تھے۔ آپ نے ایلوپیتھی اور دیسی طب دونوں طریقہ ہائے علاج کا مطالعہ کیا ہوا تھا۔ جڑی بوٹیوں اور ان کے طبی خواص سے بھی دلچسپی تھی اور جب برصغیر میں ہومیوپیتھی متعارف ہوئی تو آپ نے اسے بھی خوش آمدید کہا۔

چودہ سال کی عمر تک (حضرت) خلیفۃ المسیح الرابع ہومیوپیتھی کو کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے چنانچہ فرماتے ہیں:۔

> ”سکول کے زمانے میں میں نے جو سائنس پڑھی تھی اس کی وجہ سے اتنا تو میں بھی جانتا تھا کہ ہومیوپیتھک ادویات میں دوائی کی مقدار نہ ہونے کے برابر ہوتی ہے لیکن دل نہیں مانتا تھا کہ دوائی اس موہوم شکل میں مؤثر بھی ہوسکتی

ہے۔ مثال کے طور پر کسی دوائی کا ایک قطرہ بالفاظ دیگر ایک اکائی لیں اور اس کی داہنی طرف ساٹھ سفر لگادیں اب اس نئے آمیزے میں سے ایک قطرہ لیں۔ یہ ہومیوپیتھک لحاظ سے دوائی کی ۳۰ ڈگری کی پوٹینسی یا طاقت ہوگی۔ دوائی کی مقدار توبس اتنی ہوگی جیسے ریت کے ٹیلے میں ایک ذرہ۔ باقی سب ملاوٹ۔ میں سمجھتا تھا کہ اتنی ملاوٹ کے بعد دوائی میں کتنی جان رہ سکتی ہے۔ تاثیر تو بالکل خارج ازامکان نظر آتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے شروع میں ہومیوپیتھی کی طرف چنداں توجہ نہیں دی۔

لیکن ہم بیمار پڑے تو (حضرت) والد محترم ہمارے لئے ایلوپیتھک اور ہومیوپیتھک دونوں قسم کی ادویہ تجویز فرمایا کرتے تھے۔ جب ہم صحت یاب ہوجاتے تو نہیں کہہ سکتے تھے کہ فائدہ کس دوا سے ہوا۔

بچپن میں مجھے شدید قسم کا سردرد ہوا کرتا تھا۔ اسپرین کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔ اس کی پانچ چھ ٹکیاں کھانے پر بھی درد کم نہیں ہوتا تھا۔ انتہائی سخت قسم کی صرف ایک دوائی فائدہ کرتی تھی جسے والد محترم کلکتے سے منگایا کرتے تھے۔

ایک دفعہ مجھ پر سردرد کا خوفناک حملہ ہوا۔ میں بستر پر دراز تھا اور درد کے مارے سخت بے چین تھا۔ والدہ محترمہ بھی میرے پاس موجود تھیں اور بے بسی سے میری حالت

دار کو دیکھ رہی تھیں۔ انہوں نے خادمہ کو (حضرت) والد صاحب کی خدمت میں وہی کلکتے والی درد کش دوائی لانے کے لئے بھیجا۔ جواب ملا کہ وہ دوائی تو ختم ہو چکی ہے اس کی جگہ ہومیو پیتھک دوائی بھجوا رہا ہوں۔ میں نے سوچا کہ اس سے کیا ہو گا لیکن تکلیف شدید تھی۔ والدہ محترمہ دوائی چمچے میں لئے منتظر تھیں۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ بادلِ ناخواستہ دوائی نگل لی۔

مہرمادری سے مجبور (حضرت) والدہ صاحبہ میرے پاس تشریف فرما تھیں۔ پوچھنے لگیں۔ بتاؤ اب سر درد کا کیا حال ہے۔ میں جواب دینے لگا تو کیا دیکھتا ہوں کہ سر درد تو ختم ہو چکا ہے۔ یوں لگا جیسے ابھی ہوا اور ابھی غائب بھی ہو گیا ہو۔

صحت یاب ہونے پر میں نے مسئلہ پر غور کرنا شروع کیا۔ اب یہ تو ظاہر ہے کہ مشاہدہ کو اولیت حاصل ہے۔ نظریات بعد میں قائم ہوتے ہیں۔ مشاہدہ نظریات کا تابع نہیں ہوتا بلکہ نظریہ مشاہدہ پر مبنی ہوتا ہے۔ آپ کو یہ حق حاصل نہیں کہ نظریے کی خاطر مشاہدے کو توڑ مروڑ کر اسے نظریہ کے مطابق بنائیں۔ ہومیو پیتھی سے متعلق میرے نظریہ نے کہا۔ یہ ناممکن ہے۔ مشاہدہ بولا۔ نہ صرف ممکن بلکہ یہ تو ہو بھی چکا ہے۔ یہ ایسے ہی تھا جیسے ہم کہتے ہیں کہ کیا اللہ (تعالیٰ) ہے یا نہیں ہے۔ جو لوگ اپنے تجربے اور اللہ (تعالیٰ) سے تعلق کی بنا پر علیٰ وجہ البصیرت ہستی باری تعالیٰ پر یقین رکھتے ہیں۔ وہ جانتے

ہیں کہ خدا (تعالیٰ) ہے۔ پھر انہیں منطقی اور نظری دلائل سے کیسے قائل کیا جا سکتا ہے کہ ان کا عقیدہ غلط ہے۔

حقائق کو مت جھٹلائیں۔ انہیں قبول کریں۔ انہیں توڑ مروڑ کر کسی نظریہ کے مطابق بنانے کی کوشش نہ کریں۔ یہی میرا اصل الاصول ہے۔ اس پر میں شروع سے آج تک سختی سے قائم ہوں چنانچہ اس خوشگوار تجربے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ ہومیوپیتھی میں بھی کچھ نہ کچھ خوبی یقیناً موجود ہے۔

کچھ عرصہ بعد مجھے شدید قسم کا زکام ہو گیا۔ جب عام علاج سے کوئی فائدہ نہ ہوا تو میں نے (حضرت) والد صاحب سے دوائی کے لئے درخواست کی۔ آپ نے پہلے تو کچھ سوالات کئے پھر ایک ہومیوپیتھک دوائی تجویز کی جس کے استعمال سے مجھے اسی دن آرام آگیا۔ (حضرت) والد صاحب ان دنوں سخت بیمار تھے۔ اس لئے ان سے باقاعدہ درساً ہومیوپیتھی سیکھنے کا موقع تو نہیں تھا البتہ ماضی میں اس موضوع پر کھل کر گفتگو ہوتی رہی تھی۔ اب میں نے اپنے طور پر مطالعہ شروع کر دیا۔ مجھے ان کی لائبریری تک رسائی حاصل تھی چنانچہ میں نے ہومیوپیتھی سے متعلق سب کتابیں پڑھ ڈالیں اور جب میں نے اپنی ذاتی لائبریری کے لئے کتب اکٹھی کرنی شروع کیں تو یہ کتب بھی آہستہ آہستہ میری لائبریری کا حصہ بنتی چلی گئیں اور ایک بار میرے پاس آکر انہیں پھر واپس جانا نصیب نہ

ہوا۔ ویسے بھی ان کا چاہنے والا میرے سوا کوئی اور تھا بھی نہیں۔

بتدریج میرے علم میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ بالآخر میں نے ایلوپیتھی کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ دیا۔ ان دنوں مجھے شدید قسم کا ملیریا بخار رہا کرتا تھا۔ علاج کے طور پر ایلوپیتھک ادویہ ہی استعمال ہوتی تھیں۔ بخار سے تو عارضی افاقہ ہو جاتا تھا لیکن بعد میں ان دواؤں کا ردعمل بڑا خوفناک ہوا کرتا تھا۔ تین چار دن تو بڑے ہی کرب میں گذرتے تھے۔ ہاتھ متورم ہو جاتے اور یوں محسوس ہوتا جیسے میرے اندر خارش ہو رہی ہو۔ جی چاہتا تھا کہ اپنے آپ کو نوچ ڈالوں۔ میرے لئے یہ انتخاب کرنا مشکل ہو گیا تھا کہ دونوں میں سے زیادہ تکلیف دہ ملیریا ہے یا دوائی کا ردعمل۔ چاروناچار میں نے فیصلہ کیا کہ اب ہومیوپیتھک علاج کو آزماؤں۔ اس میں مجھے بار بار ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ جب دیکھتا کہ ہومیوپیتھک دوائی سے افاقہ نہیں ہو رہا تو ایلوپیتھک علاج کا تلخ گھونٹ پینے پر آمادہ ہو جاتا۔ یہ گومگو کا عمل دو سال تک جاری رہا یہاں تک کہ بالآخر ہومیوپیتھی کا ایک کامیاب نسخہ تجویز کرنے کے قابل ہو گیا۔ وہ دن اور آج کا دن جب بھی مجھے ملیریا کی شکایت ہوتی ہے یہی نسخہ استعمال کرتا ہوں۔ خدا تعالیٰ کے فضل سے ہمیشہ فائدہ ہوتا ہے۔ اس کے بعد میں نے اپنے بچوں اور دوسرے لوگوں کا علاج شروع کر دیا۔ یہ بڑی ذمہ داری کا کام

تھا- میں نے انتہائی توجہ اور سرگرمی سے مطالعہ جاری رکھا- کبھی کبھی ساری ساری رات آنکھوں میں کٹ جاتی اور میں بیٹھا سوچا کرتا کہ جس مریض کو دیکھا تھا وہ کل آئے گا تو اس کے لئے کونسی دوائی تجویز کرنی ہوگی-

اب تو یہ حال ہے کہ مریض کو دیکھتے ہی فیصلہ کرلیتا ہوں کہ اس کے لئے کونسی دوائی مناسب رہے گی- یہ کیفیت راتوں رات پیدا نہیں ہوئی- یہ چالیس سال پر محیط لمبے تجربے اور مطالعے کا نتیجہ ہے- اللہ کے فضل سے اب میرا تجربہ وسیع ہو چکا ہے-

لیکن یہ اور بات ہے کہ مریض سامنے موجود نہ ہو اور صرف خط کے ذریعے مرض کی تفاصیل بتائی جائیں- اس قسم کے خط دنیا کے کونے کونے سے آتے ہیں- ڈاکٹر حضرات بھی مجھ سے ذاتی طور پر ان مریضوں کے متعلق جنہیں وہ لاعلاج قرار دے چکے ہوں' مشورہ کرتے رہتے ہیں کیونکہ انہوں نے سن رکھا ہے کہ میں نے ماضی میں بڑے کامیاب علاج کئے ہیں-

ایسے مریض جن کے مرض کو مہلک قرار دیا جا چکا تھا اور جن کے بچنے کی کوئی امید نہیں رہی تھی' خدا تعالیٰ کے فضل سے آج بھی زندہ ہیں- میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں تعصب سے الگ رہ کر حقائق کی بنا پر اپنی رائے قائم کرنی چاہئے- ہومیوپیتھی کے بارے میں بھی حقائق اور شواہد کو پیش نظر

رکھ کر فیصلہ کرنا چاہئے ہمارے اپنے دفتر میں ان حقائق کی ایک لمبی فہرست موجود ہے جس کے ساتھ ڈاکٹروں اور مریضوں کے بیانات بھی شامل ہیں۔ ہم تمام نسخوں کا جو یہاں تجویز کئے جاتے ہیں باقاعدہ ریکارڈ رکھتے ہیں"۔

ہومیوپیتھی کے منکرین میں سے سابق امام لندن مسجد بی۔ اے رفیق صاحب بھی تھے۔ وہ ذیابیطس کے مریض تھے۔ نتیجتاً انسولین کی خاصی مقدار ان کے پاس موجود رہتی تھی لیکن اس میں کچھ دقتیں تھیں۔ سب سے بڑھ کر تو یہ کہ ان دنوں انسولین پاکستان میں آسانی سے دستیاب نہیں تھی۔ پھر دور افتادہ مقامات پر یا تو بجلی تھی نہیں اور اگر تھی بھی تو اس کی سپلائی باقاعدہ نہیں تھی' اس لئے انسولین کو معیاری درجہ حرارت میں رکھنا ایک مشکل امر تھا۔ بی اے رفیق صاحب پاکستان جا رہے تھے۔ انہوں نے احتیاطاً (حضرت) خلیفہ رابع کی خدمت میں گذارش کی کہ میرے قیام پاکستان کے دوران چونکہ انسولین کی سپلائی یقینی نہیں ہے اس لئے کوئی ہومیوپیتھک دوائی تجویز کی جائے۔ آپ نے نسخہ تجویز کرنے کے بعد مشورہ دیا کہ "یہ دوائی استعمال کرکے دیکھ لیں۔ اگر فائدہ نہ کرے تو اس کا استعمال بند کردیں"۔

بی اے رفیق صاحب کے داماد ہومیوپیتھک کے سخت مخالف تھے۔ وہ ایک ڈاکٹر تھے اور امریکہ میں مقیم تھے۔ کہنے لگے۔

سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ اس دوائی سے بھی کوئی فائدہ ہو۔ اتفاق کی بات ہے کہ اس مرتبہ قیام پاکستان کے دوران بی اے رفیق صاحب کو انسولین دستیاب نہ ہو سکی چنانچہ چاروناچار انہوں نے ہومیوپیتھک دوائی کو آزمانے کا فیصلہ کیا۔ دوائی کھائی اور حیرت میں آگئے اور پکار اٹھے۔ اس سے تو بہت فائدہ ہوا

ہے۔

وہ خود کہتے ہیں:۔

"مجھے علم طب سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ میرا داماد بدستور ہومیوپیتھک طریقہ علاج کا منکر ہے لیکن میں اتنا جانتا ہوں کہ مجھے تو اس سے فائدہ ہوا ہے"۔

اس کا ذکر انہوں نے ذیابیطس کے ایک اور مریض (حضرت) چوہدری محمد ظفر اللہ خان صاحب، صدر عالمی عدالت انصاف سے بھی کیا۔ وہ مسکرائے اور کہنے لگے۔ مجھے بھی بالکل یقین نہیں آتا۔ میں چالیس سال سے اس مرض میں مبتلا ہوں۔ کیسے مان لوں کہ ہومیوپیتھی کی دوائی مجھے فائدہ دے سکتی ہے۔

لیکن انہوں نے بھی تجربتاً دوائی استعمال کرنی شروع کردی اور دو ماہ بعد بی۔ اے رفیق صاحب کو لکھا کہ دوا فائدہ دے رہی ہے۔

زندگی کے آخری دس سالوں میں یہ دوا ان کے زیر استعمال رہی یہاں تک کہ ترانوے سال کی عمر میں ان کا انتقال ہو گیا۔

(حضرت) خلیفہ رابع ہومیوپیتھی پر یقین تو رکھتے ہیں لیکن اس یقین کو اوروں پر مسلط کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔ ہومیوپیتھی کا عقائد سے کچھ تعلق نہیں۔ ہر احمدی آزاد ہے۔ چاہے اسے مانے یا نہ مانے۔

☆ ☆ ☆

31

کچھ حل طلب مسائل

جلاوطنی کے زمانے میں (حضرت) خلیفہ رابع کا لندن میں قیام کئی لحاظ سے ایک نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوا۔ یہاں لندن میں آتے ہی آپ کی تبلیغی مساعی میں غیر معمولی اضافہ ہو گیا۔ آپ سال میں تین تین ماہ دوروں پر رہنے لگے۔ آپ کی انتھک اور پیہم کوششوں سے چھ سال کے مختصر عرصے میں تین لاکھ (اب اس تعداد میں کئی گنا اضافہ ہو چکا ہے) غیراز جماعت افراد کو قبول احمدیت کی توفیق ملی۔ اس قسم کی کامیابیوں کو دیکھ کر بعض احمدیوں نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ احمدیت کی دوسری صدی کے عین سرے پر آپ کا ورود لندن اللہ (تعالیٰ) کی خاص مشیت اور تقدیر کے تحت ہوا ہے۔ اس ضمن میں آپ نے فرمایا:۔

"میں خوب جانتا ہوں کہ (حضرت) مسیح موعود (علیہ السلام) کو اللہ (تعالیٰ) نے الہاماً بتایا تھا کہ میں تیری تبلیغ کو دنیا

کے کناروں تک پہنچاؤں گا۔ میں (حضرت) مسیح موعود (علیہ السلام) کا جانشین ہوں اور میرا ایمان ہے کہ خدا (تعالیٰ) صادق الوعد ہے۔ وہ اپنے وعدے پورے فرماتا ہے"۔

آپ نے دنیا بھر کے احمدیوں کو ہدایت فرمائی کہ اب جبکہ جماعت احمدیہ اپنی زندگی کی دوسری صدی میں داخل ہو رہی ہے" آپ اپنی تبلیغی سرگرمیوں کو تیز تر کر دیں۔ آپ کی ہمہ گیر مساعی کا کوئی گوشہ آپ کی نظر سے اوجھل نہ ہونے پائے۔ ہر محاذ پر آگے بڑھیں۔ ہمیں پہلے سے کہیں زیادہ تبلیغی مراکز، مبلغین، ہسپتالوں، ڈاکٹروں، استادوں، سکولوں اور زرعی ماہرین کی ضرورت ہوگی۔ آپ نے پہلے بھی بڑی فراخ دلی سے مالی قربانیاں پیش کی ہیں۔ لیکن وقت کا تقاضا ہے کہ ہم اپنی مالی قربانیوں کے معیار کو بلند سے بلند تر کرتے چلے جائیں۔

آپ کی اس تحریک پر جماعت نے دیوانہ وار لبیک کہا۔ احمدی نوجوانوں نے افریقہ اور مشرقی دنیا کے پس ماندہ علاقوں کے لئے اپنی رضاکارانہ خدمات پیش کر دیں۔ بعض افریقی ممالک میں پرائمری سطح تک تعلیم مفت ہے لیکن سکولوں کی کمی ہے۔ جماعت نے سکولوں کی عمارتیں تعمیر کر دیں تو اساتذہ کی تنخواہوں کی ذمہ داری حکومت نے قبول کر لی۔

بعض ممالک میں جماعت نے ہسپتال بنائے اور انہیں پورے سازوسامان اور آلات سے آراستہ کر دیا۔ ماہرین اور سپیشلسٹ ڈاکٹروں کی خدمات جماعت کی طرف سے بالکل مفت پیش کی گئیں۔ یہ لوگ اپنے امام کے ارشاد پر اپنے اپنے کاروبار اور معمولات کو چھوڑ کر اپنے گھروں سے نکل کھڑے ہوئے اور خدمت خلق میں مصروف ہو گئے۔

علاوہ ازیں ذہین طلباء کے لئے جماعت کی طرف سے وظائف کا نظام قائم کیا

گیا تا کہ قابل طلباء و طالبات اپنی ثانوی تعلیم جاری رکھ سکیں اور ٹیکنیکل کالجوں اور یونیورسٹیوں میں داخلہ لے سکیں۔

(حضرت) خلیفہ رابع نے ملک ملک کے دورے کئے۔ آپ بے شمار لوگوں سے ملے۔ سربراہان مملکت نے آپ کا استقبال کیا۔ حکومتوں نے آپ کے اعزاز میں استقبالیہ تقاریب منعقد کیں۔ بڑے احترام اور عقیدت سے آپ کو خوش آمدید کہا۔ تکریم کے تمام آداب بجالائے۔ آپ کی خدمت میں خلعت ہائے فاخرہ پیش کی گئیں۔ ہار پہنائے گئے۔ آپ نے نائجیریا' غانا' لائبیریا' سیرالیون اور مغربی افریقہ کے دیگر ممالک میں پروفیسروں' ڈاکٹروں اور طلباء کے اجتماعات سے خطاب فرمایا۔ آپ مشرقی افریقہ کے دورے پر بھی تشریف لے گئے۔ ماریشس اور فجی بھی گئے۔ جرمنی' فرانس' اٹلی' ہالینڈ' سویڈن' ناروے' ڈنمارک کا دورہ کیا۔ جنوبی امریکہ بھی گئے۔ ریڈیو پر آپ کے انٹرویو نشر ہوئے۔ ٹیلی ویژن کے پروگراموں میں آپ کے دوروں کا چرچا رہا۔ اخباری نمائندوں کے ساتھ آپ کے مفصل انٹرویو ہوئے۔ ہمہ وقت ملاقاتیوں کا تانتا بندھا رہا۔ آپ نے بھی ہر چھوٹے بڑے سے مل کر دلی خوشی محسوس کی۔ بلدیہ عظمیٰ ایڈمنٹن کینیڈا کے نائب صدر جو خود ایک راسخ العقیدہ کیتھولک فرقے سے تعلق رکھنے والے عیسائی ہیں' (حضرت) خلیفہ رابع سے اپنی ملاقات کا حال یوں بیان کرتے ہیں:۔

"ایک منتخب عہدہ دار کی حیثیت سے مجھے ان کے یعنی (حضرت) خلیفہ رابع کے ساتھ نشست دی گئی...... اس طرح مجھے ان سے گفتگو کا موقع میسر آگیا۔ ان سے مل کر مجھے یوں لگا جیسے میں حقیقی معنوں میں ایک حسین و جمیل انسان کے سامنے بیٹھا ہوں۔ جس کے چہرے اور نگاہوں سے ہمدردی'

محبت، حکمت، رحم اور شفقت کی کرنیں پھوٹ کر نکل رہی ہیں اور میرے جسم و جان کو منور کر رہی ہیں۔ ملتے ہی آپ کی شخصیت اور موجودگی کا شدت سے احساس ہونے لگتا ہے اور دل اس یقین سے بھر جاتا ہے کہ ہم ایک مقدس انسان کی خدمت میں بیٹھے ہیں۔ آپ کی پُرکشش شخصیت دلوں کو شدت سے اپنی طرف کھینچتی ہے اور دیکھنے والا بے اختیار پکار اٹھتا ہے کہ واقعی یہ اللہ کا ایک محبوب بندہ ہے۔ آپ سے ملاقات ایک روحانی تجربے سے کم نہیں۔ جب ملاقات ختم ہوتی ہے تو ملاقات کرنے والا محسوس کرتا ہے جیسے خدا تعالیٰ کی معرفت اور عرفان کے نئے افق اس پر روشن ہو گئے ہوں اور وہ خدا تعالیٰ کی محبت کی دولت سے مالا مال ہو کر لوٹا ہو"۔

نیز کہا:۔

"پہلی نظر ہی میں آپ ان کے گرویدہ ہو جاتے ہیں اور ان سے قریب تر ہونے کو جی چاہتا ہے۔ ان کی باتیں سن کر زندگی کی گتھیاں سلجھنے لگتی ہیں اور زندگی گزارنے کے ڈھنگ آجاتے ہیں۔ مجھے پہلی بار ایسی ہستی سے ملنے کا شرف حاصل ہوا ہے۔ جس نے میرے وجود کو ہلا کر رکھ دیا ہے"۔

عوام سے آپ کو گہری محبت ہے۔ آپ عوام سے ملنا چاہتے ہیں۔ کسانوں، مزدوروں، محنت کشوں، سبھی سے مل کر آپ دلی راحت محسوس کرتے ہیں اور پھر ہوتا یہ ہے کہ آپ کسی جگہ سے رخصت ہوتے ہیں تو وہاں احمدیوں کی تعداد پہلے

سے کہیں زیادہ بڑھ چکی ہوتی ہے۔

جب جنرل ضیاء الحق بقید حیات تھے تو پاکستان کی طرف سے مغربی افریقہ کے ممالک کو ہسپتالوں اور سکولوں کی تعمیر کے لئے بارہا مالی امداد کی پیشکش کی گئی لیکن یہ امداد اس شرط کے ساتھ مشروط تھی کہ احمدی مبلغین کو ملک بدر کر دیا جائے۔ اس قسم کی ہر پیشکش ٹھکرا دی گئی۔

اس ضمن میں ایک ملک کے صدر مملکت نے حضور کو بتایا کہ:۔

"میں نے دو ٹوک الفاظ میں صاف صاف بتا دیا کہ ہم پاکستان کی مالی امداد کو بخوشی قبول کرنے کے لئے تیار ہیں لیکن ہم ہرگز یہ اجازت نہیں دے سکتے کہ لوگوں کو مذہب کی بنا پر ظلم و ستم کا نشانہ بنایا جائے۔ ہم لوگ پہلے ہی بڑے گھمبیر مسائل سے دوچار ہیں۔ اس قسم کی امداد لے کر ایک نیا شوشہ چھوڑنے کی ہمیں قطعاً ضرورت نہیں۔ جب احمدی یہاں آئے تو انہوں نے کوئی شرط عاید نہیں کی تھی، سکولوں، ہسپتالوں، اساتذہ اور ڈاکٹروں کے بارے میں انکی پیشکش تو بڑی ہی فراخدلانہ اور غیر مشروط تھی"۔

آپ نائجیریا تشریف لے گئے تو آپ نے صدر مملکت سے نائیجیریا کے مسائل پر بڑی سیر حاصل گفتگو فرمائی۔ رخصت ہونے لگے تو صدر مملکت نے آپ کے قافلے کے ایک رکن کو جو پیدائشی نائیجیرین تھا، اشارے سے روک لیا اور حیرت سے پوچھا کہ ہمارے معزز مہمان کو یہاں تشریف لائے ہوئے آج پانچواں دن ہے لیکن کیا آپ بتا سکیں گے کہ ہمارے مسائل کے متعلق ان کی معلومات کی گہرائی اور وسعت کا راز کیا ہے؟

اس نے جواب دیا کہ دنیا بھر میں جماعت کے تبلیغی مشن قائم ہیں۔ مبلغین کرام اپنی اپنی تبلیغی مساعی کی رپورٹیں بھجواتے رہتے ہیں۔ جن کے ذریعے سے ملکی حالات کا بھی آپ کو بخوبی اندازہ ہوتا رہتا ہے۔ علاوہ ازیں جماعتوں کے دورے پر جانے سے پہلے میزبان ملک کے حالات اور کوائف کا آپ بغور مطالعہ فرماتے ہیں۔

سفر کے دوران آپ آرام و آسائش کا بہت کم خیال رکھتے ہیں۔ شروع شروع میں تو آپ ہوائی جہاز کا سفر بھی اکانومی کلاس ہی میں کیا کرتے تھے۔ آپ کے مالی امور کے مشیروں کا مشورہ تھا کہ آپ کو بہر صورت فرسٹ کلاس میں سفر کرنا چاہئے۔ اول تو آپ کے عظیم منصب کا تقاضا ہے کہ آپ اپنی شایان شان کلاس میں سفر کریں۔ دوم ضروری ہے کہ اس قسم کے سفر کے دوران آپ کے آرام کا زیادہ سے زیادہ خیال رکھا جائے۔ لیکن آپ نے اپنے مالی مشیروں کے مشورے کو یکسر مسترد کر دیا.... یہاں تک کہ آپ نے سیکنڈ کلاس میں سفر کرنے سے بھی صاف انکار کر دیا۔ فرمایا یہ رقم جو کرائے پر صرف کی جاتی ہے ان احمدی مخلصین کے چندوں سے حاصل ہوتی ہے جن کی اکثریت غرباء پر مشتمل ہے۔ یہ ایک مقدس امانت ہے جسے غیر ضروری کاموں پر خرچ نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن جہاں آپ کے مالی مشیر اپنی کوشش میں ناکام رہے وہاں آپ کا حفاظتی عملہ کامیاب ہو گیا۔ ان کی دلیل تھی بھی وزنی۔ انہیں اندیشہ تھا کہ اکانومی کلاس کے ہجوم میں وہ اپنے فرائض منصبی یعنی (حضرت) خلیفہ رابع کی حفاظت کے فرائض تسلی بخش طریق پر ادا نہیں کر سکیں گے۔

آپ نے منتظمین کی اس تجویز کو بھی مسترد فرما دیا تھا کہ چونکہ لندن مسجد کے رہائشی کمرے آپ اور آپ کے اہل و عیال کے لئے ناکافی ہیں، اس لئے منتظمین

چاہتے ہیں کہ آپ کے لئے ایک کشادہ اور آرام دہ رہائش گاہ کا بندوبست کیا جائے۔

آپ کی تفریحات پر حسب معمول پہلی سی سادگی اور بے تکلفی کا رنگ غالب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ اپنے دوروں کا آغاز اور اختتام ہالینڈ سے فرمایا کرتے ہیں۔ اس سے یہ اضافی فائدہ بھی مقصود ہوتا ہے کہ ننز پیٹ (NUNSPEET) کے قریب مسجد کے نواح میں دیہات کی خاموش اور پُر سکون سڑکوں پر آپ کی دونوں چھوٹی صاحبزادیاں اطمینان سے سائیکل چلا سکیں۔ آپ فرماتے ہیں:

> "مجھے یہ جگہ بے حد پسند ہے۔ جدھر دیکھو۔ بڑے شہروں کا خرخشوں سے دور سکون ہی سکون ہے۔ جدھر جاؤ پھول ہی پھول ہیں۔ مکانات بھی نہایت صاف ستھرے اور خوبصورت ہیں۔ ایک گھر بھی ایسا نہیں جسے بدنما کہہ سکیں"۔

ایسا بھی نہیں کہ آپ صرف پُر سکون سادہ اور خاموش تفریحات ہی پسند کرتے ہوں۔ ایک مرتبہ کا ذکر ہے آپ شمالی انگلستان کی سیاحت کے لئے روانہ ہونے والے تھے کہ آپ کے حفاظتی عملے کے سربراہ میجر محمود احمد نے عرض کیا کہ حضور جی چاہتا ہے کہ راستے میں جھیل ونڈر میر (WINDERMERE) پر رک کر گھنٹہ بھر کے لئے کشتی رانی کا لطف اٹھایا جائے۔ آپ کو یہ تجویز بہت پسند آئی چنانچہ میجر محمود احمد صاحب نے ربڑ کی کشتیاں جن میں ہوا بھری جا سکتی ہے 'کار کی ڈگی میں رکھ لیں۔

اتفاق کی بات ہے جب آپ کا قافلہ جھیل مذکور پر پہنچا تو انگلستان کا مشہور زمانہ روایتی موسم استقبال کے لئے موجود تھا۔ موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ آسمان پر سیاہ بادل چھائے ہوئے تھے۔ پانی تھا کہ چھاجوں برس رہا تھا۔ تند و تیز

ہوائیں چل رہی تھیں اور اس طوفان بادوباراں میں مارے سردی کے برا حال ہو رہا تھا۔ یہاں تک کہ خود برطانوی زائرین اور چھٹیاں منانے والے بھی جھیل سے راہ فرار اختیار کر چکے تھے۔

جھیل کے قریب آپ کی کار رکی۔ ڈگی سے کشتیاں نکالی گئیں۔ ان میں ہوا بھری گئی تو آپ نے میجر محمود احمد صاحب سے فرمایا کہ جائیں اور میری بیگم کو اطلاع دیں کہ کشتیاں تیار ہیں۔ آپ چاہیں تو آسکتی ہیں۔

میجر صاحب سر سے پاؤں تک شرابور حضور کا پیغام لے کر پہنچے تو (حضرت) سیدہ بیگم صاحبہ کار میں بیٹھی انتظار کر رہی تھیں۔ پیغام سن کر فرمانے لگیں:۔

"مکرم میجر صاحب! ہوش کے ناخن لو۔ اس موسم میں جھیل میں جانے کی کون جرأت کر سکتا ہے؟"

لیکن (حضرت) خلیفہ رابع اور میجر محمود احمد نے نہ صرف اس موسم میں جھیل میں کشتی رانی کی جرأت کی بلکہ اس سے محظوظ بھی ہوئے۔ مرحومہ اس واقعہ کو زندگی بھر لطف لے لے کر بیان فرمایا کرتیں۔ آپ اٹھاون سال کی عمر تک سکواش کھیلتے رہے۔ فرماتے ہیں کہ:۔

> "پھر بعض احباب نے اصرار کیا کہ میں سکواش کھیلنا ترک کردوں۔ ان کو تشویش تھی کہ کہیں کھیل کے دوران میں کسی حادثہ سے دوچار نہ ہو جاؤں۔ کسی مخالف کھلاڑی کا بلا نہ لگ جائے۔ یا میرا سر دیوار سے نہ ٹکرا جائے۔ کچھ دوست فکر مند تھے کہ کہیں کھیل سے میرے دل کو ضرر نہ پہنچے۔ امراض قلب کے ایک ماہر ڈاکٹر نے معائنہ کے بعد بتایا کہ اگرچہ میرا دل بالکل ٹھیک حالت میں کام کر رہا ہے۔ لیکن اتنی

احتیاط ضرور کروں کہ سانس پھول جائے تو کھیلنا بند کردوں۔ سوچتا ہوں کہیں میں نے کھیل کو ہمیشہ کے لئے ہی خیرباد نہ کہہ دیا ہو"۔

نشانہ بازی کی مشق آپ دو طرح سے کرتے ہیں۔ مصنوعی ہدف یا کلے پیجن (CLAY PIGEON) کو ہوا میں اچھال کر یا پھر تیر اندازی سے۔ جب آپ دوروں پر جاتے ہیں تو لوگ آپ سے ہر قسم کے موضوعات پر طرح طرح کے سوالات پوچھتے ہیں اور راہنمائی چاہتے ہیں۔ مذہب۔ اخلاقیات۔ ہومیوپیتھی یا ایڈز غرض کہ کونسا موضوع ہے جس سے متعلق سوالات نہ پوچھے جاتے ہوں۔ آکسفورڈ یونیورسٹی کے طلباء نے زیادہ تر قرآن کریم اور اس کے مطالب و معانی اور اسرار و رموز کے بارے میں سوالات پوچھے۔

پردے کے متعلق سوال اکثر کیا جاتا ہے۔ مثلاً برقعہ یا نقاب کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟ کیا آپ امید کرتے ہیں کہ یورپ اور افریقہ کی خواتین سر اور چہرے کو ڈھانپنے کے لئے یکساں وضع قطع اور ڈیزائن کا نقاب استعمال کر سکیں گی؟

جواب:۔ "نقاب اور اس کے ڈیزائن کوئی بنیادی حیثیت نہیں رکھتے۔ بنیادی اصول جو قرآن (کریم) میں بیان کیا گیا ہے وہ صرف یہ ہے کہ خواتین اپنے لباس کے بارے میں تقویٰ سے کام لیں اور شرم و حیا اور پاکدامنی کو ملحوظ خاطر رکھیں۔ ایسا لباس نہ پہنیں جس سے دیکھنے والے مرد کے دل میں ہیجان اور برے خیالات پیدا ہوں۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے لباس کو تقویٰ کا لباس نہیں کہا جا سکتا۔

لباس کی وضع قطع اور تراش خراش اگر خوف خدا اور تقویٰ کی چار دیواری کے اندر رہتی ہے تو لباس کوئی سا بھی ہو درست ہو گا۔ اس کے علاوہ کوئی پابندی

نہیں۔ بلکہ اس کے بعد تو یہ سوال ہی پیدا نہیں ہو گا کہ عورت کس قسم کا لباس پہنے اور اس کا ڈیزائن کیا ہو"۔

ایک مرتبہ آپ سے سوال کیا گیا کہ کیا آپ بتانا پسند فرمائیں گے کہ پچھلے سو سال کے عرصے میں علمی تحقیق کے میدان میں مسلمان ممالک کی طرف سے کوئی تحقیقی کاوش بھی دیکھنے میں نہیں آئی، جس سے بنی نوع انسان کو فائدہ پہنچا ہو۔ حالانکہ جب یورپ پر تاریکی کے بادل چھائے ہوئے تھے، مسلمان علمی تحقیق کے میدان میں سند کا درجہ رکھتے تھے۔ فرمایا:۔

"بدقسمتی سے صورت حال کچھ ایسی ہی ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ علماء نے قرآن (کریم) کے حقیقی مقصد اور مفہوم سے روگردانی اختیار کر لی اور ایک بگڑے ہوئے تصور نے اس کی جگہ لے لی"۔

آپ نے پُرزور الفاظ میں فرمایا کہ:۔

"قرآن (کریم) خدا کی کسی بھی تخلیق سے متصادم نہیں۔ قرآن اللہ (تعالیٰ) کا کلام ہے اور کائنات اس کا فعل۔ خدا کے قول اور فعل میں کسی قسم کے تضاد یا تصادم کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا"۔

قرآن کہتا ہے کہ ہر خیر اور خوبی کا حق ہے کہ اسے قبول کیا جائے۔ قرآن سائنس کے ہرگز خلاف نہیں۔ اگرچہ ماضی میں بعض غلط عقائد کی وجہ سے اس غلط فہمی کا امکان پیدا ہو گیا تھا۔ بعض مسلمان حلقوں میں مذہبی تشدد اور جارحیت کے بڑھتے ہوئے رجحان کے پس منظر میں آپ نے ایک کتاب "مذہب کے نام پر خون" لکھی جو بہت مقبول ہوئی اور ہاتھوں ہاتھ بک گئی۔

سوال:- کیا آپ کے نزدیک جماعت احمدیہ کی ترقی کی رفتار خوفناک حد تک تیز تو نہیں؟

جواب:- "اگر آپ مجھ سے پوچھتے ہیں تو میں تو کہوں گا کہ ہماری ترقی کی رفتار کتنی بھی تیز کیوں نہ ہو جائے ہم اسے کبھی ضرورت سے زیادہ نہیں کہیں گے۔ ہم نے تو ابھی ان لمحات کی تلافی کرنی ہے جو یونہی گذر گئے۔ ہمیں تو الٹا یہ غم ہے کہ بعض معاملات میں ہم نے سہل انگاری سے کام لیا اور اپنے فرائض کی ادائیگی کا پورا پورا حق ادا نہ کر سکے۔

ہاں ایک خوف ضرور دامن گیر رہتا ہے۔ جس تیز رفتاری سے غیر از جماعت لوگ حلقہ بگوش احمدیت ہو رہے ہیں، کیا ہم ان کی تربیت بھی اسی رفتار سے کر رہے ہیں یا نہیں؟ کیا ہم واقعی ان کی ٹھوس، بامقصد اور صحیح بنیادوں پر تربیت کر رہے ہیں؟ کہیں یہ تربیت سطحی تو نہیں ہے؟ اس لئے میری پوری کوشش ہوتی ہے کہ ہماری تربیتی مساعی میں اعتدال اور توازن برقرار رہے۔ میں تو ہمیشہ اللہ (تعالیٰ) کے حضور دست بدعا رہتا ہوں کہ اے خدا ہماری ترقی کی رفتار کو تیز سے تیز تر فرما۔ لیکن یہ رفتار اتنی تیز بھی نہ ہونے پائے کہ ہم نئے آنے والوں کی تربیت کے سلسلے میں اپنی ذمہ داریاں پورے طور پر ادا نہ کر سکیں"۔

خلیفہ وقت کی حیثیت سے آپ کو ایسے فیصلے بھی کرنے پڑتے ہیں جو لاکھوں کروڑوں انسانوں کی زندگیوں پر اثر انداز ہو سکتے ہیں۔

فرمایا:-

"یہ بڑی بھاری اور نازک ذمہ داری ہے۔ لیکن دیگر راہنماؤں کے مقابلے میں ہمیں یہ خصوصیت حاصل ہے کہ ہم شعوری طور پر سوچتے رہتے ہیں کہ ہم ایسے فیصلے کریں جو خدا (تعالیٰ) کے حضور بھی پسندیدہ قرار پائیں۔ ہم جماعت یا افراد کے حوالے سے بات نہیں کرتے۔ ہم بات صرف اللہ (تعالیٰ) کے حوالے سے کرتے ہیں۔ اس کی پسند ناپسند ہی ہمارے فیصلوں کا واحد معیار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خدا (تعالیٰ) کو گواہ ٹھہرا کر میں ایسے فیصلے بھی آسانی سے کر گزرتا ہوں جن کے متعلق بعض دفعہ مجھے احساس ہوتا ہے کہ یہ جماعت کی مرضی کے مطابق نہیں ہیں۔

فیصلہ کرتے وقت میں اپنے آپ کو اللہ (تعالیٰ) کے سپرد کر دیتا ہوں اور اسی سے راہنمائی کا طالب ہوتا ہوں اور اسی سے عرض کرتا ہوں کہ اے خدا! مجھے ایسا فیصلہ کرنے کی توفیق دے جس سے تو خوش ہو جائے لیکن دشواری اس وقت پیش آتی ہے جب حقائق اور شواہد پورے طور پر سامنے موجود نہ ہوں اور مقدمے کی مسل میں بہت سے خلا باقی ہوں۔ بس لمبی اور مسلسل دعا کے بعد اللہ (تعالیٰ) سے ہدایت چاہتا ہوں اور فیصلہ کر دیتا ہوں۔

یہ ہدایت کبھی ایسے خواب کی صورت میں ہوتی ہے جس میں کوئی واضح پیغام موجود ہوتا ہے یا پھر دعا کرتے وقت

طبیعت میں انشراح پیدا ہو جاتا ہے۔ حقیقت حال کھل کر سامنے آجاتی ہے اور دل اس یقین سے بھر جاتا ہے کہ جو فیصلہ کرنے لگا ہوں وہ صحیح ہے اور انصاف کے تقاضوں کو پورا کرتا ہے۔

لیکن واقعہ یہ ہے کہ فیصلہ کرتے وقت دل پر اللہ (تعالیٰ) کا خوف طاری ہوتا ہے۔ فیصلہ طلب معاملہ جتنا اہم ہو اتنا ہی ڈرتا بھی ہوں کہ کہیں غلطی نہ کر بیٹھوں۔ لیکن روزمرہ کے معمولات میں ایسا نہیں ہوتا۔ عام اصولی فیصلے کرنے میں کوئی دقت پیش نہیں آتی اور نظائر اور لمبے تجربے کی روشنی میں فیصلہ کرنا آسان ہو جاتا ہے۔ اس صورت میں غلطی کا احتمال بھی نہیں ہوتا۔ بلاتوقف فوراً فیصلہ صادر کر دیتا ہوں۔

لیکن اگر پتہ چلے کہ فیصلہ غلط ہوا ہے یا اس میں کوئی خامی رہ گئی ہے تو بلا تامل فیصلے کو کالعدم بھی قرار دے دیتا ہوں۔ لیکن ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا ہے کیونکہ فیصلے تو اللہ (تعالیٰ) کو حاضر ناظر جان کر اسی کے بھروسے پر کئے جاتے ہیں"۔

☆ ☆ ☆

32

اسلام کا مستقبل

جمعرات کا دن تھا اور مارچ ۱۹۸۹ء کی تئیس تاریخ۔ شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے۔ پارک لین لندن میں واقع ایک شاندار ہوٹل کے ہال میں دنیا کے کونے کونے سے آئے ہوئے خواتین و حضرات جمع تھے۔ ملک ملک کے وزراء' پارلیمنٹ کے اراکین' مصنفین پروفیسرز' ڈاکٹرز' وکلاء' علمائے دین اور تاجر حضرات غرض کہ زندگی کے ہر شعبے سے تعلق رکھنے والے معززین موجود تھے۔ کچھ نے ڈنر جیکٹ یا کھانے کا رسمی لباس پہنا ہوا تھا۔ کچھ لوگ اپنے اپنے قومی لباس میں ملبوس تھے۔ مشرقی اور مغربی افریقہ کے مخصوص اور رنگین چُغے' سوڈان کے سفید براق لانبے انگرکھے اور جبے۔ حتیٰ کہ سکاٹ لینڈ کے کلٹ(Kilt) بھی اپنی سج دھج دکھا رہے تھے۔

حقیقی معنوں میں یہ ایک عظیم الشان اور دنیا بھر کا نمائندہ اور یادگار اجتماع تھا۔ عین آٹھ بجکر چونتیس منٹ پر (حضرت) خلیفہ رابع نے جماعت کی صد سالہ جوبلی

کے موقع پر اپنا تاریخی خطبہ یوں شروع فرمایا:-

"پورے ایک سو سال قبل ایسا ہی ایک اور اجتماع بھی ہوا تھا جب اس وقت کے متحدہ ہندوستان کے قصبے لدھیانہ میں بانی جماعت احمدیہ (حضرت) مسیح موعود (علیہ السلام) نے ایک معمولی سے مکان کے ایک چھوٹے سے کمرے میں جو تنوری روٹیاں پکانے کے کام آتا تھا' اپنے اولین متبعین سے عہد بیعت لیا تھا- آپ نے پیشگوئی فرمائی تھی کہ تین صدیاں گذرنے سے پہلے ساری دنیا حلقہ بگوش اسلام ہو جائے گی"-

(حضرت) خلیفہ رابع نے اپنے خطاب میں اعداد و شمار تو پیش نہیں فرمائے لیکن صد سالہ جوبلی کی تقریب پر شائع ہونے والے رسائل میں جو ہوٹل میں ہونے والی نمائش میں رکھ دیئے گئے تھے -جماعت کی حیرت انگیز ترقی کا تفصیل کے ساتھ ذکر موجود تھا- اب احمدی مسلمانوں کی تعداد ایک کروڑ سے تجاوز کر چکی تھی-'جن میں سے پچاس لاکھ کے قریب تو پاکستان میں سکونت پذیر ہیں- باقی پچاس لاکھ کینیڈا سے لے کر بھارت چین' برونڈی' برما' روس' روانڈا' غرضیکہ ایشیا' امریکہ 'افریقہ اور یورپ کے جملہ ممالک میں پھیلے ہوئے ہیں- دنیا کے صفحے پر شاید ہی کوئی ایسا ملک ہو جہاں احمدی نہ پائے جاتے ہوں- ایک سو بیس ممالک میں تو معین طور پر علم ہے کہ وہاں احمدی موجود ہیں- انہوں نے اکثر ممالک میں مساجد تعمیر کرلی ہیں اور جن ممالک میں فعال مشن اور تبلیغی مراکز کی تعمیر اور قیام پر پابندیاں عاید ہیں- وہاں یہ لوگ نجی مکانوں میں عبادت کے لئے جمع ہوتے ہیں اور اپنی اجتماعی سرگرمیاں جاری رکھتے ہیں-

یہ کارنامہ کیسے سرانجام پایا؟ ظاہر ہے کہ اس میں انتھک محنت' ایثار اور

قربانیوں کا بھی زبردست حصہ ہے۔

(حضرت) خلیفہ رابع نے اس موقع پر فرمایا کہ:۔

"بے شک یہ کامیابیاں عظیم الشان تو ہیں لیکن کافی نہیں۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ ہر احمدی کمر ہمت کس لے اور جہاں بھی ہو، جس حال میں بھی ہو، اپنی اپنی جگہ پر جماعت احمدیہ کا جیتا جاگتا مبلغ بن جائے۔

ہم ہر احمدی سے توقع رکھتے ہیں کہ اس کے ذریعے سے جماعت میں کم از کم دو نئے احمدی ضرور شامل ہو جائیں۔ جماعت کا یہ فرض بھی ہوگا کہ وہ نہ صرف نئے احمدی بنائے بلکہ نئے آنے والوں کی ایسی عمدہ تربیت بھی کرے جس سے نئے آنے والے بجائے خود جماعت کے فعال مبلغ بن جائیں"۔

اس ارشاد کی تعمیل میں بہت سی کانفرنسیں منعقد ہوئیں جن کا واحد مقصد یہ تھا کہ دنیا بھر میں اسلام کی تبلیغ کے بہترین ذرائع تلاش کئے جائیں۔ ان کانفرنسوں میں مبلغین نے حاضرین کو بتایا کہ انہوں نے کیوں اور کس طرح احمدیت قبول کی۔ چنانچہ پانچ پانچ افراد پر مشتمل راہنما تبلیغی گروپ بنائے گئے۔ ہر گروپ میں شامل افراد کو یہ ذمہ داری تفویض کی گئی کہ ایک دوسرے کی مدد کرنے کے علاوہ وہ ابلاغ حق کی نئی نئی راہیں بھی تلاش کریں۔ ہر گروپ کو ایک معین ہدف دیا گیا کہ چھ ماہ کے اندر اندر کم از کم اتنے نئے احمدی بنانا ہونگے۔

اس سلسلے میں آپ نے فرمایا:۔

"ابلاغ حق کا طریق یہ ہے کہ پہلے محبت سے لوگوں کے

دل جیتو۔ ان کے دماغ جیتنے کی کوشش بعد میں کرو"۔

دنیا بھر کے احمدیوں نے اپنے امام کے اس پیغام کو حرز جان بنا کر اس پر عمل درآمد شروع کر دیا۔ افریقہ میں خواتین کی تنظیموں نے ۲۸۰ غرباء کے لئے کپڑے اور بستر تیار کئے۔ بیماروں کی عیادت کے لئے ہسپتالوں اور قیدیوں سے ملاقات کے لئے جیلوں کے دورے کئے۔ ملک ملک کے احمدیوں نے ہزاروں کی تعداد میں خون اور گردوں کے عطیات پیش کر دیئے۔ "ہم احمدی مسلمان ہیں" کے بلے بھی اکثر رضاکاروں نے لگائے ہوئے تھے تا کہ یہ پتہ چل سکے کہ ہم یہ خدمت کسی دنیوی مقصد کے حصول کے لئے نہیں کر رہے ہیں۔

یورپ اور شمالی امریکہ میں سائیکل چلانے اور پیدل چلنے کے مقابلے منعقد کروائے گئے تا کہ عمر رسیدہ لوگوں اور ذہنی طور پر مریض بچوں کی مدد کے لئے مالی امداد فراہم کی جائے۔

فرمایا:-

"اچھے پڑوسی بنو اور ایسا مثالی اور نیک نمونہ پیش کرو کہ تمہارا ہمسایہ تمہیں اپنا ماں جایا سمجھنے پر مجبور ہو جائے۔ کوڑا کرکٹ ادھر ادھر مت پھینکو۔ اپنے ریڈیو کی آواز کو دھیما رکھو۔ اپنے پڑوسیوں کی پسند ناپسند کا خیال رکھو۔ ان کی مشکلات اور مسائل سے باخبر رہو۔ ان کے دکھ کو اپنا دکھ بنا لو اور ان کی خوشی کو اپنی خوشی۔"

چنانچہ عید کی تقریب پر احمدیہ مساجد کے قرب وجوار میں رہنے والے ہمسایوں کو عصرانے کی دعوتوں پر مدعو کیا گیا۔ قریب کے سکولوں اور کالجوں کے طلباء اور اساتذہ کو دوروں کی دعوت دی گئی۔

فرمایا:-

"احمدیت کی دوسری صدی کی کامیابی کا انحصار نوجوانوں پر ہے۔ چنانچہ اس ہدایت کی روشنی میں مبلغین نے سکولوں کی تعطیلات کے دوران تربیتی کلاسوں کا اہتمام کیا جن میں صبح کے وقت قرآن (کریم) کے اسباق دیئے جاتے تھے اور شام کو کھیلوں، ابتدائی طبی امداد، تقاریر، تبادلہ خیالات اور سوال و جواب کی محفلوں کے پروگرام بنائے گئے۔

فرمایا:

"میری دلی خواہش ہے کہ خواتین بھی مردوں کے شانہ بشانہ ڈاکٹر، ماہر تعمیرات، آرکیٹکٹ، وکیل، استاد اور انجینئر بنیں۔ عورتوں کو اسلام نے مردوں کے مساوی حقوق ہی نہیں دیئے بلکہ انہیں خاص حقوق سے بھی نوازا ہے"۔

آپ نے احمدی خواتین کی تنظیموں سے فرمایا:-

کہ وہ ٹینس، تیراکی اور دیگر کھیلوں کی تنظیمیں بنائیں۔

نومبائعین کی طرف سے غفلت نہ برتیں۔ یاد رکھیں۔ اسلام صرف مشرق کے لئے نہیں بلکہ ساری دنیا کے لئے آیا ہے۔

اس مضمون کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا:

"میں چاہتا ہوں کہ ہر احمدی کا انداز فکر اور اس کی سوچ آفاقی ہو جائے۔ ہم دلی طور پر محسوس کریں کہ بنی نوع انسان ایک وحدت ہیں۔ ایک "اکائی" کے رشتے میں پروئے ہوئے تسبیح کے دانے ہیں۔ اپنے اندر یہ احساس پیدا کریں کہ ہم اس عظیم وحدت کا حصہ ہیں۔ انسانی رشتوں کے حوالے سے جغرافیہ یا رنگ و نسل کی کوئی دیوار آپ کے راستے میں حائل نہ ہونے پائے بلکہ آپ اس قسم کی کسی روک اور دیوار کو تسلیم ہی نہ کریں جو انسان کو انسان سے الگ کر کے رکھ

دیتی ہے۔

بے شک یہ سب کچھ کہنا آسان ہے اور اس کا کرنا بہت مشکل ہے۔ اصل دقت اور روک برتری کا احساس نہیں بلکہ وہ احساس کمتری ہے جس میں بعض دفعہ قوموں کی قومیں مبتلا ہو جاتی ہیں"۔

اس لئے آپ نے پُر زور الفاظ میں فرمایا:۔

"تمام نئے احمدیوں کو جماعت کے فعال رکن بنا دیں۔ انہیں مختلف تنظیموں میں شامل کریں تا کہ وہ نظام جماعت کے طریق کار اور لب و لہجے سے متعارف ہو جائیں اور وہ ہمارے مشترکہ مقاصد کے حصول میں انشراح صدر کے ساتھ آسانی سے ہاتھ بٹا سکیں اور سماجی یا لسانی فرق کی وجہ سے انہیں اجنبیت کا احساس نہ ہونے پائے۔

نئے احمدیوں کے لئے ضروری نہیں کہ وہ فوراً اردو زبان سیکھنا شروع کر دیں بلکہ یہ فرض ہے کہ ہم انگریزی، جرمن، ڈچ، ڈینش اور دوسری مقامی زبانیں سیکھیں تا کہ ہم ایک دوسرے سے بآسانی بات چیت کر سکیں۔

یہاں برطانیہ میں جماعت کی اکثریت پاکستانی ہے یا ہندوستانی۔ لیکن یہ صورت حال ہمیشہ کے لئے برقرار نہیں رہے گی۔ وقت آنے پر موجودہ توازن بدل جائے گا۔ مقامی لوگ بڑی سرعت سے جماعت میں داخل ہوں گے یہاں تک کہ ان کے مقابلے میں پاکستانی اور ہندوستانی احمدیوں کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر رہ جائے گی۔

محدود رنگ میں تو ایسا ہو بھی چکا ہے۔ مثلاً شمالی انگلستان کے بعض قصبوں میں اس وقت بھی نو مبائعین کی تعداد پیدائشی احمدیوں سے کہیں زیادہ ہے"۔

آپ نے فرمایا:۔

"کہ احمدیت کی دوسری صدی کے پہلے بیس سالوں میں کم از کم پانچ ہزار مبلغین کی ضرورت ہوگی" آپ نے تحریک فرمائی کہ والدین آئندہ پیدا ہونے والے بچوں کو خدا کی راہ میں وقف کریں چنانچہ جماعت نے والہانہ انداز میں اس تحریک پر لبیک کہا۔ ۱۹۹۱ء تک پانچ ہزار بچے وقف نو کی تحریک میں شامل ہو چکے تھے۔ یہی بچے بڑے ہو کر جماعت کی تبلیغی ذمہ داری سنبھالیں گے۔

اس سے یہ خیال نہیں کرنا چاہئے کہ ان واقفین کے والدین کو جماعت کی طرف سے کوئی امداد ملے گی۔ خصوصیت ان بچوں کی یہ ہے کہ جب یہ بڑے ہوں اور سن شعور کو پہنچیں تو انہیں علم ہو کہ ان کی پیدائش کے وقت یا اس سے پہلے ان کے والدین کی خواہش تھی کہ وہ واقف زندگی بنیں۔ لیکن یہ خواہش ان کے والدین کی تھی۔ اب وہ آزادانہ طور پر بغیر کسی پابندی اور دباؤ کے خود فیصلہ کریں کہ وہ واقف زندگی مبلغ یا ڈاکٹر وغیرہ بننا چاہتے ہیں یا نہیں؟

آپ نے والدین سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

"اس سلسلے میں والدین پر بڑی بھاری ذمہ داری عاید ہوتی ہے۔ جہاں اسلام کی فتح دو اور دو چار کی طرح یقینی ہے وہاں اس بات کی بھی ضرورت ہے کہ آپ اپنی زندگیوں میں اسلام کی اخلاقی اور روحانی قدروں کو جذب کریں۔ انہیں اپنائیں۔ تبلیغ سے محض تعداد بڑھانا مقصود نہیں۔ یاد رکھیں کہ خدانخواستہ اگر ہم اپنے گھروں میں یہ روحانی جنگ ہار گئے تو محض عددی کامیابی بے معنی ہو کر رہ جائے گی۔

ہمیں اپنے طور طریقوں اور زندگی گزارنے کے مزاج کا جائزہ لینا ہوگا۔ اپنے آپ میں اور اپنی نسلوں میں نیکی اور

روحانی قدروں کو قائم کرنا ہوگا۔ جن گھروں میں نمازیں التزام سے ادا کی جاتی ہیں وہاں بچے اسلامی شعار اور اپنے فرائض بڑی سہولت اور آسانی سے سیکھ جاتے ہیں۔ نتیجتاً عمر بھر کے لئے خدا تعالیٰ سے ان کا مضبوط اور پائیدار تعلق قائم ہو جاتا ہے۔

ضروری ہے کہ ہمارے بچوں کی زندگیوں میں عشق الٰہی اور اسلام اور احمدیت کی روحانی اور اخلاقی قدروں کی حکومت ہو۔ اپنے گھروں میں سچائی اور پاکیزگی کا ماحول پیدا کریں تاکہ آپ کے بچے حقیقی معنوں میں اللہ تعالیٰ کے اطاعت شعار بندے بن جائیں"۔

آپ نے پانچ ہزار (یہ تعداد ۱۹۹۵ء میں چودہ ہزار تک پہنچ چکی ہے۔ مترجم) واقفین نو کے والدین سے یہ خصوصی اپیل بھی کی کہ جہاں تک ممکن ہو وقف نو میں شامل بچوں کو چینی، روسی اور ہسپانوی وغیرہ زبانیں ضرور سکھائیں۔ فرمایا:

"احمدیت کی دوسری صدی میں چین، روس، اور جنوبی امریکہ ایسے ممالک ہیں جہاں ہمیں مبلغین اور ان زبانوں کے جاننے والوں کی بے حد ضرورت ہوگی۔

افریقہ میں ہمارے پاس انگریزی بولنے والے خاصی تعداد میں موجود ہیں۔ فرانسیسی بولنے والے افریقی ممالک میں بھی ہم مضبوطی سے قدم جما چکے ہیں اور وہاں ہماری ترقی کی رفتار تسلی بخش ہے لیکن جنوبی امریکہ، چین اور روس میں تو

ہماری تبلیغی مساعی کا ابھی آغاز ہی ہوا ہے"۔

صد سالہ جشن تشکر کے عشائیے میں آپ نے موجودہ مسائل اور مساعی کا تذکرہ نہیں کیا۔ اس کی بجائے زیادہ تر جماعت کی آئندہ ضروریات اور مستقبل کے منصوبوں کا ہی ذکر فرمایا:۔

فرمایا:

"ہو سکتا ہے کہ کہیں کہیں راستہ تنگ و تاریک اور پُر خطر دکھائی دے۔ لیکن یاد رکھیں خدا کے فضل سے ہمارا مستقبل نہایت تابناک ہے"۔ آپ نے اس شعر کا حوالہ بھی دیا جو ایک شاعر نے بادشاہ کے سامنے پڑھا تھا اور جس کا مفہوم یہ تھا۔

"میں بلندیوں سے نہیں ڈرتا۔ میں خوف زدہ ہوں تو اس کے لئے کہ کہیں بلندیوں سے گر نہ پڑوں۔

جواباً بادشاہ نے کہا تھا:

اگر دل کمزور ہے تو بلندیاں سر کرنے کی سوچ ہی ترک کر دو۔

فرمایا:۔

"جماعت احمدیہ کو گرنے کا خوف ہے نہ خطرہ۔ پھر آپ نے بانی جماعت احمدیہ (حضرت) مسیح موعود (علیہ السلام) کے ملفوظات کا حوالہ دیتے ہوئے فرمایا:۔

"اسلام کی نشاۃ ثانیہ عظیم قربانی کی متقاضی ہے۔ یہ قربانی کیا ہے؟ یہ قربانی ہماری جانوں کی قربانی ہے۔ اسی قربانی سے اسلام اور مسلمانوں کی زندگی اور تجلیات الٰہیہ کا ہمارے زمانے میں ظہور وابستہ ہے۔ قربانی ہی اسلام کی روح ہے۔ اللہ (تعالیٰ) قربانی ہی کے ذریعے اسلام کو پھر ایک بار زندہ کرنا چاہتا ہے"۔

فرمایا:-

"میں خدا تعالیٰ کو گواہ کر کے کہتا ہوں کہ احمدیت کا پیغام سچا ہے اور سچائی کے سوا کچھ نہیں- احمدیت ہی اسلام ہے اور اسلام احمدیت- آج اسلام صرف اور صرف احمدیت ہی میں اپنی اصل، خالص اور مصفّٰی شکل میں موجود ہے- بنی نوع انسان کی نجات کا ایک ہی راستہ ہے اور وہ یہ کہ اس سلامتی اور صلح و آشتی کے مذہب کو دل سے قبول کرلیا جائے- اسلام ہی وہ مذہب ہے جو انسانی رشتوں میں حائل تفریق کی تمام دیواریں ڈھا دیتا ہے- رنگ و نسل اور مذہب و عقیدہ کی نفرتیں اور کدورتیں دھو ڈالتا ہے- اسلام انسان کو گناہ کی کال کوٹھڑیوں سے نکال کر اس کا رشتہ اس کے خالق اور مالک سے جوڑ دیتا ہے- یہ مذہب جتنا سیدھا سادھا اور آسان ہے اتنا ہی ارفع و اعلیٰ، بامقصد، بااصول اور باقاعدہ اور منظم بھی ہے- یہی وہ مذہب ہے جو بدلتی ہوئی دنیا کے ہر تقاضے اور ہر چیلنج کا صحیح معنوں میں مقابلہ کرتا ہے-

اسلام کسی قسم کے استحصال کی اجازت نہیں دیتا خواہ وہ سماجی ہو یا سیاسی، اقتصادی ہو یا مذہبی- اسلام کے فلسفہ سیاست میں جھوٹ اور سفارتی منافقت کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں- اسلام خالصتاً اخلاق حسنہ اور اقدار عالیہ کا مذہب ہے جو انسانی معاملات اور عمرانیات کے ہر میدان میں دوست دشمن سب کے ساتھ کامل عدل اور انصاف کا حکم دیتا ہے-

اسلام مذہبی آزادی کی ضمانت دیتا ہے اور مذہب میں تشدد کی ہرگز اجازت نہیں دیتا۔ نہ خود تشدد کرتا ہے نہ دیگر مذاہب کو تشدد کرنے دیتا ہے۔ دہشت گردی اور تخریب کاری کا اسلامی تعلیمات سے دور کا بھی تعلق نہیں۔ خواہ تخریب کاری کے مبینہ مقاصد کتنے ہی ارفع و اعلیٰ کیوں نہ ہوں۔ اسلام ہی آج کی دکھی دنیا کے تمام دکھوں اور بیماریوں کا علاج ہے۔ اسلام ہی یہ درس دیتا ہے کہ جب تک انسان دوسرے انسان کے ساتھ صلح و آشتی اور محبت کے ساتھ رہنا نہیں سیکھتا' وہ خدا کے ساتھ صلح کی امید بھی نہیں رکھ سکتا۔ یہ وہ اسلام ہے جس کی طرف سے میں تمام بنی نوع انسان کو دعوت دیتا ہوں"۔

اس عشائیہ کے موقع پر مختلف مذاہب کے لوگ موجود تھے۔ چار پانچ روز بعد حضور کو ایک مہمان کی طرف سے جو سکھوں کی ایک تنظیم کے سربراہ تھے' ایک مکتوب موصول ہوا۔ جس میں لکھا تھا کہ عشائیہ کا ماحول سنجیدگی کے ساتھ ساتھ شانتی اور روحانی سکینت سے لبریز تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے دل سکینت اور طمانیت سے بھر گئے ہوں۔

اور آخر میں لکھا:

"یقیناً اس کے پس پشت کوئی خدائی طاقت کام کر رہی تھی"۔

☆ ☆ ☆

خدام احمدیت

ہیں بادہ مست بادہ آشام احمدیت چلتا ہے دور مینا و جام احمدیت
تشنہ لبوں کی خاطر ہر سمت گھومتے ہیں تھامے ہوئے سبوئے گلفام احمدیت
خدام احمدیت، خدام احمدیت

جب دہریت کے دم سے مسموم تھیں فضائیں پھوٹی تھیں جابجا جب الحاد کی وبائیں
تب آیا اک منادی اور ہر طرف صدا دی آؤ کہ ان کی زد سے اسلام کو بچائیں
زور دعا دکھائیں، خدام احمدیت

پھر باغ مصطفیٰؐ کا دھیان آیا ذوالمنن کو سینچا پھر آنسوؤں سے احمد نے اس چمن کو
آہوں کا تھا بلاوا پھولوں کی انجمن کو اور کھینچ لائے نالے مرغان خوش لحن کو
لوٹ آئے پھر وطن کو، خدام احمدیت

چمکا پھر آسمان مشرق پہ نام احمد مغرب میں جگمگایا ماہ تمام احمد
وہم و گماں سے بالا عالی مقام احمد ہم ہیں غلام خاک پائے غلام احمد
مرغان دام احمد، خدام احمدیت

ربوہ میں آج کل ہے جاری نظام اپنا پر قادیان رہے گا مرکز مدام اپنا
تبلیغ احمدیت دنیا میں کام اپنا دارالعمل ہے گویا عالم تمام اپنا
پوچھو جو نام اپنا، خدام احمدیت

اٹھو کہ ساعت آئی اور وقت جارہا ہے پسر مسیحؑ دیکھو کب سے جگا رہا ہے
گو دیر بعد آیا از راہ دور لیکن وہ تیز گام آگے بڑھتا ہی جارہا ہے
تم کو بلارہا ہے، خدام احمدیت

یہ نظم حضور نے اپنی نوجوانی کے زمانہ میں لکھی تھی۔ ربوہ کی تعمیر کے سلسلہ میں کہی تھی۔

مردِ حق کی دعا

دو گھڑی صبر سے کام لو ساتھیو! آفت ظلمت و جور ٹل جائے گی
آہ مومن سے ٹکرا کے طوفان کا رخ پلٹ جائے گا' رت بدل جائے گی

تم دعائیں کرو یہ دعا ہی تو تھی جس نے توڑا تھا سر کبر نمرود کا
ہے ازل سے یہ تقدیر نمرودیت' آپ ہی آگ میں اپنی جل جائیگی

یہ دعا ہی کا تھا معجزہ کہ عصا' ساحروں کے مقابل بنا اژدھا
آج بھی دیکھنا مردِ حق کی دعا سحر کی ناگنوں کو نگل جائیگی

خوں شہیدان امت کا اے کم نظر! رائیگاں کب گیا تھا کہ اب جائے گا
ہر شہادت ترے دیکھتے دیکھتے پھول پھل لائیگی پھول پھل جائیگی

ہے ترے پاس کیا گالیوں کے سوا' ساتھ میرے ہے تائید رب الوریٰ
کل چلی تھی جو لیکھو پہ تیغ دعا' آج بھی اذن ہو گا تو چل جائیگی

دیر اگر ہو تو اندھیر ہرگز نہیں' قول اُمْلِیْ لَھُمْ اِنَّ کَیْدِیْ مَتِیْن
سنت اللہ ہے لاجرم بالیقیں' بات ایسی نہیں جو بدل جائے گی

یہ صدائے فقیرانہ حق آشنا' پھیلتی جائے گی شش جہت میں سدا
تیری آواز اے دشمن بدنوا' دو قدم دور دو تین پل جائے گی

عصر بیمار کا ہے مرض لادوا' کوئی چارہ نہیں اب دعا کے سوا
اے غلام مسیح الزماں ہاتھ اٹھا' موت بھی آگئی ہو تو ٹل جائیگی

خلیفۃ المسیح کی اس نظم میں پاکستان کے ڈکٹیٹر جنرل ضیاء الحق کو انذار کیا گیا ہے۔

میرے بھائی آپ کی ہیں سخت چنچل سالیاں
شعلہ جوالہ ہیں، آفت کی ہیں پرکالیاں

آپ کی داڑھی کا برگد دیکھ پاتیں وہ اگر
اس پہ پینگیں ڈالتیں، گاتیں، بجاتیں تالیاں

توڑ دیتیں ڈالیاں، آتا نہ کچھ ان کو خیال
آپ تو داڑھی منڈا کر بچ گئے ہیں بال بال

[یہ مزاحیہ اشعار ایک عزیز کے متعلق کہے گئے تھے۔]

کچھ مصنف کے بارے میں

جناب Iain Adamson متعدد سوانح عمریوں، تاریخی اور دیگر موضوعات سے متعلق بہت سی کتب کے مشہور و معروف مصنف ہیں آپ ویسٹرٹن سٹریتھ کلائیڈ (Westerton, Strathclyde, Scotland) سکاٹ لینڈ میں پیدا ہوئے۔ سکول کے زمانے میں (Rugby) رگبی کے کھیل میں گلاسگو کی نمائندگی کی۔ ملایا میں (Maylay) سے لے Seaforth Highlanders اور گورکھا رجمنٹوں میں خدمات انجام دیں۔ کمانڈوز کی تربیتی مشقوں کے دوران زخمی ہوئے تو پیرس یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا اور سیاسیات میں ڈپلوما حاصل کیا۔ فرانس کی نمائندگی میں ایک امریکن یونیورسٹی کی طرف سے وظیفہ حاصل کیا۔ نتیجتاً جرمنی اور آسٹریا میں اپنی تعلیم کو جاری رکھا۔ اس کے بعد برطانیہ کے کئی قومی اخبارات کے نامہ نگار کی حیثیت سے یورپ، شمالی افریقہ، ریاستہائے متحدہ امریکہ اور میکسیکو کے طول و عرض میں دورے کئے۔ آپ ایک سرکاری ادارے صارفین کی کونسل (Consumers Council) کے مشیر اور ٹی وی پر اس کے نمائندے کی حیثیت سے بھی کام کرتے رہے۔

آپ نے معلومات عامہ کی ایک ایجنسی کی بنیاد بھی رکھی اور اسے نہایت کامیابی سے چلایا۔ بعد ازاں آپ ایک پرائیویٹ تعلیمی انسٹی ٹیوٹ کے ڈائریکٹر بنائے گئے۔ آپ ایک مشہور سکاٹش صحافی اور ادیب ہیں۔ آپ والدین کے سب سے چھوٹے صاحبزادے ہیں۔ مذہباً آپ ایک راسخ العقیدہ عیسائی ہیں۔ اور چرچ آف سکاٹ لینڈ کے پروٹسٹنٹ فرقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ آپ کی پیدائش اور شادی اسی مذہبی ماحول میں ہوئی۔ پروٹسٹنٹ اور کیتھولک ہر دو فرقوں کی اقدار عالیہ سے آپ کو ہمیشہ سے گہری دلچسپی رہی ہے۔

مصنف کی دیگر کتب کے متعلق

اخبارات کی رائے

1. THE OLD FOX

سنڈے ٹائمز : "انتہائی دلچسپ اور پڑھنے کے قابل سوانح عمری۔ مسٹر ایڈم سن نے انتہائی دیانتداری سے موضوع کی تصویر کشی کی ہے۔ اور اس کی خوبیوں اور خامیوں کا نقشہ کھینچا ہے"۔

ٹائمز لٹریری سپلیمنٹ : "ایک دلچسپ کتاب - محنت اور عرقریزی کا لذیذ پھل"۔

دی ٹائمز لندن : "ایک لمحے کیلئے بھی دلچسپی کم نہیں ہونے پاتی......."

سکاٹش ڈیلی ریکارڈ : "بہت خوب......."۔

ویسٹرن میل کارڈف : "....... بہت ذمہ دار اور خداداد صلاحیتوں کا مالک مصنف .... عظیم ترین عدالتی شخصیتوں میں سے ایک ایسی شخصیت کی مسحور کن اور بیش قیمت قلمی تصویر جو ہمارے زمانے میں زندگی بھر ایک معمہ بنا رہا......."

دی آئرش ٹائمز : "....... میں نے اس کتاب کو ایک ہی نشست میں ایسے پڑھا جیسے ایک بھوکا کھانے پر بے دریغ ٹوٹ پڑتا ہے .... ایک غیر معمولی شخصیت کا قلمی خاکہ ...."

مانچسٹر ایوننگ نیوز : "اپنے دور کی قد آور عدالتی شخصیتوں میں سے ایک

شخصیت کی دل آویز تصویر"

ایوننگ آرگس (برائٹن) "ایک حیرت انگیز قانونی کارنامہ...... عظیم"

:

ایوننگ ٹائمز (گلاسگو) : میں 'بوڑھے لومڑ' کو انتہائی خوشی سے خوش آمدید کہتا ہوں...... لبریس (Liberace) کیس کے ابواب تو حیرت انگیز ہیں......"

ایوننگ ایڈورٹائزر (سونڈن): Beyfus، بے فس کی زندگی کی داستان ایسی ہے جیسے ایک مشعل بردار جلوس...... ایسے انسان کیلئے مسٹر ایڈم سن جیسا ہی سوانح نگار چاہیے تھا......"

السٹریٹڈ لندن نیوز : "...... قابل تعریف......"

سولسٹرز جرنل : "...... ایک عمدہ سوانح عمری......"

پریس اینڈ جرنل (ایبرڈین) : "...... نئے گوشے اجاگر کرنے والی لیکن انسانی حقائق سے قریب تر......"

آئرش نیوز : "...... بات کھل کر کی گئی ہے۔ اور بلاخوف و خطر...... ایسی سوانح عمری جسے بہت لوگ پسند کریں گے......"

بکس اینڈ بک مین : "اول سے آخر تک دلچسپ......"

ارل سٹینلے گارڈنر : "...... عدالت کی پس پردہ کارروائی کی مسحور کن (پیری میسن کا تخلیق کار) داستان......"

پولیس ریویو : "مسحور کن......"

سڈنی ڈیلی ٹیلیگراف : "ایک عمدہ خاکہ......"

ڈیلی نیوز (جنوبی افریقہ) : "مصنف نے بڑی ہمدردی اور سوجھ بوجھ سے لکھا ہے

"....... قابل قدر......."

پنچ : "....... مؤثر......."

دی کریمی نالو جسٹ : "پڑھنے کو جی چاہتا ہے......."

نیوزی لینڈ براڈ کاسٹنگ : "انسانی علوم میں دلچسپی رکھنے والے ہر قاری کیلئے اس کا مطالعہ لازمی ہے .... بہت قابلیت سے لکھی گئی کتاب .... جس کا وسیع تناظر ہے .... لذت سے بھرپور مطالعہ"

2. A MAN OF QUALITY

دی ٹائمز : "....... ایک ایک لفظ سننے کے قابل......."

لنڈن ایوننگ نیوز : "ہر وہ شخص جسے شاہی دربار میں پہلی بار متعارف کئے جانے والوں کی تقریب کے ڈرامائی لمحات دیکھنے کا شوق ہو- وہ مسٹر ایڈم سن کی تحریر کردہ سوانح عمری کو ضرور پڑھے-

گلاسگو ہیرلڈ : "....... ایسا قلمکار جو ناقابل فراموش اور منہ بولتی تصویر کھینچ سکتا ہے....... ایک دلچسپ انداز میں لکھنے والا"

یارک شائر' پوسٹ : "....... ایک خوبصورت داستان حیات جو جیتے جاگتے اور مشہور و معروف واقعات سے بھری پڑی ہے......."

رائٹ آنریبل لارڈ شاکراس : "....... انتہائی دلچسپ .... اسے اپنی لائبریری میں دیکھ کر جی خوش ہو گیا......."

نار تھمپٹن کرانیکل : "....... ایک انتہائی دلچسپ داستان حیات......."

کرائے ڈن ایڈورٹائزر : "باکمال تحریر...... سنسنی خیز...... مطالعہ کی مستحق"

ڈیلی میل : "...... بہت خوب......"

گارڈین جرنل : "مسحور کن...... انتہائی قابل مطالعہ......"

بی-بی-سی : "...... کامیابی کی ایک کامیاب داستان......"

3. THE FORGOTTEN MEN

سٹریٹس ٹائمز (سنگاپور) : "...... ایک داستان غم - ایک المناک کہانی جس کا انداز بیان چٹخارے دار اور فخریہ"

☆ ☆ ☆

اشاریہ

اسماء

ج ۔ چ ۔ ح

ذ ۔ ڈ ۔ ر

س ۔ ش ۔ ص ۔ ض

ط ۔ ظ

ع ـ غ ـ ف ـ ق ـ ک

ل ـ م ـ ن

مقامات

آ، ا

ب ـ پ ـ ت ـ ٹ

ج ۔ چ ۔ د ۔ ڈ ۔ ر

س ۔ ش

غ ۔ ف ۔ ق ۔ ک ۔ گ

ل ۔ م

ن-و-ہ-ی

پروفیسر محمد علی چوہدری

۱۹۱۷ء میں ضلع فیروز پور (مشرقی) پنجاب میں پیدا ہوئے۔ گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم۔اے کیا۔ نوجوانی میں احمدیت قبول کرنے اور پھر ساری عمر سلسلہ کی خدمات بجالانے کی توفیق پائی۔

۱۹۴۴ء میں جب قادیان میں تعلیم الاسلام کالج کا قیام ہوا تو آپ کو اس موقر تعلیمی ادارے کے بانی اساتذہ میں شامل ہونے کی سعادت ملی اور کالج میں فلسفہ، نفسیات اور انگریزی زبان و ادب کے پروفیسر رہے۔ بعد میں اسی کالج کے پرنسپل ہو کر ریٹائر ہوئے۔

حضرت خلیفۃ المسیح الثالث رحمہ اللہ کے پرائیویٹ سکرٹری رہے ہیں اور حضور کے ساتھ غیر ممالک کے سفروں میں آپ ساتھ رہے ہیں۔

آپ ایک طویل عرصہ تک پنجاب یونیورسٹی کی Senate اکیڈیمک کونسل اور بورڈ آف سٹڈیز (نفسیات) کے ممبر رہے۔ کالج میں ہوسٹل کے علاوہ تیراکی، کشتی رانی، کوہ پیمائی، باسکٹ بال، یو۔ٹی۔سی اور آئی۔اے۔ٹی۔سی کے شعبوں کے انچارج اور پاکستان کی قومی باسکٹ بال کے سینئر وائس پریذیڈنٹ رہے۔

آپ انگریزی اور اردو ادب کا اعلیٰ ذوق رکھتے ہیں اور اردو زبان کے بلند پایہ شاعر ہیں۔ آپ کا کلام جماعت اور ملک کے ادبی حلقوں میں انتہائی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ سلسلہ کی بہت سی کتابوں کا اردو سے انگریزی میں ترجمہ کیا ہے اور انگریزی سے اردو میں ترجمہ کے سلسلہ میں زیر نظر کتاب آپ کی پہلی کوشش ہے۔

آج کل آپ جامعہ احمدیہ ربوہ میں شعبہ انگریزی کے سربراہ ہیں۔ نیز تحریک جدید پاکستان میں وکیل وقف نو کا عہدہ بھی آپ کے پاس ہے۔

EK MARD-I-KHUDA
A MAN OF GOD
(Urdu Translation)

This is the story of an astonishing man. He leads a holy war to unite all the world`s religions under Islam. God speaks to him directly he says and guides all his decisions. When General Zia of Pakistan persecuted his followers he challenged him to a duel by prayer, as Muhammad, the Holy Prophet, had challenged false witnesses. Five days later headlines in newspapers all round the world read 'ZIA BLOWN OUT OF THE SKY'.

He is the Fourth Successor of Ahmad who proclaimed that he was the Messiah promised in all the great religions of the world. Today the followers of Ahmad have become the most dynamic missionary force in Islam. They have Translated the Quran, or selected verses, into 117 languages and established missions, hospitals and schools in 120 countries and directed doctors, teachers and engineers to work alongside their missionaries. Five thousand children are already dedicated to become missionaries to convert Russia, China and South America.

The man who leads this *jehad,* this holy war of words to convert the world to Islam, is Tahir, the Fourth Successor More than 10 million have taken the covenant of allegiance - to him - among them a Nobel prizewinner, a director of the World Bank, a president of the General Assembly of the United Nations and government ministers in many countries.

This is the story of his life.